والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم
بإحسان رضی الله عنهم ورضوا عنه (التوبة: ۱۰۰)

اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں
اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی مایہ ناز تالیف "العقیدۃ الواسطیۃ"
اور اس پر فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر صالح بن فوزان الفوزان حفظہ اللہ کی انتہائی نفیس شرح
بنام "شرح العقیدۃ الواسطیۃ" کا اردو ترجمہ المسمیٰ

عقیدۃ الفرقۃ الناجیۃ

ترجمہ و تقدیم
عبداللہ ناصر الرحمانی

مکتبہ عبداللہ بن سلام لترجمۃ کتب الاسلام

فہرست مضامین

روزِ آخرت سے متعلق امور کا بیان

تقدیر پر ایمان اور تقدیر جن امور کو متضمن ہے کا بیان

مقدمہ از مترجم

ان الحمد لله نحمده ونستعينه ، ونستغفره ، ونعوذ بالله من شرور انفسنا، ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ، ومن يضلل فلاهادی له، وأشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريک له، وأشهد أن محمدا عبده ورسوله .

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴾
(آل عمران:۱۰۲)

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ﴾ (النساء:۱)

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴾

(الاحزاب:۷۰،۷۱)

أما بعد:

فان أصدق الحديث كتاب الله ، وأحسن الهدى هدى محمد ﷺ ، وشر الامور محدثاتها ، وكل محدثة بدعة ، وكل بدعة ضلالة ، وكل ضلالة فی النار .

عقیدہ جیسے اہم موضوع پر مزید ایک کتاب نظرِ قارئین ہے،اس معرکۃ الآراء موضوع پر ہمارے ادارے ''مكتبة عبدالله بن سلام لترجمة كتب الاسلام'' کی یہ مسلسل ساتویں کاوش ہے۔اللہ تعالیٰ اسے روزِ آخرت ہمارے میزانِ حسنات کا ذخیرہ بنا دے۔آمین۔

نویں صدی ہجری کے مجدد، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''العقيدة الواسطية'' کے نام سے ایک مختصر مگر جامع رسالہ تصنیف فرمایا تھا،اس رسالے کا متن لاکھوں کی تعداد میں اور مختلف زبانوں میں تراجم کے ساتھ شائع ہو کر خلقِ کثیر کی ہدایت کا سبب بن چکا ہے۔

رسالۂ نافعہ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ دنیا کی بہت سی جامعات اور مدارس میں باقاعدہ شاملِ نصاب ہے۔بہت سے علماء نے اس کی شرح کا اہتمام بھی فرمایا ہے۔

ہم نے اس رسالہ کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کیلئے فضیلۃ الشیخ الدکتور/صالح بن فوزان بن عبداللہ الفوزان کی شرح کا انتخاب کیا ہے،وجہ انتخاب یہ ہے کہ یہ بہت سے علماءِ کرام مثلاً: الشیخ زید بن عبدالعزیز ابن فیاض،الشیخ عبداللہ بن ناصر الرشید اور الشیخ عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی رحمہم اللہ کی علمی شروح کا ملخص اور مرقع ہے،جابجا شیخ صالح الفوزان کے علمی افادات بھی موجود ومرقوم ہیں۔

کتاب کا بنیادی موضوع اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا قرآن وحدیث کے ادلہ سے اثبات ہے، نیز یہ کہ اسماء وصفات پر منہج سلف صالحین صحابہ وتابعین کے مطابق بلا تکییف، بلا تحریف، بلا تشبیہ اور بلا تأویل ایمان لانا ضروری ہے۔

ایمان باللہ جو ایمان کا رکنِ اول ہے کی اساس توحید ہے اور فہمِ توحید، اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے فہم پر موقوف ہے،لہٰذا اس علم پر بہت توجہ کی ضرورت ہے۔ہم قارئین سے ملتمس ہے کہ اس اہم مقصد کے حصول کیلئے اس رسالہ کا بغور اور بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں اور اگر کہیں کوئی اشکال محسوس ہو تو علماءِ کرام سے رجوع فرمائیں۔

اثباتِ اسماء وصفات کے ساتھ ساتھ عقیدۂ آخرت بھی اس رسالے کا موضوع

ہے، اس کے علاوہ بھی بہت سے اعتقادی امور ومسائل زیرِ بحث آئیں گے۔

اللہ تعالیٰ اس کا نفع عام فرمادے اور رسالے کے مؤلف، شارح، مترجم اور طباعت میں جملہ مساھمین ومعاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

کتاب کے سلسلہ میں ہمارے تلمیذ شیخ محمد داؤد شاکر حفظہ اللہ جنہوں نے بعض مقامات کا ترجمہ کیا اور پروف ریڈنگ کی، کی کوشش انتہائی قابلِ قدر ہے، کمپوزنگ کے سلسلہ میں حافظ زبیر حفظہ اللہ کی محنتِ شاقہ بھی لائقِ تحسین ہے، طباعت کے سلسلہ میں فضیلۃ الشیخ علی بن عبد اللہ النمی حفظہ اللہ کا تعاون ہمارے لئے تقویت اور حوصلہ افزائی کا باعث ہے، فجزاھم اللہ عنا وعن المسلمین خیر الجزاء.

اس رسالہ کی صحت وصواب من جانب اللہ وبتوفیق للہ ہے اور ہر لغزش شیطان کی طرف سے ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ ہمیں ترجمہ کی اخطاء سے آگاہ فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں اصلاح کرلی جائے۔ واللہ تعالیٰ ولی التوفیق.

وصلی اللہ علی نبیہ محمد و علی آلہ وصحبہ وأهل طاعته أجمعين.

وکتب ذلک/عبداللہ ناصر الرحمانی

مدیر: مکتبة عبداللہ بن سلام لترجمة کتب الاسلام

مقدمہ از مؤلف

الحمد للہ رب العالمين والصلاة والسلام على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين. وبعد:

ہمارا یہ رسالہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب ''العقيدة الواسطية'' کی مختصر شرح ہے، ہم نے اس شرح میں مندرجہ ذیل مصادر سے استفادہ کیا ہے:

(۱) الروضة الندية شرح العقيدة الواسطية للشيخ زيد بن عبد العزيز ابن فياض.

(۲) التنبيهات السنية على العقيده الواسطية للشيخ عبد العزيز بن ناصر الرشيد.

(۳) التنبيهات اللطيفة فيما احتوت عليه الواسطية من المباحث المنيفة للشيخ عبد الرحمن بن ناصر السعدى.

(٤) آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں ہم نے فتح القدیر للامام الشوکانی اور تفسیر ابن کثیر سے استفادہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس رسالہ کا نفع عام کردے اور اسے عقیدۂ صحیحہ کی توضیح کا سبب بنادے اور اس رسالہ میں مجھ سے جو خطا ہوئی ہو اسے معاف فرمادے اور جو صواب اور درست ہے اس کا اجر وثواب عطا فرمادے، وہ سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

وصلى الله على نبيه محمد و على آله وصحبه والحمد لله رب العالمين.

المؤلف

(الدكتور/ صالح بن فوزان بن عبداللہ الفوزان حفظه الله)

قال المصنف : بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ کی تشریح

شرح ......

مصنف رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کو بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع فرمایا ہے، اس سے قرآنِ حکیم کی اقتداء مقصود ہے، کیونکہ بسم اللہ الرحمن الرحیم، سورۂ توبہ کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں وارد ہوئی ہے۔ نیز اس سے نبی ﷺ کی اقتداء بھی مقصود ہے، کیونکہ نبی ﷺ اپنے خطوط ومکاتیب کی ابتداء بسم اللہ الرحمن الرحیم سے فرمایا کرتے تھے۔

"بسم اللہ" کی باء استعانت کیلئے ہے، جس کا معنی ہوگا: اللہ تعالیٰ کے نام کی مدد کے ساتھ آغاز کرتا ہو۔

"الاسم" کا لغوی معنی ایک ایسا لفظ جو کسی مسمّیٰ پر دلالت کرے، اصطلاحی معنی یہ ہے کہ ایک ایسا لفظ جو خود اپنا معنی دے اور وہ کسی زمانے کے ساتھ ملا ہوا نہ ہو۔

"بسم اللہ" میں جار مجرور، فعلِ محذوف کے متعلق ہیں، بہتر ہے کہ وہ فعلِ محذوف اس کے بعد مقدر مانا جائے تاکہ حصر کا فائدہ دے۔

"اللہ" اس ذاتِ مقدسہ کا علم ہے جس کا معنی ہے: اپنی تمام مخلوق پر الوہیت وعبودیت والا

"اللہ" أله يأله ألوهة سے مشتق ہے، جو عبد یعبد عبادة کے معنی میں ہے.....تو اللہ تعالیٰ الہ ہے جو مألوہ یعنی معبود ہے۔

"الرحمن الرحیم" اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے دو انتہائی مبارک ومعزز نام ہیں، جن کی دلالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صفتِ رحمت کیساتھ متصف ہے، بالکل ویسے جیسے اس کی ذات اور جلال کے لائق ہے۔

"الرحمٰن" سے مراد ایسی رحمت والا جو تمام مخلوقات کیلئے عام ہے۔ اور "الرحیم" سے مراد ایسی رحمت والا جو مؤمنین کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ﴾ ترجمہ: "اور وہ مؤمنین پر رحم فرمانے والا ہے"

الحمد لله الذى ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله وكفى بالله شهيدا. وأشهد أن لااله الا الله وحده لاشريك له اقرارا به وتوحيدا. وأشهد أن محمدا عبده ورسوله صلى الله عليه وعلىٰ آله وسلم تسليما مزيدا.

عبارت کی تشریح

شرح ......

مؤلف رحمہ اللہ نے اپنے اس عظیم الشان رسالہ کا آغاز اس خطبہ سے فرمایا ہے، جو کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء، شہادتین (یعنی توحید ورسالت کی گواہی) اور رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر درود وسلام پر مشتمل ہے۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کی اقتداء مقصود ہے، چنانچہ آپ ﷺ کی اہم گفتگو اور خطبے حمد وثناء، درود وسلام اور شہادتین سے شروع ہوتے تھے۔ نیز اس سے نبی ﷺ کے اس فرمان پر بھی عمل مقصود ہے:

[كل أمر ذي بال لايبدأ فيه بحمد الله فهو اقطع] (ابوداود)

ترجمہ: [اہمیت والا کوئی بھی کام اگر الحمد للہ سے شروع نہ کیا جائے تو وہ برکت سے خالی ہوگا]

ایک روایت میں "الحمد للہ" کی جگہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ ان دونوں روایتوں میں جمع کی صورت یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع کرنا ابتداءِ حقیقی ہے، جبکہ الحمد للہ سے آغاز ابتداءِ نسبی اور اضافی ہے۔

"الحمد للہ" میں الف لام استغراقی ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ تمام تعریفوں کا صرف اللہ تعالیٰ ہی مالک اور مستحق ہے۔

"حمد" کا لغوی معنی ایسی ثناء جو صفاتِ جمیلہ اور افعالِ حسنہ کیساتھ کی جائے۔ عرف

شریعت میں ''حـــمـــد'' ایک ایسا فعل ہے جو منعم کی تعظیم کا مظہر ہے، اس لیئے کہ وہ حقیقتاً انعام واحسان کرنے والا ہے، ''حمد'' **الذم** (مذمت) کی ضد ہے۔

'' الـــذی أرســـل رســولـــه '' یعنی تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلیئے ہیں جس نے اپنا رسول مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ہرقسم کی حمد وثناء کا مستحق ہے کہ اس نے اتنی نعمتیں عطا فرمائیں جنہیں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ان نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے اپنے رسول محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔

''رسول'' کا لغوی معنی وہ شخص ہے جسے کوئی پیغام دیکر بھیجا جائے۔ شریعت کی اصطلاح میں رسول ایک ایسا انسان، مردِ کامل، جسکی طرف شریعت کی وحی بھیجی جائے، اور اس وحی کی تبلیغ پر اسے مأمور کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو ہدایت کے ساتھ مبعوث فرمایا۔

ہدایت: علم نافع کا نام ہے اور اس سے مراد ہر وہ چیز جو نبی ﷺ پروردگار کی طرف سے لیکر آئے...... وہ سچی خبریں، اوامر، نواہی اور تمام نفع بخش امور ہیں۔

ہدایت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) راہ نمائی کرنا، بڑی وضاحت سے راستہ بتا دینا۔

یہ قسم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى ﴾ (فصلت:۱۷)

ترجمہ: ''رہے ثمود، سو ہم نے ان کی بھی راہنمائی کی پھر بھی انہوں نے ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دی''

اس معنی میں ہدایت کرنا وظیفۂ رسول ﷺ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

ترجمہ: ''اور بلا شبہ آپ سیدھے راستے کیطرف ہدایت دیدتے ہیں۔''

یعنی رہنمائی کرتے ہیں۔

(۲) ہدایت کا دوسرا معنی: بات کو دل میں اتارنا، اور مخاطب کو قبول کی توفیق دینا۔

اس معنی کی رسول اللہ ﷺ سے نفی کی گئی ہے، اور یہ ہدایت کی وہ قسم ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قادر نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ﴾ (القصص:۵۶)

ترجمہ: ''آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہے ہدایت کرتا ہے''

''دیـــن حـــق'' سے مراد عملِ صالح ہے۔ دین کی حق کی طرف اضافت، موصوف کی اپنی صفت کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے۔ تقدیر جملہ یوں ہے: ''الدین الحق''

ویسے لفظِ دین جزاء اور سزا کے معنی میں بھی مستعمل ہے، کمافی قولہ تعالیٰ: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ ترجمہ: ''وہ جزاء اور سزا کے دن کا مالک ہے''

اور لفظِ دین جھکنے اور اطاعت کرنے کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

لفظ (الحق) حَقَّ يَحِقُّ سے مصدر ہے، اس میں ثابت اور واجب ہونے کا معنی پایا جاتا ہے، یہ ''باطل'' کی ضد ہے۔

'' لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ '' یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو دینِ حق دیکر بھیجا، تاکہ اسے دنیا کے تمام ادیان پر غالب کردے۔ یہ غلبہ، حجت وبیان اور جہاد کے ساتھ ہے۔ یہاں تک تمام اہلِ ارض اور تمام عرب وعجم اور تمام کفار ومشرکین پر اس دین کا غلبہ ایک یقینی امر اور ظاہر ہے...... اور عملاً یہ ہو چکا ہے، چنانچہ مسلمانوں نے اللہ کی راہ میں صحیح معنی میں جہاد کیا، جس کے نتیجہ میں سلطنتِ اسلامیہ کا دائرۂ کار خوب وسیع ہوا، اور دینِ حق مشارق ومغارب میں پھیل گیا۔

'' وكفى بالله شهيدا '' شہید بمعنی شاہد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اس بات پر شاہد ہے اور اسکی

شہادت کافی ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں......اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے تمام افعال سے باخبر ہے، اور آپ ﷺ کی ان کے دشمنوں کے خلاف بھرپور مدد کرنے والا ہے......اور یہ بات رسول اللہ ﷺ کے سچا رسول ہونے کی قطعی دلیل ہے، کیونکہ اگر آپ (نعوذ باللہ) مفتری ہوتے تو اللہ تعالیٰ آپ کو بہت جلد سزا دے چکا ہوتا، کیونکہ اس کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ. لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ. ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴾ (الحاقۃ: ۴۴، ۴۵)

ترجمہ: "اور اگر یہ ہم پر کوئی بھی بات بنا لیتا تو البتہ ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے، پھر اس کی شہ رگ کو کاٹ دیتے"

"وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له اقرارا به وتوحيدا."

یعنی میں اقرار و اعتراف کرتا ہوں کہ معبودِ حق صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کوئی معبودِ حق نہیں ہے...... "وحده لا شريك له" یہ کلمے سابقہ جملے "أشهد أن لا إله إلا الله" میں جو نفی و اثبات کا معنی پایا جاتا ہے کی تاکید ہیں، چنانچہ "وحده" اثبات یعنی "إلا الله" کی تاکید اور "لا شريك له" نفی یعنی "لا إله" کی تاکید ہے۔

"اقرارا به وتوحيدا" اقرار و توحید دونوں مصدر ہیں اور سابقہ جملہ کے معنی کو مزید مؤکد کر رہے ہیں۔ "اقرار" سے مراد زبان سے اقرار کرنا، اور "توحید" سے مراد ہر عبادت میں خواہ وہ قولی ہو یا فعلی یا اعتقادی، میں مکمل اخلاص ثابت و قائم رکھنا۔

"وأشهد أن محمدا عبده ورسوله" یعنی میں زبان سے اقرار، اور دل سے یہ اعتقاد رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے محمد ﷺ کو تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے، رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی دینا، اللہ تعالیٰ کی توحید کی گواہی کے ساتھ مقرون اور لازم و ملزوم ہے......یعنی دونوں گواہیاں ضروری ہیں کسی ایک پر اکتفاء کر لینا ہرگز کافی نہیں ہوگا۔

مؤلف کے قول "عبده ورسوله" یعنی آپ ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، میں رسول اللہ ﷺ کے بارہ میں افراط و تفریط کے مرض میں مبتلا گمراہ فرقوں کا رد ہے۔ چنانچہ اہلِ افراط نے آپ ﷺ کے بارہ میں یہ غلو اختیار کیا کہ آپ کو آپ کے مقامِ عبدیت سے بڑھا دیا جبکہ اہل تفریط نے آپ ﷺ کی اس قدر تنقیصِ شان کی کہ آپ ﷺ قرآن و حدیث کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا جو پیغام لائے اسے پسِ پشت ڈال دیا، گویا آپ ﷺ کا رسول ہونا ہی نہیں مانتے لہٰذا "عبده ورسوله" میں آپ ﷺ کی عبدیت، یعنی اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کی شہادت، آپ کے بارہ میں ہر قسم کے غلو کی اور آپ کو اپنے منزلت و مرتبت سے بڑھانے کی نفی کرتی ہے۔

جبکہ آپ ﷺ کے رسول اللہ ہونے کی گواہی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کے رسول اللہ ہونے پر ایمان لایا جائے، پھر آپ ﷺ کے حکم کی اطاعت کیجائے، آپ ﷺ کی ہر خبر کی تصدیق کی جائے، اور آپ ﷺ کی نہی سے اجتناب کیا جائے، الغرض آپ ﷺ نے جو کچھ مشروع قرار دیا ہے اس میں آپ ﷺ کی پوری اتباع کی جائے۔

"وصلى الله عليه وسلم تسليما مزيدا" الصلاۃ کا لغوی معنی دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی پر صلاۃ بھیجنے کے علماء سے مختلف معنیٰ منقول ہیں، سب سے صحیح معنی محدث ابو العالیۃ سے منقول ہے، جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں نقل فرمایا ہے: "صلوۃ علی رسوله ثناءه عليه في الملأ الاعلیٰ" یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے رسول ﷺ پر صلوۃ بھیجنے سے مراد فرشتوں کی سب سے اونچی اور مقرب جماعت کے سامنے نبی ﷺ کی ثناء کرنا ہے۔

"آل" سے مراد کسی بھی شخص کے وہ افراد جو کسی بھی تعلق کی بناء پر اس کی طرف منسوب ہیں، جیسے تعلقِ قرابت وغیرہ۔

"آل رسول" کی اگرچہ بہت سی تفسیریں منقول ہیں، لیکن سب سے بہتر تفسیر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے آل وہ لوگ ہیں جو اس دنیا میں رسول اللہ ﷺ کی تابعداری کرتے ہیں۔

"اصحاب" صاحب کی جمع ہے، آل کے بعد اصحاب کا ذکر عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے، (یعنی عام کے ذکر کے بعد خاص الخاص لوگوں کا ان کی اہمیت کی بنیاد پر ذکر کیا)

صحابی سے مراد ہر وہ شخص جس کی نبی ﷺ سے بحالتِ ایمان ملاقات ثابت ہو، پھر اسی ایمان پر اس کی موت آئی ہو۔

"السلام" التحیۃ یعنی تحفہ کے معنی میں ہے، یا سلام کا معنی تمام نقائص وعیوب سے سلامتی میں آجانا۔

"تسلیما مزیدا" سے مراد زیادہ سلامتی، جو مسلسل بڑھتی رہے۔ "مزید" زیادۃ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔

صلاۃ وسلام دونوں کو اس لیئے جمع فرمایا تا کہ اللہ تعالیٰ کے اس امر پر عمل ہو جائے:

﴿ یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیمًا ﴾ (الاحزاب:۵۶)

ترجمہ: "اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود بھیجو اور خوب سلام (بھی) بھیجتے رہا کرو"

اہل السنۃ کون ہیں؟

اما بعد: فهذا اعتقاد الفرقة الناجية المنصورة الى قيام الساعة. أهل السنة والجماعة

ترجمہ: یہ اس گروہ کے عقائد ہیں جو نجات پانے والا ہے جسے قیامت قائم ہونے تک اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید حاصل ہے، یہ اہل السنۃ والجماعۃ ہیں۔

عبارت کی تشریح

...... **شرح** ......

"اما بعد" یہ ایک کلمہ ہے جسے سیاقِ کلام میں ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف منتقل ہوتے ہوئے استعمال کیا جاتا ہے جس کا معنی ہے: "مهما یکن من شیء"، خطبوں اور خطوط میں اما بعد کا استعمال مستحب ہے؛ کیونکہ نبی ﷺ ایسا کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ کی اتباع باعثِ برکت وموجبِ رحمت ہے۔

"ھذا" اسم اشارہ ہے، مشار الیہ اس رسالہ کے تمام محتویات ومضامین ہیں جن کا عقائدِ ایمانیہ سے تعلق ہے اور وہ مؤلف کے قول "وهو الايمان بالله......" سے شروع ہو رہے ہیں۔

"الاعتقاد" باب اعتقد، یعتقد سے مصدر ہے، اعتقاد کا معنی: کسی چیز کو عقیدہ بنانا...... اور عقیدہ ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس پر بندہ اپنے دل کو گرہ لگا دے...... "اعتقدت کذا" کا جملہ بولا جاتا ہے جس کا مطلب ہے میں نے فلاں چیز کو اپنا عقیدہ بنا لیا، یعنی اپنے دل وضمیر کو اس پر گرہ لگا کر مضبوطی سے باندھ لیا۔

عقیدہ کا اصل "عقد الحبل" سے ماخوذ ہے جس کا معنی رسی کو باندھنا ہے، پھر اس کا
[illegible] کے عقیدے اور جزم صمیم پر ہونے لگا

"الفرقة" سے طائفہ اور جماعت مراد ہے۔

"الناجية" یعنی نجات پانے والا گروہ یا جماعت، یعنی ایسا گروہ جو دنیا اور آخرت کی ہر قسم کی ہلاکت اور شر سے سلامتی اور عافیت میں رہے گا اور ہر طرح کی سعادت سے ہمکنار ہوگا...... جماعتِ حقہ کو "ناجیہ" کا جو وصف دیا گیا ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے ماخوذ ہے: [لاتزال طائفة من أمتي على الحق منصورة لايضرهم من خذلهم حتى يأتي أمر الله]

ترجمہ: [میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اور تائید کیا ہوا، ان کی تذلیل وتوہین کرنے والا انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا، حتی کہ اللہ کا امر یعنی قیامت آجائے......] (متفق علیہ)

"المنصورة الى قيام الساعة" یعنی ایک ایسی جماعت جن کی اللہ تعالیٰ ان کے مخالفین کے خلاف قیامت تک مدد کرتا رہے گا۔ قیامت قائم ہونے سے مراد قیامت سے قبل ان کی موت ہے، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت سے قبل ایک ہوا چلے گی جو ہر مومن کی روح قبض کرلے گی، اس طرح مؤمنوں کی قیامت قائم ہوجائے گی؛ کیونکہ وہ قیامت جس سے یہ دنیا ختم ہوجائے گی وہ بدترین قسم کے لوگوں پر قائم ہوگی، چنانچہ صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: [لاتقوم الساعة حتى لايقال في الارض الله الله]

ترجمہ: [اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک زمین پر اللہ اللہ کہنا ختم نہ ہوجائے]

مستدرک حاکم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، جس میں اللہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے:

[ويبعث الله ريحا ريحها ريح المسك ومسها مس الحرير فلا تترك أحدا في قلبه مثقال ذرة من ايمان الا قبضته ثم يبقى شرار الناس فعليهم تقوم الساعة]

ترجمہ: [اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا جس کی ہوا مشک سے معطر ہوئی اور جس کا لمس ریشم کا سا ہوگا، وہ ایسے کسی شخص کو نہیں چھوڑے گی جس کے دل میں ایک ذرہ برابر ایمان ہو۔ اس کی روح قبض کرلے گی...... پھر بدبخت قسم کے لوگ رہ جائیں گے، ان پر قیامت قائم ہوگی۔]

"اهل السنة والجماعة" اھل کی لام مکسور ہے، الفرقۃ سے بدل واقع ہو رہا ہے، رفع پڑھنا بھی جائز ہے، اس صورت میں مبتدأ محذوف "هم" کی خبر ہوگا۔

"السنة" سے مراد وہ طریقہ جس پر محمد رسول اللہ قائم رہے، جو آپ ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریریات پر مشتمل ہے...... جماعتِ حقہ اور فرقۂ ناجیہ کو اھل السنۃ کا لقب اس لیئے دیا گیا کہ یہی لوگ درحقیقت سنتِ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہیں، ان کے علاوہ کوئی نہیں، نہ کوئی مقالہ اور نہ کوئی مذہب۔

اہلِ بدعت سنتِ رسول ﷺ کے ساتھ تعلق ونسبت سے محروم ہیں، وہ کبھی تو اپنی بدعت وضلالت کی نسبت سے موسوم ہوتے ہیں: جیسے القدریہ اور المرجئة ...... کبھی اپنے امام کی طرف منسوب ہوتے ہیں، جیسے جہمیہ (جہم بن صفوان کے مقلد) اور کبھی اپنے قبیح افعال پر اپنے فرقہ کا نام رکھ لیتے ہیں جیسے روافض اور خوارج۔

"الجماعة" لغت میں لوگوں کے گروہ یا جتھے کو بولتے ہیں۔

اھل السنۃ والجماعۃ کے مبارک نام میں الجماعۃ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق پر مجتمع ہوگئے، وہ جو کتاب وسنت سے ثابت ہے...... اس سے مراد صحابۂ کرام اور ان کے منہج کے پیروکاروں کی جماعت ہے، خواہ وہ کم ہی کیوں نہ ہوں، جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے

"الجماعۃ وہ ہے جو حق پر ہو، خواہ تم اکیلے ہی کیوں نہ ہو اس وقت (اگر حق تمہارے پاس ہے تو) تم اکیلے ہی جماعت ہو"

ارکانِ ایمان

وھو الایمان باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والبعث بعد الموت والایمان بالقدر خیرہ وشرہ .

ترجمہ: وہ عقیدہ یہ ہے: اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے پر، اور تقدیر پر ایمان لانا خواہ وہ اچھی ہو یا بری۔

۞ ۞ ۞

عبارت کی تشریح

...... **شرح** ......

یہاں سے مؤلف رحمہ اللہ فرقہ ناجیہ کے عقیدہ کا بیان فرما رہے ہیں:

ایمان کا لغوی معنی تصدیق ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَاأَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا ﴾ (یوسف:١٧)

ترجمہ: "آپ تو ہماری بات نہیں مانیں گے" میں مومن بمعنی مصدق ہے، جبکہ شرعی اصطلاح میں ایمان کی تعریف یوں ہے:

"قول باللسان واعتقاد بالقلب وعمل بالجوارح" یعنی ایمان زبان کے اقرار، دل کی تصدیق واعتقاد اور اعضاء سے عمل کرنے کا نام ہے۔

ایمان کے چھ ارکان ہیں۔ کسی بندے کا ایمان اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک وہ ان تمام ارکان پر ایمان نہ لے آئے اور ایمان بھی صحیح طریقے سے ہو، صحیح طریقہ سے مراد یہ کہ قرآن وحدیث کے مطابق ہو۔

یہ چھ ارکان مندرجہ ذیل ہیں:

(١) الایمان باللہ ...... اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا معنی یہ پختہ عقیدہ رکھنا کہ وہ ہر

ں کا رب اور مالک ہے، تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے، اور ہر عیب اور نقص سے منزہ اور پاک ہے، وہ اکیلا عبادت کا مستحق ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس پورے عقیدے کا علم بھی ہو اور اس کے مقتضیٰ پر عمل بھی ہو۔

(٢) ایمان بالملائکہ سے مراد یہ ہے کہ فرشتوں کے موجود ہونے کی تصدیق ہو اور یہ تصدیق کہ وہ ان تمام صفات سے متصف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدس میں بیان فرمادیں، جیسا کہ سورۃ الانبیاء کی آیت نمبر (٢٧) میں ہے:

﴿ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَايَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴾

ترجمہ: "کسی بات میں اللہ تعالیٰ پر پیش دستی نہیں کرتے بلکہ اس کے فرمان پر کاربند ہیں"

قرآن وحدیث میں ملائکہ کی مختلف اصناف اور اوصاف کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں مختلف ڈیوٹیاں تفویض کی گئی ہیں...... ان تمام باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔

(٣) ایمان بالکتب سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر جو کتابیں اتاری ہیں ان کی تصدیق کرنا...... اور یہ تصدیق کرنا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور حق، نور اور ہدایت ہے...... ان کتابوں میں سے کچھ کے نام اللہ تعالیٰ نے بتادیئے ہیں مثلاً: توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن، ان پر ان کے ناموں کے ساتھ ایمان لانا واجب ہے، اور جن کتابوں کے نام اللہ تعالیٰ نے نہیں بتائے ان پر بھی ایمان لانا واجب ہے۔

(٤) ایمان بالرسل سے مراد ان تمام رسولوں کی تصدیق کرنا جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی خلق کی طرف مبعوث فرمایا، نیز یہ تصدیق بھی کی جائے کہ انہوں نے پوری امانت کے ساتھ اپنے رب کا پیغام پہنچادیا، اور انہوں نے جو کچھ فرمایا اس میں وہ بالکل سچے ہیں۔

ہم کسی رسول میں فرق نہیں کرتے، بلکہ تمام رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں، جن رسولوں کے نام اللہ نے بیان فرمادیئے ان پر ان ناموں کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں، اور جن رسولوں کے نام نہیں اللہ ان پر بھی ایمان رکھتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَا هُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ﴾

ترجمہ: ''اور آپ سے پہلے کے بہت سے رسولوں کے واقعات ہم نے آپ سے بیان کئے ہیں اور بہت سے رسولوں کے نہیں بھی کیئے'' (النساء:۱۶۴)

تمام رسولوں میں سب سے افضل اولوالعزم رسول ہیں، اور وہ پانچ ہیں، نوح علیہ السلام، ابراھیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ، پھر بقیہ رسول سب سے افضل ہیں، اس کے بعد تمام انبیاء، جبکہ تمام انبیاء ومرسلین میں سب سے افضل ہمارے نبی خاتم النبیین محمد ﷺ ہیں۔

نبی اور رسول کے درمیان فرق کے حوالے سے علماء سے مختلف اقوال ہیں، صحیح ترین قول یہ ہے کہ نبی وہ ہے جس کی طرف شریعت بھیجی جائے لیکن وہ اس کی تبلیغ پر مامور نہ ہو، اور رسول وہ ہے جس کی طرف شریعت اتاری جائے اور وہ اس کی تبلیغ پر مامور ہو۔

(۵) **ایمان بالبعث** سے مراد اس بات کی تصدیق کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مُردوں کو ان کی قبروں سے زندہ کرکے اٹھائے گا، تاکہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے، اور انہیں ان کے اعمال کے مطابق جزاء یا سزا دے، اور یہ سب کچھ بالکل ویسے ہی ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت میں بیان فرمادیا۔

(۶) **ایمان بالقدر** یعنی تقدیر خواہ وہ اچھی ہو یا بری پر ایمان لانا، جس کا معنی یہ ہے کہ بندہ یہ تصدیق کرے کہ تمام اشیاء کی تقدیریں اور زمانے، ان کے وقوع سے قبل ہی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں...... پھر اس بات کی تصدیق کرے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام مقادیر لوحِ محفوظ میں لکھ رکھی ہیں، پھر اس بات کی بھی تصدیق کرے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام مقادیر کو اپنی قدرت اور مشیت سے ان کے مقررہ اوقات میں ایجاد فرماتا ہے۔ اب جو بھی نئے حوادث و امور رونما ہو رہے ہیں خواہ وہ خیر ہوں یا شر سب اللہ تعالیٰ کے علم، تقدیر، مشیت اور ارادے سے صادر ہو رہے ہیں، جس چیز کا ہونا وہ چاہتا ہے وہ ہو جاتی ہے، اور جس چیز کا نہ ہونا وہ چاہتا ہے وہ بالکل نہیں ہو پاتی۔

واضح ہو کہ یہ امور ایمان کی مجمل سی شرح تھی، آگے ان کی مفصل شرح آ رہی ہے ان شاء اللہ

اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان

ومن الایمان باللہ الایمان بما وصف به نفسه في كتابه و وصفه به رسوله محمد ﷺ من غير تحريف ولا تعطيل ومن غير تكييف ولا تمثيل .

ایمان باللہ میں انتہائی ضروری یہ بات داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی ذات کی جو صفات بیان کی ہیں، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان فرمائی ہیں ان پر اس طرح ایمان لانا کہ اس میں کوئی تحریف نہ ہو...... کوئی تعطیل کوئی تکلیف نہ ہو اور کوئی تمثیل نہ ہو۔

عبارت کی تشریح

......**شرح**......

مصنف رحمہ اللہ نے اصولِ ایمان کے اجمالی تذکرہ کے بعد اب ان کا تفصیلی بیان شروع کیا ہے...... چنانچہ اصلِ اول ایمان باللہ ہے، جس کیلئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان لایا جائے اللہ تعالیٰ کی صفات کتاب وسنت میں موجود اور ثابت ہیں، ایمان لانے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ صفات جن الفاظ کے ساتھ قرآن وحدیث میں ثابت ہیں انہی الفاظ کے ساتھ مان لیں، اور ان صفات کا جو ظاہری معنی ہے اس معنی کے ساتھ ایمان لے آئیں۔ نہ تو ان الفاظ میں تحریف کا ارتکاب کریں، نہ ان کی تعطیل کے مرتکب ہوں اور نہ ہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کے مخلوق کی صفات کے ساتھ تشبیہ کا عقیدہ رکھیں

اور ایک ضروری امر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے اثبات کے سلسلہ میں صرف کتاب وسنت پر اعتماد کریں، قرآن وحدیث سے ہرگز تجاوز نہ کریں؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات توقیفی

اللہ تعالیٰ کی صفات پر بلاتحریف، بلاتعطیل، بلاتکییف اور بلاتمثیل ایمان لانا فرض ہے۔

تحریف: کا معنی تبدیل کرنا، اور کسی شی کو اس کی اصل صورت سے پھیر دینا......اس کی دوقسمیں ہیں (۱) تحریفِ لفظی (۲) تحریف معنوی

تحریف لفظی یہ ہے کہ کلام کے اصل معنی مراد کو پھیرنے کی خاطر اس کے الفاظ میں ردوبدل کردیا جائے ......چنانچہ کوئی لفظ یا حرف بڑھا دیا جائے یا کم کردیا جائے، یا پھر حرکتِ اعرابی (زبر، زیر، پیش) کی تبدیلی کردی جائے۔

اضافۂ حرف کی مثال: بعض اہل ضلال نے قولہ تعالیٰ ''الرحمن علی العرش استوی'' کے بارہ میں أی: استولی کہا ہے، اس طرح آیت میں انہوں نے ایک حرف یعنی لام کا اضافہ کردیا۔

لفظ کے اضافے کی مثال: بعض اہل ضلال نے قولہ تعالیٰ ''وجاء ربک'' میں کہا ہے: أی جاء أمر ربک'' گویا انہوں نے لفظ ''أمر'' کا اضافہ کردیا۔

تبدیلی اعراب کی مثال: قولہ تعالیٰ: ''کَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا'' چنانچہ آیتِ کریمہ میں لفظ جلالہ ''اللہ'' پیش کے ساتھ ہے، لیکن اہل ضلال نے پیش کو نصب سے تبدیل کردیا تاکہ اپنے الحاد کو اس حرکتِ اعرابی کی تحریف کے ذریعہ ثابت کرسکیں۔

تحریفِ معنوی یہ ہے کہ کسی بھی کلام کو اس کی حقیقت سے اسطرح پھیرنا کہ اس لفظ کو اصل معنی کی بجائے دوسرا معنی دے دیا جائے جیسا کہ مبتدعہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا معنی ارادۂ انعام کرتے ہیں (جو باطل ہے)

تعطیل کا لغوی معنی کسی چیز کو خالی کرنا، یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اسکی صفات کی نفی کرنا۔

تحریف اور تعطیل میں فرق یہ ہے کہ تحریف سے مراد یہ ہے کہ معنیٔ صحیح کہ جس پر نصوص دلالت کررہے ہیں کی نفی کرکے اسے معنیٔ غیر صحیح سے بدل ڈالنا۔ جبکہ تعطیل سے مراد معنیٔ صحیحہ کی نفی کرنا ہے (معنیٔ غیر صحیح سے بدلنا نہیں) جیسا کہ فرقۂ مفوضہ کا عمل ہے

اس سے ثابت ہوا کہ تعطیل کا عمل عام ہے اور تحریف کا عمل خاص ہے چنانچہ ہر محرف معطلہ میں سے ہے لیکن ہر معطل محرف نہیں ہوسکتا۔

تکییف سے مراد صفت کی کیفیت کو معین کرنا، اس کا فعل ''کَیَّفَ'' ہے جس کا معنی ہے کہ کسی شی کی کیفیت معلومہ مقرر کرنا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کی تکییف کا معنی ہوگا ان کی کیفیت وھیئت کا تعین......یہ کام بشر کی طاقت سے ماوراء ہے؛ کیونکہ کیفیت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور ایک انسان کی اس تک کوئی رسائی نہیں، کیونکہ صفت، ذات کے تابع ہے تو جس طرح ایک انسان کیلئے اللہ تعالیٰ کی ذات کی کیفیت کی معرفت ممکن نہیں ہے، اسی طرح اس کی صفات کی کیفیت کی معرفت بھی ممکن نہیں ہے، اسی لیئے جب امام مالک سے پوچھا گیا: کہ ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ اللہ تعالیٰ عرش پر کس طرح مستوی ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ کا استواء علی العرش معلوم ہے، لیکن کیفیت مجہول ہے، استواء پر ایمان واجب ہے اور استواء کی کیفیت کا سوال بدعت ہے۔

تمام صفاتِ باری تعالیٰ کے بارہ میں اسی طرح کہنا چاہیئے۔

تمثیل کا معنی تشبیہ ہے۔ یعنی یوں کہنا: اللہ تعالیٰ کی صفات مخلوق کی صفات کے مثل ہیں...... جیسے کوئی شخص کہے: اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہمارے ہاتھ کی طرح ہے اور اللہ کا سمع ہمارے سمع کے مثل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے عقیدے سے بلند وبالا اور پاک ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الشوریٰ آیت (۱۱) میں فرمایا ہے: ﴿لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

ترجمہ: ''اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے''

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارہ میں یہ عقیدہ نہ رکھا جائے کہ وہ ہماری صفات کی مثل یا مشابہ ہیں جیسا کہ یہ عقیدہ باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہماری ذات کے مثل یا مشابہ ہے۔

ایک حقیقی اور سچا مؤمن اور موحد اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کو اللہ تعالیٰ کیلئے اس طرح ثابت کرتا ہے جیسا اس کی عظمت وکبریائی کے لائق ہے۔ چنانچہ اہلِ تعطیل اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کی نفی کرتے ہیں (بعض معطلہ تمام صفات کی تو نہیں البتہ بعض صفات کی نفی کرتے ہیں) اور مشبھہ اللہ تعالیٰ کی صفات تو ثابت کرتے ہیں لیکن اس صورت نہیں جو اللہ تعالیٰ کے لائق ہے بلکہ اس صورت جو مخلوق کے لائق ہے (کیونکہ وہ خالق کی صفات کو مخلوق کے مشابہ قرار دیتے ہیں)

اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق اہل السنۃ کا موقف

بل يؤمنون بأن الله سبحانه ليس كمثله شئ وهو السميع البصير فلا ينفون عنه ماوصف به نفسه. ولا يحرفون الكلم عن مواضعه .

ترجمہ: بلکہ وہ (اھل السنۃ والجماعۃ) ایمان لاتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ خوب سننے والا دیکھنے والا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کیلئے جو صفات بیان فرمادیں ان میں سے کسی صفت کی نفی نہیں کرتے اور نہ ہی وہ اس کے کلام میں تحریف کا ارتکاب کرتے ہیں۔

عبارت کی تشریح

شرح

جب مصنف رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کی صفات جو کہ کتاب وسنت سے ثابت ہیں کے تعلق سے بتلادیا کہ ان پر بلاتحریف، بلاتعطیل، بلاتکییف اور بلاتمثیل ایمان لانا واجب ہے تو اب یہ وضاحت بھی فرمادی کہ أھل السنۃ والجماعۃ کا موقف بھی یہی ہے کہ وہ اس منہجِ مستقیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفات کو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ وہ صفات باری تعالیٰ کو ان کی اصل حقیقت کے مطابق ثابت کرتے ہیں، اور ان سے تمثیل وتشبیہ کی نفی کرتے ہیں، نہ تو کسی صفت کی تعطیل کے قائل ہیں اور نہ کسی صفت کے بارہ میں مخلوق سے تشبیہ کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

ان کا یہ عقیدہ سورۃ الشوریٰ کی آیت (۱۱) کے عین مطابق ہے۔

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

ترجمہ: ''اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے''

چنانچہ ''لَيْسَ كَمِثْلِهٖ'' میں قائلینِ تشبیہ کا رد ہے اور'' وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ'' میں اھلِ

تعطیل کا رد ہے؛ کیونکہ یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کی دو صفات سمع اور بصر کو ثابت کر رہی ہے۔ اسماء وصفات کے باب میں یہ آیتِ کریمہ ایک واضح دستور کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ اس میں اثباتِ صفات اور نفی تشبیہ دونوں عقیدے جمع ہیں اس کی مکمل تفسیر آگے آئے گی۔ (ان شاء اللہ)

مصنف رحمہ اللہ کے قول ''فلا ینفون عنه ما وصف به نفسه'' کا مطلب یہ ہے کہ جب أہل السنۃ والجماعۃ کا اللہ تعالیٰ کے فرمانِ مذکور ''لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ......'' پر ایمان ہے تو وہ ایسی جرأت کبھی نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صفات اپنی ذات کیلئے ثابت فرمائی ہیں ان کی نفی کر دیں...... اس الحاد کا تو ان لوگوں نے ارتکاب کیا جنہوں نے تنزیہ میں اتنا غلو اختیار کر لیا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے مخلوق کی صفات سے تشبیہ سے بزعمِ خویش بچنے کیلئے اللہ تعالیٰ کی ذات کو اس کی بیان کردہ صفات سے معطل کر دیا۔

أہل السنۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کچھ صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں اور بالکل ویسی ہیں جیسی اللہ تعالیٰ کے لائق ہیں...... مخلوق کی بھی کچھ صفات ہیں جو ان کے ساتھ مخصوص ہیں، اور ویسے ہی جیسی مخلوق کے لائق ہیں، چنانچہ خالق اور مخلوق کی صفات میں کوئی مشابہت نہیں ہے، لہذا جس مشابہت کے ڈر سے تم اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کر رہے ہو اس کا تو سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ مصنف کے قول ''ولا يحرفون الكلم عن مواضعه'' کا مطلب یہ ہے کہ أہل السنۃ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کسی تحریف یا تغییر کا ارتکاب نہیں کرتے، نہ تو وہ کلام الٰہی کے الفاظ کو بدلتے ہیں نہ ان الفاظ کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو شریعتِ مطہرہ کے مراد کے خلاف ہو، الغرض اہل السنۃ والجماعۃ، گمراہ فرقے معطلہ کی طرح قرآنِ حکیم میں کسی لفظی یا معنوی تحریف کے مرتکب نہیں ہوتے۔ معطلہ ''استویٰ'' کا معنیٰ ''استولیٰ''، ''وجاء ربک'' کا معنیٰ ''وجاء أمر ربک'' سے کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی صفت رحمۃ کا معنیٰ ارادۂ انعام سے کرتے ہیں (یہ منہجِ اہل السنۃ کے خلاف ہے)

ولا يلحدون في أسماء الله وآياته ولا يكيفون ولا يمثلون صفاته بصفات خلقه.

ترجمہ: اھل السنۃ والجماعۃ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور آیات میں الحاد کا شکار نہیں نہ ہی اللہ تعالیٰ کی صفات کی کیفیت بیان کرتے ہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارہ میں مخلوق کی صفات کے ساتھ مشابہت کا عقیدہ رکھتے ہیں

❀ ❀ ❀

عبارت کی تشریح

......**شرح**......

مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اھل السنہ والجماعۃ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں اور اس کی آیات میں الحاد کے مرتکب نہیں ہوتے الحاد کا لغوی معنی یہ ہے کہ کسی شئی سے عدول کر کے دوسری طرف میلان اختیار کرنا...... اسی سے لفظ لحد ہے، لحد کو لحد اس لئے کہتے ہیں کہ قبر کو زمین کی طرف کھودتے ہیں پھر زمین کی سمت سے انحراف کرتے ہوئے قبلہ کی سمت کھدائی کرتے ہیں (جسے لحد کہا جاتا ہے)

اللہ تعالیٰ کے اسماء وآیات میں الحاد سے مراد یہ ہے کہ ان کے اصل حقائق اور صحیح معانی سے عدول کر کے باطل معنی کی طرف پھرنا اور میلان اختیار کر لینا۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں الحاد کی کئی صورتیں ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے ناموں سے اشتقاق کرتے ہوئے بتوں کے نام رکھنا جیسا کہ ''الالٰہ'' سے ''اللات''، ''العزیز'' سے ''العزی'' اور ''المنان'' سے ''مناۃ'' کے نام رکھے گئے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے ایسے نام رکھنا، جو قطعاً اللہ تعالیٰ کے لائق نہیں ہیں، جیسا کہ نصاریٰ نے اللہ تعالیٰ کا ''أب'' یعنی باپ نام رکھا اور فلاسفہ اللہ تعالیٰ کا نام موجب یا علتِ فاعلہ رکھتے ہیں

(۳) مختلف نقائص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کرنا اللہ تعالیٰ جن صفات سے منزہ ہے، جیسا کہ یہود نے کہا تھا: ﴿ اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَنَحْنُ اَغْنِیَاءُ ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم غنی ہے...... اسی طرح یہود کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، اسی طرح یہود کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن آرام کیا تھا (اللہ تعالیٰ ان کی ان تمام باتوں سے پاک اور بلند و بالا ہے)

(۴) الحاد کی چوتھی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے معانی وحقائق کا انکار کر دینا، جیسا کہ جہمیہ کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام خالی الفاظ ہیں جن کا نہ تو کوئی معنی ہے اور نہ کوئی حقیقت اور نہ ہی وہ کسی صفت کو متضمن ہوتے ہیں۔ چنانچہ جہمیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت ''سمیع'' کسی سننے پر دلالت نہیں کرتی، صفت ''بصیر'' کسی دیکھنے پر دلالت نہیں کرتی، صفت ''الحی'' کسی حیاۃ پر دلالت نہیں کرتی۔

(۵) الحاد کی پانچویں صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارہ میں مخلوق کی صفات سے تشبیہ کا عقیدہ رکھنا جیسا کہ اہل تشبیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ میرے ہاتھ جیسا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی اس بات سے بلند ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کے اسماء وآیات میں الحاد کے مرتکب ہیں، بڑی سخت وعید سنائی ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَلِلّٰہِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اَسْمَآئِہٖ سَیُجْزَوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴾ (الاعراف:۱۸۰)

ترجمہ: ''اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کیلئے ہیں، سو ان ناموں سے اللہ ہی کو موسوم کیا کرو اور ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں، ان لوگوں کو ان کے کیے کی ضرور سزا ملے گی''

نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ آیاتِنَا لَایَخْفَوْنَ عَلَیْنَا ﴾ (فصلت:۴۰)

ترجمہ: ''بیشک جو لوگ ہماری آیتوں میں کج روی کرتے ہیں وہ (کچھ) ہم سے مخفی نہیں''

مصنف رحمہ اللہ نے یہاں یہ بھی بتلایا ہے کہ اھل السنۃ والجماعۃ اللہ تعالیٰ کی صفات کی تکییف اور تمثیل نہیں کرتے، ان دونوں کا معنی پیچھے گزر چکا۔

لأنه سبحانه لاسمی له ولا كفو له ولاندله ولايقاس بخلقه سبحانه وتعالىٰ فانه سبحانه أعلم بنفسه وبغيره وأصدق قيلا وأحسن حديثا من خلقه.

ترجمہ: اس لئے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا نہ کوئی ہم نام ہے، نہ کوئی مثل ہے نہ کوئی مشابہ ومماثل ہے اور نہ ہی اسے مخلوق کے ساتھ قیاس کیا جاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی ذات کو اور دوسروں کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے اور پوری خلق میں سب سے زیادہ سچی اور اچھی بات کہنے والا ہے۔

۞ ۞ ۞

عبارت کی تشریح

...... **شرح** ......

مصنف رحمہ اللہ نے اھل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ بتلادیا کہ وہ بلاتکییف اور بلاتمثیل اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان لائے ہیں، تو اب ان کے اس عقیدے کی تعلیل وتوجیہ پیش کررہے ہیں یعنی یہ بتلارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ''سمی'' یعنی ہم نام نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ ایسا کوئی شخص نہیں جو اللہ تعالیٰ کے کسی نام کا حقدار ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مریم میں ارشاد فرمایا:

﴿ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ﴾ ''کیا تم کوئی اس کا ہم نام جانتے ہو''

یہ استفہام انکاری ہے معنی یہ ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کا ہم نام یا مماثل نہیں ہے، اسی طرح کوئی اللہ تعالیٰ کا ''کفو'' یعنی ہمسر ومثل نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص میں فرمایا:

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ﴾ ''اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے''

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کوئی ''ند'' یعنی نظیر وشبیہ نہیں ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرۃ (۲۲)

میں فرمایا: ﴿ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا ﴾ ''خبردار باوجود جاننے کے اللہ تعالیٰ کے شریک مقرر نہ کرو''

''ولا يقاس بخلقه'' یعنی اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ قیاس نہ کیا جائے قیاس کرنے سے مراد مثل بنانا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو مخلوقات کے مثل اور مشابہ نہ بنایا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْأَمْثَالَ ﴾ (النحل:۷۴)

ترجمہ: ''اللہ کیلئے مثالیں بیان نہ کرو''

لہذا اللہ تعالیٰ کو مخلوقات میں سے کسی پر قیاس نہ کیا جائے نہ اس کی ذات میں، نہ اسماء وصفات میں اور نہ ہی اس کے افعال میں اور وہ اللہ جو خالق ہے اور ہر طرح کے کمال سے متصف ہے اسے بھلا ان لوگوں کے ساتھ کیسے قیاس کرسکتے ہیں جو اس کی مخلوق ہیں اور صفاتِ نقص سے متصف ہیں؟ اللہ تعالیٰ قیاس وتمثیل سے انتہائی بلند ہے۔

مصنف کا قول ''فانه سبحانه أعلم بنفسه وبغيره'' یعنی اللہ تعالیٰ اپنی ذات کو اور دوسروں کو سب سے بہتر جانتا ہے پیچھے بیان کردہ ایک حکم کی تعلیل ہے، وہ حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کیلئے جو صفات بیان فرمائی ہیں ان پر ایمان لانا واجب ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کو مخلوق کی صفت سے قیاس نہیں کرسکتے؛ اس کی علت یہ ہے کہ یہ خبر چونکہ اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات کو نیز اپنی مخلوقات کی صفات کو سب سے بہتر جاننے والا ہے، لہذا ہم اللہ تعالیٰ کی ان خبروں کو تسلیم کرلیں اور جو صفات اس نے اور اس کے رسول نے بیان فرمادی ہیں ان پر ایمان لے آئیں۔

اور پھر یہ خلق اپنے علم سے اللہ تعالیٰ کا احاطہ کرنے سے قطعی قاصر ہے اور اللہ تعالیٰ ان صفات کمال سے متصف ہے جن تک مخلوقات کی عقل کو کوئی رسائی حاصل نہیں تو پھر ضروری ہوا کہ ہم اسی

چیز کو مان لیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے پسند فرمائی؛ کیونکہ اسے سب سے زیادہ علم ہے کہ کون کون سی صفت اس کے لائق شان ہے اور ہمیں اس کا قطعی علم نہیں ہے۔

"وہ ذات سب سے سچ اور خوبصورت بات کہنے والی ہے"

جب یہ بات طے ہے تو پھر اس کی ہر خبر صدق وحق ہے، لہذا ہم پر فرض ہے کہ ہم اس کی مکمل تصدیق کریں اور کسی قسم کا معارضہ نہ کریں۔

اور چونکہ اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ تمام الفاظ سب سے خوبصورت ہیں فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ ہیں، اور اس ذات نے اسی اسلوب سے اپنے لائق شان تمام اُسماء وصفات بیان فرمادیئے اور خوب اور مکمل بیان فرمادیئے تو انہیں قبول وتسلیم کرنا ہی قطعی وحتمی طور پر واجب ٹھہرا۔

ثم رسله صادقون مصدوقون بخلاف الذين يقولون عليه مالايعلمون

ترجمہ: پھر اللہ تعالیٰ کے تمام رسول صادق ومصدوق ہیں اور بالخصوص ان لوگوں کے مقابلے میں جو اللہ تعالیٰ پر بلاعلم جھوٹی باتیں باندھتے ہیں۔

عبارت کی تشریح

شرح

اللہ تعالیٰ کے تمام رسول صادق ومصدوق ہیں، صادق سے مراد وہ شخص جس کی ہر خبر مطابقِ واقع ہو، تو اللہ تعالیٰ کے رسول اس چیز میں بالکل سچے ہیں جو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارہ میں خبر دے رہے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے تمام رسول مصدوق ہیں یعنی سچے قرار دیئے گئے ہیں، اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے پاس بواسطۂ ملائکہ جو وحی آتی ہے اس میں وہ مصدوق ہیں، چنانچہ وہ واقعی اللہ تعالیٰ کی وحی اور انبیاء کرام اپنی خواہش سے کچھ بھی کلام نہیں کرتے۔ یہ انبیاءِ کرام کی سند کی توثیق ہے، چنانچہ انبیاء کی طرف حق پہنچایا گیا، انبیاء نے بکمال صدق وامانت اس حق کو پہنچادیا تو جب یہ سارا معاملہ حق پر قائم ہے تو پھر انبیاء نے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارہ میں جو خبر دے دی اسے قبول کرنا واجب ہے پھر ان انبیاءِ کرام کے مقابلے میں ان لوگوں کے قول کی کیا حیثیت ہے جو اللہ تعالیٰ پر بلاعلم باتیں باندھتے ہیں، نہ انہیں شریعت کا علم ہے، نہ دین کا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا۔ وہ تو جو کچھ بھی کہتے ہیں محض اپنے ظنون وتخیلات سے کہتے ہیں یا پھر شیاطین سے حاصل کرلیتے ہیں، ان شیاطین سے مراد جھوٹے مدعیانِ نبوت، مبتدع لوگ، زندیق لوگ، جادوگر، کاہن، نجومی اور علماءِ سوء ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الشعراء میں ارشاد فرمایا:

﴿ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ . تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ . يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ﴾ (الشعراء:۲۲۱تا۲۲۳)

ترجمہ: ''کیا میں تمہیں بتاؤں شیطان کس پر اترتے ہیں۔ وہ ہر ایک جھوٹے پر اترتے ہیں (اچٹتی) ہوئی سنی سنائی پہنچا دیتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں''

نیز ارشاد فرمایا: ﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ﴾ (البقرۃ:۷۹)

ترجمہ: ''ان لوگوں کیلئے ''ویل'' ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس طرح دنیا کماتے ہیں، ان کے ہاتھوں کی لکھائی کو اور ان کی کمائی کو ویل (ہلاکت) اور افسوس ہے''

اب جبکہ یہ ثابت ہو گیا کہ

اللہ تعالیٰ اپنی ذات کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔

دوسروں کی ذوات وصفات کو بھی سب سے زیادہ جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قول میں سب سے سچا ہے۔

اس کا کلام حسن وفصاحت وضاحت میں سب سے خوبصورت اور آگے ہے۔

اس کے تمام رسول اس کے بارہ میں دی ہوئی اپنی ہر خبر میں سچے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے مابین جو ملائکۃ الوحی کا واسطہ وہ بھی سچا ہے۔

تو پھر اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ نے جو کچھ فرما دیا اور بالخصوص اسماء وصفات کے باب میں نصاً واثباتاً جو کچھ بیان کر دیا اس پر اعتماد کرنا واجب ہے۔

نیز بدعتی، گمراہ اور ملحد قسم کے لوگوں، اللہ تعالیٰ کی صفات میں حقیقت کی بجائے مجاز کے

پیداروں اور مختلف وسائل سے صفات کی نفی کرنے والوں کے اقوال کو پاؤں کی ٹھوکر سے رد کرنا واجب ہے، ان مبتدعین وملحدین نے جو کچھ کہا انبیاء کی دعوت سے یکسر انحراف کرتے ہوئے اور اپنی اھواءِ نفس پر اعتماد کرتے ہوئے یا ان لوگوں کی تقلید کرتے ہوئے کہا جو بذاتِ خود گمراہ ہیں اور کسی چیز میں کسی قسم کا قدوہ یا اسوہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

ولهذا قال : سبحان ربک رب العزة عما يصفون وسلام على المرسلين والحمد لله رب العالمين، فسبح نفسه عما وصفه به المخالفون للرسل وسلم على المرسلين لسلامة ماقالوه من النقص والعيب.

ترجمہ: یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''سبحان ربک......'' ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مخالفین رسل کی باتوں سے اپنی پاکیزگی بیان فرمائی، پھر انبیاءِ کرام کو سلام بھیجا کہ جن کا عقیدہ ہر اس نقص وعیب سے پاک تھا جو مخالفین نے اللہ رب العزت کی طرف منسوب کیا۔

❁ ❁ ❁

عبارت کی تشریح

شرح......

مصنف رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا آیات کو سابقہ حکم کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا کلام اُصدق واَحسن ہے کی تعلیل کے طور پر ذکر فرمایا، یہ آیات مختصر تفسیر کے ساتھ درج ذیل ہیں:

﴿ سُبۡحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ. وَسَلَامٌ عَلَی الۡمُرۡسَلِیۡنَ. وَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ ﴾ (الصافات:۱۸۰تا۱۸۲)

ترجمہ: ''پاک ہے آپ کا رب جو بہت بڑی عزت والا ہے ہر اس چیز سے (جو مشرک) بیان کرتے ہیں۔ پیغمبروں پر سلام ہے۔ اور سب طرح کی تعریف اللہ کیلئے ہے جو سارے جہاں کا رب ہے''

''سُبۡحَانَ'' اسم مصدر ہے، تسبیح سے ہے، تنزیہ یعنی پاکیزگی بیان کرنے کے معنی میں۔

''رَبِّکَ'' رب وہ مالک وسید ہے جو اپنی نعمتوں سے اپنی مخلوق کو پالنے والا ہے۔

''الۡعِزَّة'' قوت، اور غلبہ واقتدار کے معنی میں ہے، رب کی العزۃ کی طرف اضافت از قبیل اضافۃ الموصوف الی الصفۃ ہے۔

''یَصِفُوۡنَ'' سے مراد نقص وعیب کی وہ تمام صفات جو مخالفین رسل نے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیں، اور جو ہرگز اللہ تعالیٰ کے لائقِ شان نہیں۔

''وَسَلَامٌ عَلَی الۡمُرۡسَلِیۡنَ'' مرسلین، رسل کی جمع ہے، مراد اللہ تعالیٰ کے وہ نمائندے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی طرف مبعوث فرمایا، اور جنہوں نے اپنے پروردگار کے تمام پیغامات اس کے بندوں تک پہنچادیئے۔

مرسلین پر سلام کے دو معنی ہیں: یا تو سلام بمعنی تحیۃ وتحفہ ہے، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر مقام پر ہر قسم کے شر اور مکروہ سے سلامتی عطا فرمانے کی نوید ہے۔

''الۡعَالَمِیۡنَ'' عالم کی جمع ہے، اس سے مراد ماسوی اللہ ہر چیز ہے، ان آیاتِ کریمہ کا اجمالی معنی مؤلف رحمہ اللہ نے خود بیان فرمادیا ہے یعنی: انبیاءِ کرام کے اعداء ومخالفین نے اپنے کفر وعناد کو بروئے کار لاتے ہوئے سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کی طرف مختلف صفاتِ نقص منسوب کیں، اللہ تعالیٰ نے ان تمام نقائص سے اپنی پاکیزگی کا اعلان فرمایا، پھر اپنے انبیاء ومرسلین کو بڑی شاباش دی، تحیہ وسلام سے نوازا، ہر مکروشر سے محفوظ رکھنے کی بشارت دی کہ ان نفوسِ قدسیہ نے ان معاندین ومنکرین کے درمیان انتہائی صبر واستقامت سے زندگی بسر کی، اور پوری جرأت وشجاعت کے ساتھ پروردگار کی تسبیح وتنزیہ کرتے رہے، اور معاندین کے کفر والحاد سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔

ان آیاتِ کریمہ سے درج ذیل فوائد حاصل ہو رہے ہیں:

(۱) گمراہوں اور جاہلوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف صفاتِ نقص منسوب کی ہیں جو ہرگز اللہ تعالیٰ کے لائقِ شان نہیں، ان تمام صفات سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ وتسبیح۔

(۲) تمام رسولوں کے سچا ہونے کا عقیدہ رکھنا، اوران کی بیان کردہ ہر ہر بات اور ہر ہر خبر کو دوبا قبول کرنا۔

(۳) رسولوں پر تحیہ وسلام کی مشروعیت، نیز ان کی تعظیم واحترام کا وجوب۔

(۴) انبیاءِ کرام کی دعوت وشریعت کے خلاف، کسی کی طرف سے جو کچھ وارد ہوا سے قطعی طور پر ٹھکرا دینا، خصوصاً وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے متعلق ہیں۔

(۵) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کی حمد وثناء بیان کرنا، اور اس کا شکر ادا کرتے رہنا ایک امرِ مشروع ہے، خصوصاً سب سے بڑی نعمت، نعمتِ توحید پر۔

چنانچہ ایک موحد، نعمتِ توحید پر کہ جو سب سے بڑی نعمت ہے جس قدر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کم ہے۔

وهو سبحانه وتعالىٰ قد جمع فيما وصف وسمى به نفسه بين النفي والاثبات ، فلا عدول لأهل السنة والجماعة عما جاء به المرسلون فانه الصراط المستقيم

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ذات کیلئے جو اسماء وصفات بیان فرمائے ان میں نفی واثبات کو جمع فرمایا، یہی انبیاء ومرسلین کا لایا ہوا منہجِ سدید ہے، یہی صراطِ مستقیم ہے، اہلِ السنۃ والجماعۃ کو اس سے روگردانی جائز نہیں ہے۔

عبارت کی تشریح

...... شرح ......

یہ اس عظیم منہج کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسماء وصفات کے تعلق سے اپنی کتاب مقدس میں تحریر فرمادیا۔ اس اہم باب میں، اس منہج کو اختیار کرنا ہر مؤمن کا فریضہ ہے۔ وہ منہج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اسماء وصفات میں نفی واثبات کو جمع فرمادیا ہے۔

نفی سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ صفت جو کمال کے منافی ہے اور کسی قسم کے عیب یا نقص پر مشتمل ہے، اس کی اللہ تعالیٰ سے نفی کرنا واجب ہے۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ کے مثل یا شریک کی نفی، اللہ تعالیٰ سے اونگھ، نیند، موت اور تھکاوٹ کی نفی۔

اثبات سے مراد یہ ہے کہ جو بھی صفاتِ کمال اور نعوتِ جلال ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت کرنا واجب ہے۔

سورۃ الحشر کی یہ دو آیتیں اللہ تعالیٰ کی صفات کمال وجلال پر مشتمل ہیں بلکہ بعض صفاتِ نقص کی نفی بھی موجود ہے۔ لہذا نفی اور اثبات کے اس منہج کو اختیار کرنا ضروری ہے، آیات ملاحظہ ہوں:

﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ . هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴾

ترجمہ: ”وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہ، نہایت پاک، سب عیبوں سے صاف، امن دینے والا، نگہبان، غالب، زور آور اور بڑائی والا، پاک ہے اللہ ان چیزوں سے جنہیں یہ اس کا شریک بناتے ہیں۔ وہی اللہ ہے پیدا کرنے والا، بنانے والا، صورت بنانے والا، اسی کیلئے (نہایت) اچھے نام ہیں، ہر چیز خواہ وہ آسمانوں میں ہو خواہ زمین میں وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے، اور وہی غالب حکمت والا ہے“

اس کے علاوہ بہت سی صفات ہیں، جنہیں مؤلف رحمہ اللہ کتاب وسنت کے حوالوں سے بطور نمونہ عنقریب ذکر فرمائیں گے۔

مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں نفی واثبات کا منہج، انبیاءِ کرام کا منہج ہے، جس سے روگردانی کرنا، اہلِ السنۃ والجماعۃ کیلئے قطعاً جائز نہیں یہ روگردانی کیسے ممکن ہوسکتی ہے، اہل السنۃ والجماعۃ تو انبیاءِ کرام کے نقشِ قدم کے پیروکار ہوتے ہیں اور انہیں کے انوار وتجلیات سے اپنے قلوب واذہان کو منور کرتے ہیں۔ چنانچہ انبیاءِ کرام نے اسی اصلِ عظیم کو ثابت کیا، یعنی صفاتِ کمال کا اثبات اور صفاتِ نقص سے تنزیہ......انبیاءِ کرام کے اس راستے سے عدول وانحراف تو ان کے اعداء ومخالفین کا شیوہ ہے۔

پھر مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نفی واثبات کا یہی منہج صراطِ مستقیم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہی انبیاء کا راستہ ہے اور انبیاء کا راستہ صراطِ مستقیم ہی ہوتا ہے۔ صراطِ مستقیم وہ ایک راہِ اعتدال ہے جو ہر قسم کے تعدد وانقسام سے بالاتر ہوتا ہے، سورۃ فاتحہ میں ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴾ کی

دعا میں یہی راستہ مراد ہے۔ اس سے بڑی اس راستے کی عظمت کی کیا دلیل ہوگی کہ ہم اپنی نماز کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ سے صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کرتے رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ سورۃ الانعام کی درج ذیل آیتِ کریمہ میں اسی صراطِ مستقیم کا ذکر ہے:

﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ﴾ (الانعام:۱۵۳)

ترجمہ: ”اور یہی ہے میرا راستہ اسی کی اتباع کرو، اور دوسری راہوں کی اتباع مت کرو، وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کردیں گی۔“

صراط الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين .

صراطِ مستقیم ان لوگوں کا راستہ ہے، جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔

❁ ❁ ❁

عبارت کی تشریح

شرح

صراطِ مستقیم کا ذکر چل رہا ہے، یہ وہ سیدھا اور عظیم راستہ ہے جو انبیاء و مرسلین اپنے پروردگار کی طرف سے لائے، جس میں عقیدہ کے باب کا خاص طور پر بڑی اہمیت اور تفصیل کے ساتھ ذکر ہے، اسی راستے پر اہل السنۃ والجماعۃ چلتے رہے اور چل رہے ہیں، یہ خالص راستہ ان لوگوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام یافتہ ہیں اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسا انعام کیا جو ہر اعتبار سے بھرپور اور مکمل ہے اور ابدی سعادت کے ساتھ متصل و مربوط ہے، یہ وہ عظیم لوگ ہیں جن کے مبارک راستے کی ہدایت طلب کرتے رہنے کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دے دیا ہے۔

واضح ہو کہ یہ چار قسم کے لوگ ہیں جو انعامِ مطلق کے حقدار قرار پائے ہیں۔

☆ **النبیون**: نبی کی جمع ہے، یہ وہ پاک باز انسان ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی نبوت ورسالت کیلئے مختص ومنتخب فرمالیا، گزشتہ صفحات میں ان کی تعریف بیان ہو چکی ہے۔

☆ **الصدیقون**: صدیق کی جمع ہے یہ وہ لوگ ہیں جو قول وعمل کے انتہائی سچے، اور بڑی جرأت وشجاعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرنے والے ہیں، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خوب اور بھرپور اطاعت کی، اور اطاعت وغلامی کے اس پورے راستے میں ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخلص رہے۔

☆ **الشهداء**: شہید کی جمع ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں۔ شہید کو شہید اس لیئے کہا جاتا ہے کہ وہ عملِ شہادت کے موقع پر مشهود له بالجنة ہوتا ہے، یا پھر اس لیئے کہ شہادت کے موقع پر رحمت کے فرشتے شہید یعنی موجود ہوتے ہیں۔

☆ **الصالحون**: صالح کی جمع ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے تمام حقوق اور پھر بندوں کے تمام حقوق پوری دیانت داری کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ صراطِ مستقیم بعض اوقات براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب مضاف ہوتا ہے، جیسے قولہ تعالیٰ: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ (الانعام:۱۵۳)

ترجمہ: ''اور یہی ہے میرا راستہ اسی کی اتباع کرو''

صراط کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے ہے کہ یہ عظیم راستہ، اللہ تعالیٰ اور بعض اوقات نیک بندوں کی طرف منسوب ہوتا ہے، جیسے سورۂ فاتحہ کی آیت میں ہے: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف صراط کی نسبت اس لحاظ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ راستہ بنایا اور قائم فرمایا ہے، جبکہ نیک بندوں کی طرف اس لحاظ سے ہے کہ وہ اس راستہ پر چلتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں ایک بڑا لطیف نکتہ اور اشارہ ہے اور وہ یہ ہے کہ صراطِ مستقیم پر چلنے والے کو ایک عظیم رفاقت حاصل ہے اور وہ انبیاء وصدیقین وشہداء وصالحین کی ہے، چنانچہ صراطِ مستقیم پر چلنے والا اپنے آپ کو تنہا نہ سمجھے، اور اگر زمانہ اس کا ساتھ نہیں دے رہا بلکہ اس پر مخالفت وعداوت کے تیر چلا رہا ہے تو وہ کسی خوف ووحشت میں مبتلا نہ ہو بلکہ یہ سوچ کر مطمئن ومسرور ہو جائے کہ جس راہ پر وہ چل رہا ہے اس پر اس کے ہم سفر انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔

اب شیخ رحمہ اللہ کتاب وسنت سے کچھ مثالیں پیش فرمائیں گے جن میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا اثبات ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

الاستدلال على اثبات أسماء الله وصفاته من القرآن الكريم

قرآنِ حکیم سے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے اثبات پر استدلال

١. الجمع بين النفي والاثبات في وصفه تعالىٰ

اللہ تعالیٰ کے صفات کے باب میں نفی واثبات کا جمع ہونا

وقد دخل في هذه الجملة ما وصف الله به نفسه في سورة الاخلاص التي تعدل ثلث القرآن . حيث يقول: ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ . اَللّٰهُ الصَّمَدُ . لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ . وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾

❁ ❁ ❁

ترجمہ: اس جملہ یعنی اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں نفی واثبات کے جمع ہونے کیلئے سورۃ الاخلاص کو کہ جو ایک تہائی قرآن کے برابر ہے بطورِ مثال پیش کیا جاسکتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ . اَللّٰهُ الصَّمَدُ . لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ . وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾

ترجمہ: ”آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک (ہی) ہے۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے“

آیت کی تشریح

شرح ......

مؤلف رحمہ اللہ، اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے باب میں نفی واثبات کے جمع ہونے کو قرآن پاک کی مثالوں سے ثابت فرماتے ہیں، اس سلسلہ میں سب سے پہلے سورۂ اخلاص پیش کی، کیونکہ اس سورۃ کی بڑی فضیلت ہے اس سورۃ کو سورۂ اخلاص کا نام اس لیئے دیا گیا کہ یہ خالص اللہ تعالیٰ

کی صفات پر مشتمل ہے، یا اس لئے کہ یہ سورۂ اپنے پڑھنے والے کو شرک سے خلاصی دلاتی ہے، پھر اس سورہ کی یہ فضیلت بھی ہے کہ یہ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے، اس کی دلیل صحیح بخاری میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، فرماتے ہیں:

ایک شخص نے دوسرے شخص کو بار بار ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھتے ہوئے دیکھا، صبح اس شخص نے یہ بات نبی ﷺ کو بتادی، اس کے انداز سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس عمل کو چھوٹا اور حقیر سمجھ رہا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

[والذي نفسي بيده انها لتعدل ثلث القرآن] اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ سورہ تو ایک تہائی قرآن کے برابر ہے]

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”سورۂ اخلاص کے ایک تہائی قرآن کے برابر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مضامینِ قرآن تین ہیں: (۱) توحید (۲) احکام (۳) قصص، سورۂ اخلاص صفتِ رحمٰن پر مشتمل ہے، لہذا یہ مکمل سورۂ توحید کے مضمون پر پوری ہوئی، اور توحید کا مضمون ثلثِ قرآن ہے جس سے ثابت ہوا کہ سورۂ اخلاص ثلثِ قرآن کے برابر ہے۔“

اس سورہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”قل“ یعنی اے محمد ﷺ کہہ دیجئے! یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اگر یہ محمد ﷺ کا کلام ہوتا تو آپ ﷺ ”قل“ کیوں اور کسے کہتے؟

” هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ “ وہ ایک ہے، جس کا نہ کوئی نظیر ہے، نہ وزیر نہ مثیل اور نہ شریک۔

” اَللّٰهُ الصَّمَدُ “ اللہ تعالیٰ سید یعنی سردار ہے، جو اپنی سرداری، اور شرف وعظمت میں کامل ہے کہ اس میں تمام صفاتِ کمال موجود ہیں اور تمام خلائق اس کی محتاج ہیں، اور اپنی تمام ضروریات ومہمات میں اسی کا قصد کرتی ہیں۔

"لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ" نہ اس کا کوئی بیٹا ہے نہ باپ، اس میں نصاریٰ اور مشرکین کا رد ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹے کی نسبت کرتے ہیں۔

"وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ" اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر نہیں ہے،

اس سورت کو پیش کرنے سے مصنف رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے باب میں نفی واثبات دونوں موجود ہیں، چنانچہ "اللہ احد. اللہ الصمد" اثبات ہے اور "لم یلد ولم یولد. ولم یکن لہ کفوا احد" نفی ہیں (اللہ تعالیٰ کی صفات میں نفی واثبات کے جمع ہونے کا معنی یہ ہے کہ ہر صفتِ نقص کی اللہ تعالیٰ سے نفی ضروری ہے، اور ہر صفتِ کمال کا اثبات ضروری ہے کما تقدم)

وما وصف به نفسه فى أعظم آية فى كتابه حيث يقول:

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ﴾ [اى لايكرثه ولايثقله] ﴿ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴾ (البقرة:٢٥٥)

ولهذا كان من قرأ هذه الآية فى ليلة لم يزل عليه من الله حافظ ولايقربه شيطان حتى يصبح.

اللہ تعالیٰ کی صفات میں نفی واثبات کے جمع ہونے کی دوسری مثال قرآن حکیم کی سب سے بڑی آیت "آیۃ الکرسی" ہے، اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کیلئے جن اوصاف کا ذکر فرمایا ہے ان میں نفی اور اثبات کے دونوں رنگ موجود ہیں (آیت الکرسی کا ترجمہ ملاحظہ ہو)

ترجمہ "اللہ تعالیٰ ہی معبودِ برحق ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو زندہ اور سب کو تھامنے والا ہے، جسے نہ اونگھ آئے نہ نیند، اس کی ملکیت میں زمین وآسمان کی تمام چیزیں ہیں کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کرسکے وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرسکتے، مگر جتنا وہ چاہے، اس کی کرسی کی وسعت نے زمین وآسمان کو گھیر رکھا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت سے نہ تھکتا اور نہ اکتاتا ہے، وہ بہت بلند اور بہت بڑا ہے"

اس لیئے آیت الکرسی پڑھنے کی بڑی فضیت وارد ہے، چنانچہ جو شخص رات کو آیۃ الکرسی پڑھ کر سوئے، اس پر شب بھر کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک محافظ مقرر ہو جاتا ہے اور صبح تک شیطان بھی اس کے قریب نہیں پھٹکتا۔

عبارت کی تشریح

شرح......

واضح ہو کہ آیت کا لغوی معنی علامت ہے، جبکہ قرآنی اصطلاح میں آیت سے مراد، قرآنی کلمات پر مشتمل وہ حصہ یا ٹکڑا، جو بذریعہ ”فاصلہ“ دیگر آیات سے جدا اور متمیز ہو۔

مؤلف رحمہ اللہ نے جس سب سے بڑی آیت کا ذکر فرمایا ہے اس سے مراد آیۃ الکرسی ہے، اس آیت کو آیت الکرسی اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں (اللہ تعالیٰ کی) کرسی کا ذکر ہے۔

آیت الکرسی کے قرآن حکیم کی سب سے بڑی آیت ہونے کی دلیل، ایک صحیح حدیث ہے جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں روایت فرمایا ہے۔

چنانچہ ابی بن کعب ؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے سوال کیا قرآن کی سب سے بڑی آیت کونسی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا سوال بار بار دھرایا، تو ابی بن کعب ؓ نے جواب دیا: سب سے بڑی آیت، آیۃ الکرسی ہے، تب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے ابوالمنذر (ان کی کنیت) تجھے شاندار علم مبارک ہو۔

آیۃ الکرسی کے قرآن حکیم کی سب سے بڑی آیت ہونے کا سبب یہ ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسماء وصفات پر مشتمل ہے، نیز بہت سی صفاتِ نقص جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ وتقدیس کو بھی محتوی ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ”اَللّٰہُ لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ“ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، چنانچہ معبودِ برحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اس کے سوا جتنے بھی معبود قائم کیئے گئے ہیں سب باطل ہیں جن کی عبادت سب سے بڑا باطل ہے۔

”اَلْـحَیُّ“ یعنی وہ کمالِ حیات کی صفت سے متصف ہے، اس کیلئے ازل سے ابد تک دوام وبقاء ہے، اس پر کسی صورت فناء طاری نہیں ہوگا۔

”اَلْقَیُّوْمُ“ یعنی وہ ایسی ذات ہے جو قائم بنفسہ ہے، اور تمام مخلوقات کو قائم رکھے ہوئے اور سنبھالا دیئے ہوئے ہے، چنانچہ وہ اپنی خلق سے بے نیاز ہے، البتہ پوری خلق ہر لحظہ اس کی محتاج ہے۔

بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ”اَلْـحَیُّ الْقیوم“ اللہ تعالیٰ کا وہ اسمِ اعظم ہے کہ جب بھی اس کے واسطے و وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جائے گی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا، اور جب بھی سوال کیا جائے گا عطا فرمائے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ صفت ”اَلْـحَیُّ“ تمام صفاتِ ذاتیہ پر دال ہے، جبکہ صفت ”القیوم“ تمام صفتِ فعلیہ کی مظہر ہے، گویا اللہ تعالیٰ کی تمام صفات انہی دو عظیم الشان اور بابرکت ناموں پر دائر وراجع ہیں۔

”لَا تَـاْخُـذُہٗ سِـنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ“ اللہ تعالیٰ کی کمالِ قیومیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اسے نہ تو نیند آتی ہے اور نہ اُونگھ۔

واضح ہو کہ ”سِنَۃٌ“ ہلکی نیند کو کہتے ہیں جو صرف آنکھوں میں ہوتی ہے ”السِنَۃ“ کا مترادف ”النعاس“ ہے۔ جبکہ ”النوم“ سے مراد گہری نیند، یہ اونگھ سے اقویٰ ہوتی ہے، اور یہ دل کے اندر ہوتی ہے، نیند کو موت کا بھائی کہا جاتا ہے۔

”لَہٗ مَـافِـی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ“ یعنی آسمانوں اور زمینوں کی ہر چیز کا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہے اور خالق بھی، ہر چیز اس کی غلام ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ عالم علوی وسفلی دونوں کا تنہا مالک وخالق ہے۔

”مَـنْ ذَا الَّـذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ“ یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس، اس کے امر واذن کے

بغیر کوئی شفاعت نہیں کرسکتا۔ شفاعت، شفع سے مشتق ہے، شفع (جفت) وتر (طاق) کی ضد ہے شافع کو شافع اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دوسرے کے سوال میں اپنا سوال شامل کرکے، اس کے وتر کو جفت کردیتا ہے۔

شفاعت سے مراد، کسی کیلئے خیر کا سوال کرنا ہے، یہاں مراد، ایک مؤمن کی دوسرے مؤمن یا مؤمنین کیلئے اللہ تعالیٰ سے ان کی گناہوں اور معصیتوں کی بخشش فرمادینے کا سوال کرنا ہے۔

تمام تر شفاعت، اللہ تعالیٰ کی مِلک ہے لہذا یہ کسی کو اللہ تعالیٰ کے اِذن وامر کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی، شفاعت کے اس عقیدہ میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کا نکتہ پنہاں ہے چنانچہ اس کی عظمت وکبریائی کی ہیبت کی وجہ سے کوئی بھی شخص اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس کسی بھی شخص کی شفاعت تک کی ہمت وطاقت نہیں رکھتا۔

''یَعْلَمُ مَابَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَاخَلْفَهُمْ '' مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم واطلاع، ماضی ومستقبل کے تمام امور کو محیط ومشتمل ہے اس پر کسی بھی وقت کوئی بھی چیز پوشیدہ وہ مخفی نہیں ہے۔

''وَلَایُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَاءَ ''

ترجمہ'''' وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرسکتے، مگر جتنا وہ چاہے'' یعنی بندے اللہ تعالیٰ کے علم میں سے کچھ بھی نہیں جان سکتے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء ومرسلین کی زبانوں یا دیگر مختلف اسباب ووسائل سے خود کچھ علم عطا فرمادے۔

''وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ '' اللہ تعالیٰ کی کرسی کے بارہ میں ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا عرش ہے۔ دوسرا قول یہ وارد ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے دوقدم رکھنے کی جگہ ہے۔ اس کی کرسی کی عظمت ووسعت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے واضح ہوتی ہے کہ یہ تمام آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ وسیع اور کشادہ ہے۔

''وَلَایَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا '' یعنی عالم علوی وسفلی کے پورے نظام کی حفاظت اللہ تعالیٰ کیلئے قطعی دشوار، بوجھل یا مشکل نہیں ہے، یہ اللہ رب العزت کی کمالِ قدرت وقوت کی دلیل ہے۔

''وَهُوَ الْعَلِیُّ '''' وہ بہت بلند ہے'' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کیلئے علو مطلق ہے۔ (اس کے علو کی تین صورتیں ہیں)

(۱) علو ذات: یعنی اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ تمام مخلوقات سے اوپر اور بلند ہے، جیسا کہ فرمان ہے: ''وہ عرش پر مستوی ہے''

(۲) علو قدر: یعنی باعتبار قدر ومرتبہ وہ اس قدر بلند ہے کہ تمام صفاتِ کمال وجلال اس کیلئے خاص ہیں۔

(۳) علو قہر: یعنی وہ باعتبار قہر وغلبہ ہر چیز پہ قادر ہے، چنانچہ ہر چیز پر اس کا امر وتصرف چلتا ہے، کوئی چیز اس کے احاطہ تصرف سے ممتنع نہیں ہے۔

''الْعَظِیْمُ '' یعنی اللہ تعالیٰ تمام صفاتِ عظمت سے متصف ہے، اس کے تمام انبیاء، فرشتوں اور جملہ مؤمنین کے دلوں میں اس کی مکمل تعظیم پیوست ہے۔

الغرض آیۃ الکرسی جو اتنے عظیم معانی پر مشتمل ہے، اس بات کی پوری حقدار ہے کہ وہ قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت قرار پائے، نیز اس کا پڑھنے والا ہر قسم کے شر اور غلبۂ شیاطین سے محفوظ رہے۔

آیت الکرسی کو یہاں پیش کرنے سے مؤلف رحمہ اللہ کا مقصود یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء وصفات کے بیان میں کئی مقامات پر نفی واثبات کو جمع فرمایا ہے۔

چنانچہ آیت الکرسی میں '' اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ '' میں ہر ماسوی اللہ کی الوہیت کی نفی اور اللہ تعالیٰ کے اِلٰہ ہونے کا اثبات ہے۔

''اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ '' میں اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ حیات وقیومیت کا اثبات ہے۔

''لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ '' میں اللہ تعالیٰ سے اونگھ اور نیند کی نفی ہے۔

''لَهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ '' میں اللہ تعالیٰ کیلئے عالمِ علوی وسفلی میں مکمل ملکیت کا اثبات ہے۔

"مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ" میں اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر ہر طرح کی شفاعت کی نفی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے کمالِ عظمت اور خلق سے مستغنی ہونے کی دلیل ہے۔

"یَعْلَمُ مَابَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَاخَلْفَھُمْ" میں اللہ تعالیٰ کیلئے ماضی و مستقبل کی ہر شئی کے مکمل علم کا اثبات ہے۔

"وَلَایُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ" میں اس حقیقت کا اظہار و بیان ہے کہ پوری خلق اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے، جبکہ اللہ رب العزت کیلئے اپنی پوری خلق سے مستغنی ہونے کا اثبات ہے۔

"وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" میں اللہ تعالیٰ کی کرسی، اور اس کے کمالِ عظمت وجلالت کا اثبات ہے، نیز یہ بیان مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اس کی مخلوق کسقدر چھوٹی ہے۔

"وَلَایَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا" میں اللہ تعالیٰ سے ہر قسم کی عاجزی اور تھکاوٹ کی نفی ہے۔

"وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ" میں اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ علو وعظمت کا اثبات ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کے قول:

"جو شخص رات کو آیۃ الکرسی پڑھ کر سوئے، اس پر شب بھر کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک محافظ مقرر ہو جاتا ہے اور صبح تک شیطان بھی اس کے قریب نہیں پھٹکتا۔" میں دراصل صحیح بخاری میں ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے، اس حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

ترجمہ: [جب تو اپنے بستر پر آئے، تو آیۃ الکرسی "اَللّٰہُ لَآاِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ......" آخر تک پڑھ لیا کر، اس کے پڑھ لینے سے تجھ پر رات بھر کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک محافظ مقرر ہو جائے گا اور صبح تک شیطان تیرے قریب نہیں آپائے گا]

شیطان کا اطلاق ہر سرکش اور نافرمان جن یا انسان پر ہوتا ہے، یا تو یہ "شطن" بمعنی "بعد"

سے ماخوذ ہے "بعد" کا معنی دور ہونا ہے، اس معنی کے لحاظ سے اس کا نام شیطان اس لئے رکھا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہے۔

یا شیطان "شاط یشیط" "بمعنی" اشتد یشتد "بمعنی سخت ہونا سے ماخوذ ہے (کیونکہ اس کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کیلئے شدید ہے)

۲۔ الجمع بین علوه وقربه وأزليته وأبديته

اللہ رب العزت کی ذات میں علو وقرب اور ازلیت وابدیت کا جمع ہونا

وقوله سبحانه وتعالىٰ: ﴿ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴾ (الحدید:۳)

ترجمہ: ''وہی پہلے ہے اور وہی پیچھے، وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی، اور وہ ہر چیز کو بخوبی جاننے والا ہے''

آیت کی تشریح

شرح

اس آیتِ کریمہ کی تفسیر خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان مروی ہے:

[اللهم أنت الأول فليس قبلك شيء، وأنت الآخر فليس بعدك شيء، وأنت الظاهر فليس فوقك شيء وأنت الباطن فليس دونك شيء]

ترجمہ: [اے اللہ تو اول ہے، تجھ سے پہلے کوئی چیز نہیں اور تو آخر ہے پس تیرے بعد کوئی چیز نہیں، اور تو ظاہر ہے تیرے اوپر کوئی چیز نہیں اور تو باطن ہے تجھ سے قریب کوئی چیز نہیں]

نبی ﷺ نے ان چاروں اسماء کی یہ بڑی مختصر اور واضح تفسیر بیان فرمادی، یہ چاروں اسماءِ مبارکہ اللہ تعالیٰ کے اپنی خلق پر ہر طرح سے احاطہ پر دلالت کررہے ہیں، چنانچہ اسم مبارک ''الاول'' اور ''الآخر'' میں احاطہ باعتبارِ زمان، جبکہ اسم مبارک ''الظاہر'' اور ''الباطن'' میں احاطہ باعتبارِ مکان مذکور وموجود ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ چاروں نام آپس میں متقابل ہیں چنانچہ دونا موں ''الاول'' اور ''الآخر'' میں ازلیت اور ابدیت جبکہ دونا موں ''الظاہر'' اور ''الباطن'' میں علو وقرب پایا جاتا ہے

''الاول'' سے مراد یہ ہے کہ اس کی اولیت، کائنات کی ہر شیٔ کی اولیت سے پہلے ہے۔

''الآخر'' سے مراد یہ ہے کہ اس کی آخریت، دنیا کی ہر شیٔ کی آخریت کے بعد بھی ثابت ہوگی۔ چنانچہ اس کے اول ہونے کا معنی دنیا کی ہر چیز سے پہلے ہونا ہے، اور اس کے آخر ہونے کا معنی دنیا کی ہر چیز کے بعد باقی ہونا ہے۔

اور اس کے ''الظاہر'' ہونے سے مراد دنیا کی ہر چیز کے اوپر اور بلند ہونا ہے ہر شیٔ کا ظاہر وہ حصہ ہوتا ہے جو اوپر ہو، لہذا اللہ تعالیٰ کا ظاہر ہونا م پوری خلق پر علو کے متقاضی ہے۔

اور اس کے ''باطن'' ہونے سے مراد ہر شیٔ کا احاطہ کیئے رکھنا ہے اور وہ اس طرح کہ وہ ہر ایک سے اس کی ذات سے بھی زیادہ قریب ہے، اس قرب سے احاطۂ عامہ مراد ہے''

(انتھی کلام ابن القیم)

اللہ تعالیٰ کے فرمان ''وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم تمام امور خواہ ان کا تعلق زمانہ ماضی سے ہو یا حال سے یا مستقبل سے ہو، اور ہر عالم خواہ وہ علوی ہو یا سفلی اور ہر ظاہر وباطن کو محیط ہے۔ تمام آسمانوں اور زمینوں میں کوئی ذرہ بھی اس کے علم سے مخفی یا اوجھل نہیں ہے۔

اس آیتِ کریمہ کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس میں مذکورہ تمام اسماءِ کریمہ اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہیں، اور یہ تمام اسماء اس امر کے متقاضی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شیٔ کا باعتبارِ زمان، مکان، اطلاع، اندازہ، اور تدبیر احاطہ کیئے ہوئے ہے، وہ ذات انتہائی بلند اور تمام نقائص وعیوب سے پاک ہے۔

وقوله سبحانه: ﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ ﴾ (الفرقان:۵۸)

وقوله: ﴿ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴾ (سبأ:۱)

۞ ۞ ۞

آیات کی تشریح

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ ﴾ (الفرقان:۵۸)

ترجمہ "اس ہمیشہ زندہ اللہ تعالیٰ پر توکل کریں جسے کبھی موت نہیں"

شرح

آیتِ کریمہ "وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ" کا معنی یہ ہے کہ اپنے تمام امور کو اسی ذات کے سپرد کر دیجئے، جسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

شریعت کی اصطلاح میں اسے توکل کہتے ہیں، چنانچہ توکل کا لغوی معنی تفویض، یعنی اپنے امور ومعاملات کسی دوسرے کے سپرد کر دینا ہے، جبکہ اصطلاح شریعت میں توکل سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی نفع بخش چیز کے حصول، یا کسی بھی نقصان دہ چیز کے دفع وازالہ کیلئے دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کر لینا۔

توکل عبادت کی ایک قسم ہے، اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا واجب ہے البتہ اسباب کو اپنانا اور اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے بلکہ حقیقتِ توکل کے عین مطابق ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں توکل کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کی صفت "اَلْحَيّ" مذکور ہے، جس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ جو ذات "اَلْحَيّ" یعنی ہمیشہ زندہ رہنے کی صفت سے متصف ہے وہی اس لائق ہے کہ تمام مصالح کے حصول میں اس پر بھروسہ کیا جائے، چنانچہ دائمی حیات اور ہمیشہ بقاء اللہ رب العزت کیلئے مخصوص ہے...... اللہ تعالیٰ کے علاوہ سب کی زندگی ایک وقتِ مقرر پر ختم ہو جائے گی، لہذا کسی بھی مخلوق پر توکل کیا گیا، تو وہ اس کی موت کے بعد دم توڑ جائے گا، اور توکل کرنے والا بھی محرومیوں کا شکار ہو جائے گا۔

اس آیتِ کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں نفی واثبات کے جمع ہونے کا رنگ موجود ہے چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کیلئے حیاتِ کاملہ کا اثبات ہے، جبکہ موت کی نفی ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴾ (سبأ:۱)

ترجمہ: وہ (بڑی) حکمتوں والا اور (پورا) باخبر ہے"

شرح

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴾ میں "الحکیم" کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ اللہ رب العزت دنیا وآخرت میں اپنی تمام خلق پر، امرِ شرعی اور امرِ کونی یعنی ہر قسم کے امر کے ساتھ حاکم ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ "الحکیم" حکمت سے مأخوذ ہے جس کا معنی ہر شئی کو اس کی مناسب جگہ پر رکھنا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ایسا حاکم ہے کہ جس کا کوئی خلق یا امر حکمت سے خالی نہیں، اس نے کوئی شئی عبث پیدا نہیں فرمائی، اسی طرح اس کا ہر حکمِ شرعی مصلحت کے عین مطابق ہے۔

"اَلْخَبِيرُ" الخبرۃ سے مأخوذ ہے، جس کا معنی ہے ہر شئی کا ظاہراً وباطناً پر مکمل احاطہ کرنا، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ "اَلْخَبِيرُ" ہے جو ہر شئی کے ظاہری پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے تمام باطنی اور خفیہ گوشوں کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔

اس آیتِ کریمہ کو پیش کرنے کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ اللہ رب العزت کی ذات کیلئے اس کے بہت سے ناموں کے ساتھ ساتھ یہ دو اسماء بھی ثابت ہیں۔ (۱) "اَلْحَكِيمُ" (۲) "اَلْخَبِيرُ" اور یہ دونوں نام ایک ایک صفت کو متضمن ہیں، پہلی صفت "الحکم" اور دوسری "الخبرۃ" ہے۔

۳. احاطة علمه بجميع مخلوقاته

اللہ تعالیٰ کا علم تمام مخلوقات پر محیط ہے

وقولہ: ﴿ يَعْلَمُ مَايَلِجُ فِى الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ﴾ (سبأ:۲)

وقوله: ﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَايَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَافِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَاتَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَاحَبَّةٍ فِى ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَارَطْبٍ وَّلَايَابِسٍ إِلَّا فِىْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (الانعام:۵۹)

۞ ۞ ۞

آیات کی تشریح

شرح

﴿ يَعْلَمُ مَايَلِجُ فِى الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ﴾ (سبأ:۲)

ترجمہ ''جو زمین میں جائے اور جو اس سے نکلے جو آسمان سے اترے اور جو چڑھ کر اس میں جائے وہ سب سے باخبر ہے''

''يَعْلَمُ مَايَلِجُ فِى الْاَرْضِ '' سے مراد یہ ہے کہ زمین میں داخل ہونے والی ہر شئی مثلاً بارش، بیج، خزانے اور مُردے سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔

'' وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا '' سے مراد یہ ہے کہ زمین سے نکلنے والی ہر شئی مثلاً پودے اور معدنیات وغیرہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔

'' وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ '' سے مراد یہ ہے کہ آسمان سے اُترنے والی ہر شئی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے مثلاً: بارش اور فرشتے وغیرہ۔

'' وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا '' سے مراد یہ ہے کہ آسمانوں کی طرف چڑھ جانے والی ہر شئی مثلاً: فرشتے اور بندوں کے اعمال بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔

اس آیتِ کریمہ کو پیش کرنے کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے علم کا مالک ہے جو کائنات کی ہر ہر شئی کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَايَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَافِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَاتَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَاحَبَّةٍ فِى ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَارَطْبٍ وَّلَايَابِسٍ إِلَّا فِىْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (الانعام:۵۹)

ترجمہ:''اور اللہ تعالیٰ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں، (خزانے) ان کو کوئی نہیں جانتا بجز اللہ کے اور وہ تمام چیزوں کا جانتا ہے جو کچھ خشکی میں ہیں اور جو کچھ دریاؤں میں ہیں اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کو بھی جانتا ہے اور کوئی دانہ زمین کے تاریک حصوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور نہ خشک چیز گرتی ہے مگر یہ سب کتاب مبین میں ہیں''

شرح

اللہ تعالیٰ کے فرمان:'' وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ '' سے مراد یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس غیب کے خزانے ہیں،''مَفَاتِحُ الْغَيْبِ '' سے مراد وہ چیزیں بھی ہوسکتی ہیں جن کے ذریعے، امورِ غیب کے علم وادراک تک پہنچا جاسکتا ہو۔'' لَايَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ '' کا معنی یہ ہے کہ ان مفاتح الغیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، امورِ غیب میں سے کسی شئی کے علم کا دعویٰ کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ مفاتح الغیب کی تفسیر ایک صحیح حدیث میں وارد ہے، چنانچہ صحیحین میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:[غیب کی چابیاں پانچ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، پھر آپ ﷺ نے یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿ وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمٰتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴾ (الانعام:۵۹)

"وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ" میں "البر" سے مراد زمین کا خشکی والا حصہ ہے، خواہ وہ آباد ہو یا ایسا غیر آباد ہو کہ اس میں انسانوں، جانوروں یا پودوں وغیرہ کا کوئی وجود نہ ہو، چنانچہ خشکی کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، جبکہ "الْبَحْرِ" سے مراد سمندر کی ہر چیز ہے جیسے سمندر کے حیوانات یا جواہر وغیرہ، یہ سب بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ "وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ" سے مراد یہ ہے کہ برو بحر کے کسی بھی درخت کے کسی بھی پتے کا گرنا اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ تو یہ بھی جانتا ہے کہ وہ پتہ کب اور کہاں گرا۔

"وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمٰتِ الْأَرْضِ" سے مراد یہ ہے کہ تاریک زمین کے پیٹ میں موجود ہر دانہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ "وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ" عموم بعد الخصوص ہے جس کا معنی یہ ہے کہ تمام موجودات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔

"إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ" کا معنی یہ ہے کہ مذکورہ بالا اشیاء میں سے ہر شئی لوحِ محفوظ میں لکھی جا چکی ہے۔

اس آیتِ مبارکہ کو پیش کرنے کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ علمِ غیب صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر شئی کا احاطہ کیئے ہوئے ہے، اس آیتِ کریمہ میں تقدیر کا اثبات بھی ہے، نیز یہ کہ ہر چیز لوحِ محفوظ میں لکھی جا چکی ہے۔

وقوله: ﴿ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثٰى وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ﴾ (فاطر:۱۱)

وقوله: ﴿ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَّأَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴾ (الطلاق:۱۲)

وقوله: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ﴾ (الذاريات:۵۸)

۞ ۞ ۞

آیات کی تشریح

﴿ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثٰى وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ﴾ (فاطر:۱۱)

ترجمہ: "عورتوں کا حاملہ ہونا اور بچوں کا تولد ہونا سب اس کے علم سے ہی ہے"

شرح

آیتِ کریمہ: "وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثٰى وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ" سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں ہر حمل اور وضعِ حمل اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، کوئی چیز اس کے علم وتدبیر سے خارج نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کوئی عورت کب حاملہ ہوئی اور کب اس حمل کو وضع کرے گی، نیز یہ کہ اس کا حمل لڑکا ہے یا لڑکی۔

۞ ۞ ۞

﴿ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَّأَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴾

ترجمہ: "تا کہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو بہ اعتبار علم گھیر رکھا ہے۔ (الطلاق:۱۲)

شرح

آیتِ کریمہ: "لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" کی لام، ماقبل آیت "خلق

"سَبْعَ سَمٰوَاتٍ" سے متعلق ہے،اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان اور سات زمینیں اس لئے پیدا فرمائیں تاکہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا علم اور اندازہ ہوجائے۔نیز تمہیں یہ بھی معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر شئی کو محیط ہے،اور کوئی چیز خواہ وہ کچھ بھی ہو اللہ تعالیٰ کے علم سے باہر نہیں ہے،آیتِ کریمہ میں "عِلْمًا" کا منصوب ہونا بربنائے تمیز ہے یا پھر اگر احاطہ بمعنی علم ہو تو پھر بربنائے مصدریت ہے۔

مذکورہ دونوں آیتوں کو پیش کر کے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے علم اور ایسی قدرت کا مالک ہے جو ہر شئی کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔

❁ ❁ ❁

﴿ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴾ (الذاريات:۵۸)

ترجمہ:"اللہ تعالیٰ خود ہی سب کا روزی رساں توانائی والا اور زور آور ہے"

شرح

آیتِ کریمہ:"إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوقات کو روزی دینے والا اور ان کی مصلحتوں کا خیال رکھنے والا ہے،نیز اللہ تعالیٰ کے رزق کے خزانے بہت وسیع ہیں،لہٰذا ضروری ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی رازق نہیں ہوسکتا۔"ذُو الْقُوَّةِ" سے مراد ایسی قوت اور طاقت کا مالک جو ہر لحاظ سے مکمل ہے اور جسے کبھی بھی کسی قسم کا کوئی ضعف لاحق نہیں ہوسکتا۔"الْمَتِيْنُ" وہ ذات ہے جو قوت اور قدرت کی انتہاء کو پہنچی ہوئی ہے،جس کو اپنے افعال میں کسی مشقت،کلفت اور تھکاوٹ لاحق نہیں ہوتی۔لغوی اعتبار سے "متین" متانت سے ہے،جو شدت اور قوت کا معنی دیتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ کو پیش کرنے کا مقصد اللہ تعالیٰ کے اسمِ مبارک "الرزاق" کا اثبات ہے، نیز اللہ تعالیٰ ایک ایسی مکمل قوت کا مالک ہے جس میں کسی کمزوری یا تھکاوٹ کا شائبہ تک نہیں۔

ان صفات سے اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کے فرض ہونے کا استدلال بھی ہوتا ہے۔

۴۔اثبات السمع والبصر للہ سبحانہ

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کیلئے صفتِ سمع اور صفتِ بصر کا اثبات

وقوله: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

وقوله: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴾

❁ ❁ ❁

آیات کی تشریح

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

ترجمہ"اس جیسی کوئی چیز نہیں وہ سننے اور دیکھنے والا ہے"

شرح

پیش کردہ پہلی آیتِ مبارکہ"لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" کا ابتدائی حصہ یوں ہے:"فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَّمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا"

ترجمہ:"وہ آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے ان نے تمہارے لئے تمہاری جنس کے جوڑے بنادیئے ہیں اور چوپایوں کے جوڑے بنائے ہیں"

اس کی تفسیر میں امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہر چیز کا جوڑا جوڑا بنانے والی اللہ تعالیٰ کی ذات جیسی کوئی چیز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اکیلا اور بے نیاز ہے جس کی کوئی مثال یا نظیر نہیں ہے "وَهُوَ السَّمِيْعُ" سے مراد تمام آوازیں سننے والا،"الْبَصِيْرُ" ہر چیز دیکھنے والا،جس پر زمین وآسمان کے کسی گوشہ کی کوئی چیز مخفی نہ ہو۔

امام شوکانی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

’’ جو شخص اس آیتِ کریمہ پر کما حقہ تدبر کر کے اس کے صحیح معنی کے فہم کو حاصل کر لے تو وہ صفاتِ باری تعالیٰ میں اختلاف کرنے والوں کے اختلاف کے وقت انتہائی روشن اور واضح جادہ پر چلتا رہے گا، اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ’’وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ‘‘ کے صحیح معنی پر تأمل کے نتیجہ میں اس کی بصیرت میں مزید اضافہ ہو جائے گا؛ کیونکہ ’’وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ‘‘ نفیِ مماثل کے بعد اثباتِ صفات پر دلالت کو مشتمل ہے جس سے یقین کی قوت، سینوں کی شفاء اور دلوں کی ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ تو طالبِ حق اس روشن حجت اور انتہائی قوی دلیل کی قدر کو پہچان لے، تو اس آیتِ کریمہ کے ذریعے بہت سی بدعات کی تفنید کر سکتا ہے، ضلالت کے بہت سے سروں کو کچل سکتا ہے اور متکلمین کے بہت سے گروہوں کی پیشانیوں کو خاک آلود کر سکتا ہے، خاص طور پہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴾ کو بھی ساتھ ملائے رکھے (تو تیری حجت اہلِ باطل کے خلاف مزید قوی ہو جائے گی۔) ‘‘

۞ ۞ ۞

﴿ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴾

ترجمہ: ’’یقیناً وہ بہتر چیز ہے جس کی نصیحت تمہیں اللہ تعالیٰ کر رہا ہے بے شک اللہ تعالیٰ سنتا ہے، دیکھتا ہے‘‘ (النساء:۵۸)

......شرح......

مؤلف رحمہ اللہ کی پیش کردہ دوسری آیت: ’’إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ ‘‘ سے قبل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ’’إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ‘‘

ترجمہ: ’’اللہ تعالیٰ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہنچاؤ! اور لوگوں کا فیصلہ کرو تو عدل و انصاف سے فیصلہ کرو!‘‘

’’نِعِمَّا ‘‘ دو الفاظ سے مرکب ہے، ایک ’’نعم‘‘ جو کلمہ مدح ہے، دوسرا ’’ما‘‘ جس کے بارہ میں دو قول ذکر کیئے گئے ہیں اور وہ دونوں صحیح ہیں، ایک یہ کہ ’’ما‘‘ نکرۂ موصوفہ ہے، اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا: ’’جو اچھی چیزیں ہیں ان کی اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت فرماتا ہے‘‘۔ دوسرا یہ کہ ’’ما‘‘ کو موصولہ قرار دیا جائے، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا: ’’وہ چیزیں اچھی ہیں جن کی اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت فرماتا ہے‘‘۔

’’يَعِظُكُمْ ‘‘ بمعنی ’’يأمركم ‘‘ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں امانتوں کو ادا کرنے اور لوگوں کے درمیان عدل سے فیصلہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ’’إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری ہر بات کو سننے والا اور ہر فعل کو دیکھنے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں کو پیش کرنے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی صفتِ سمع اور صفتِ بصر کا اثبات ہے، پہلی آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات سے مماثلت کی نفی بھی مذکور ہے، اس طرح یہ آیتِ کریمہ صفاتِ باری تعالیٰ میں نفی و اثبات کو جمع کیئے ہوئے ہے (یعنی ہر صفتِ نقص کی نفی اور ہر صفتِ کمال کا اثبات۔

۱.۵ اثبات المشيئة والارادة لله سبحانه

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کیلئے مشیت وارادہ کا اثبات

وقوله: ﴿ وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَاءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ﴾

وقوله: ﴿ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَااقْتَتَلُوا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَايُرِيدُ ﴾ (البقرة:۲۴۳)

وقوله: ﴿ أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَايُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَايُرِيدُ ﴾ (المائدة:۱)

❁ ❁ ❁

آیات کی تشریح

شرح

﴿ وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَاءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ﴾

ترجمہ "تو نے اپنے باغ میں جاتے وقت کیوں نہ کہا اللہ کا چاہا ہونے والا ہے، کوئی طاقت نہیں مگر اللہ کی مدد سے" (الکھف:۳۹)

مولف رحمہ اللہ کی پیش کردہ پہلی آیت: "وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَاءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" کا معنی یہ ہے کہ جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے "مَاشَآءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" کیوں نہیں کہا؟۔

واضح ہو کہ اس کلمہ میں بندے کی عاجزی کا اظہار اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تامہ کا اعتراف ہے یعنی اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو اسے قائم رکھے اور چاہے تو فنا کردے۔ بعض علماءِ سلف کا کہنا ہے کہ جس شخص کو کوئی چیز اچھی لگے وہ فوراً "مَاشَآءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" کہا کرے۔

❁ ❁ ❁

شرح

﴿ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَااقْتَتَلُوا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَايُرِيدُ ﴾ (البقرة:۲۴۳)

ترجمہ "اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے، لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے"

دوسری آیتِ مبارکہ "وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَااقْتَتَلُوا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَايُرِيدُ" کا معنی یہ ہے کہ ان کا نہ لڑنا اگر اللہ تعالیٰ کی چاہت ہوتا تو پھر وہ بالکل نہ لڑتے (مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا فیصلہ ان کی لڑائی کا تھا لہذا وہ لڑے) تو اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے مُلک وبادشاہت میں صرف وہی کچھ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، نہ تو کوئی اس کے حکم کو ٹال سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کی قضاء وقدر کو تبدیل کرسکتا ہے۔

❁ ❁ ❁

﴿ أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَايُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَايُرِيدُ ﴾ (المائدة:۱)

ترجمہ: "تمہارے لئے مویشی چوپائے حلال کئے گئے ہیں بجز انکے جن کے نام پڑھ کر سنا دیئے جائیں گے مگر حالتِ احرام میں شکار کو حلال جاننے والے نہ بننا، یقیناً اللہ جو چاہے حکم کرتا ہے"

شرح

تیسری آیت: "أُحِلَّتْ لَكُمْ" میں مؤمنین سے خطاب ہے، اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں مثلاً اونٹ، گائے اور بکری وغیرہ کی حلت کا ذکر کیا ہے، "إِلَّا مَايُتْلٰى عَلَيْكُمْ" میں کچھ چوپاؤں کا استثنیٰ ذکر کرنا مقصود ہے، جو کچھ آگے ذکر کردہ آیت: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ ﴾ کے ضمن میں مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: "غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ" بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ سے دوسرا استثنیٰ ہے۔ اب معنی یوں ہوگا "تمہارے لئے تمام چوپائے حلال

کردیئے گئے ہیں، علاوہ ان چوپاؤں کے جو وحشی ہیں؛ کیونکہ وحشی چوپائے شکار کے جانور ہیں جو حالتِ احرام میں جائز نہیں ہیں چنانچہ محرم خواہ حاجی ہو یا معتمر شکار نہیں کرسکتا۔ ''إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ رب العزت کسی بھی شئی کی تحلیل یا تحریم کا جو چاہے فیصلہ صادر فرمادے اس کے کسی فیصلے پر کوئی اعتراض وارد نہیں کرسکتا۔

ان آیاتِ مبارکہ کو پیش کرنے کا مقصد اللہ تعالیٰ کیلئے مشیئت، ارداہ، قوت اور حکم کی صفات کا اثبات ہے یہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کیلئے جیسے اس کے جلال وعظمت کے لائق ہیں، ثابت ہیں۔

وقولہ: ﴿ فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ ﴾ (الانعام:۱۲۵)

ترجمہ: ''سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کا ارادہ فرمالے اس کے سینہ کو اسلام کیلئے کشادہ کردیتا ہے، اور جس کو گمراہ کرنے کا ارادہ فرمالے، اسکے سینہ کو بہت تنگ کردیتا ہے جیسے کوئی آسمان میں چڑھتا ہے''

آیت کی تشریح

شرح

قولہ تعالیٰ: ''فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَهْدِيَهُ'' میں ''مَن'' کلمۂ شرط ہے، جو فعلِ شرط اور جوابِ شرط کا متقاضی ہوتا ہے، اور دونوں کو جزم دیتا ہے، یہاں ''يُرِدْ'' فعلِ شرط ہے، اور ''يَشْرَحْ'' جوابِ شرط۔

آیت کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ جس شخص کی توفیق وہدایت کا فیصلہ فرمالے اور اس کے دل کو ہر خیر کو قبول کرنے والا بنانے کا ارادہ فرمالے تو اس کے سینے کو حق کیلئے خوب وسعت عطا فرمادیتا ہے حتی کہ وہ انتہائی روشن اور وسیع سینے کے ساتھ دینِ اسلام کو قبول کرلیتا ہے۔

''وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا'' یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ جس شخص کو قبولِ حق سے پھیرنا چاہتا ہے تو اس کے سینے کی وسعت کو ختم کرکے اسے بہت تنگ بنادیتا ہے، اس تنگی کی موجودگی میں حق کے داخل ہونے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ ''حَرَجًا'' ''ضَيِّقًا'' کی معنوی تاکید ہے۔

''كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ'' ''يصعد'' اصل میں ''يتصعد'' تھا مقصد یہ ہے کہ جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ تنگ کردیتا ہے وہ بار بار تکلف کے ساتھ ایسی چیز کی کوشش کرتا ہے جو اس کے

بس میں نہیں، جیسے اس شخص کی سعی لاحاصل جو آسمان پر چڑھنے کی کوشش کرے۔ یہاں کافر پر ایمان کے انتہائی بوجھل ہونے کا ذکر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کا سینہ تنگ کر کے اس کیلئے قبولِ ایمان کو ایک ناممکن امر بنادیتا ہے، جیسا کہ آسمان کی طرف چڑھنا ناممکن ہے۔

اس آیتِ کریمہ کو پیش کرنے کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کیلئے صفتِ ارادہ ثابت وبرحق ہے، اللہ تعالیٰ کی صفتِ ارادہ بندوں کی ہدایت یا گمراہی کو بھی شامل ہے، یعنی اللہ رب العزت اپنی حکمتِ بالغہ کے ساتھ ہدایت کا ارادہ بھی فرماتا ہے اور گمراہی کا بھی۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) **ارادئہ کونیہ قدریۃ** : یہ ارادہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت کہلاتا ہے، اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا ﴾ (الاسراء:۱۶)

ترجمہ: ''اور جب ہم کسی بستی کی ہلاکت کا ارادہ کر لیتے ہیں تو وہاں کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس بستی میں کھلی نافرمانی کرنے لگتے ہیں''

اس کی دوسری مثال: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ﴾

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو سزا دینے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ بدلا نہیں کرتا'' (الرعد:۱۱)

ایک اور مثال: ﴿ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا ﴾ (الانعام:۱۲۵)

ترجمہ: ''اور جس کو گمراہ کرنے کا ارادہ فرمالے، اسکے سینہ کو بہت تنگ کر دیتا ہے''

(۲) **ارادئہ دینیۃ شرعیۃ**: اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ﴾ (النساء:۲۷)

ترجمہ: ''اللہ تمہاری توبہ قبول کرنا چاہتا ہے''

دوسری مثال: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ ﴾ (المائدۃ:۶)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ تم پر کسی قسم کی تنگی ڈالنا نہیں چاہتا بلکہ اس کا ارادہ تمہیں پاک کرنے کا ہے''

ایک اور مثال: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ (الاحزاب:۳۳)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ اے نبی کی گھر والیو! تم سے وہ (ہر قسم کی) گندگی کو دور کر دے اور تمہیں خوب پاک کر دے''

ان دونوں ارادوں میں فرق

ارادۂ کونیہ قدریہ اور ارادۂ دینیہ شرعیہ میں تین وجوہ سے فرق کیا جاسکتا ہے:

(۱) ارادۂ کونیہ کبھی تو اللہ تعالیٰ کو پسند ہوتا ہے اور کبھی ناپسند لیکن ارادۂ شرعیہ لازمی طور پہ اللہ تعالیٰ کا محبوب وپسندیدہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معصیت کا کوناً وقدراً فیصلہ فرماتا ہے لیکن شرعاً اسے پسند نہیں فرماتا۔

(۲) ارادۂ کونیہ مقصود لغیرھا ہوتا ہے (یعنی ارادۂ کونیہ مقصود بالذات نہیں ہوتا لیکن اس کے ذریعے دیگر مقاصد حاصل ہوسکتے ہیں) جیسے ابلیس اور دیگر تمام شرور کا پیدا کرنا۔ ان سے بہت سے اچھے مقاصد بھی حاصل ہوتے ہیں مثلاً: ابلیس کے شر سے بچنے کیلئے محنت ومجاہدہ اور مثلاً اگر کسی پر ابلیس اپنا وار کر جائے تو اس کا توبہ واستغفار، (اور یہ تمام پسندیدہ امور ہیں)

جبکہ ارادۂ شرعیہ مقصود بالذات ہوتا ہے چنانچہ جتنے بھی اعمالِ اطاعت ہیں وہ تمام کوناً وشرعاً مقصود بالذات ہیں اور انتہائی محبوب اور پسندیدہ ہیں۔

(۳) ارادۂ کونیہ ہر حال میں واقع ہو کر رہتا ہے جبکہ ارادۂ شرعیہ کا وقوع لازمی نہیں کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا (لیکن یہ ہونا یا نہ ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے تابع ہے)

تنبیہ: ہماری اس تقریر سے یہ نکتہ سمجھنے میں آئے گا کہ ایک مخلص اور اطاعت گزار بندے میں ارادے کی مذکورہ دونوں قسمیں یعنی ارادۂ کونیہ اور ارادۂ شرعیہ جمع ہوتی ہیں، جبکہ نافرمان

بندے میں صرف ارادۂ کونیہ موجود ہوتا ہے، ارادۂ شرعیہ نہیں۔

تنبیہ: جو شخص ارادے کی ان دو قسموں کو نہیں مانتا یا ان دونوں قسموں میں مذکورہ فرق نہیں کرتا وہ گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے، جیسا کہ جبریہ اور قدریہ گمراہ ہوگئے، جبریہ نے صرف ارادۂ کونیہ کو جبکہ قدریہ نے صرف ارادۂ شرعیہ کو ثابت کیا اور دونوں گمراہ ہوگئے۔ اہل السنۃ اللہ تعالیٰ کے ارادے کی ان دونوں قسموں کے قائل نیز ان دونوں میں پائے جانے والے فرق کو ثابت کرتے ہیں لہٰذا وہ حق پر قائم ہیں۔

[٦] اثبات محبة الله ومودته لأوليائه على ما يليق بجلاله.

اللہ تعالیٰ کا اپنے اولیاء سے اپنی شایانِ شان محبت کرنے کا اثبات

وقوله: ﴿ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾ (البقرۃ:۱۹۵)
وقوله: ﴿وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴾ (الحجرات:۹) وقوله: ﴿ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴾ (التوبۃ:۴)
وقوله: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴾ (البقرۃ:۲۲۲) وقوله: ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ ﴾ (آل عمران:۳۱) وقوله: ﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ ﴾ (المائدۃ:۵۴) وقوله: ﴿ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ ﴾ (الصف:۴)
وقوله: ﴿ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ﴾ (البروج:۱۴)

شرح

شیخ رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے ارادے ومشیئت پر دلالت کرنیوالی آیات کے ذکر کے بعد، اللہ تعالیٰ کے محبت کرنے کے اثبات پر آیات ذکر کی ہیں، ان آیات میں ضمناً ان لوگوں کا بھی رد ہو گیا جو اللہ تعالیٰ کی محبت اور مشیئت کو ایک چیز سمجھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ دونوں باہم متلازم ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ جس امر کی مشیئت فرماتا ہے، اس سے محبت بھی کرتا ہے، ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ اس مسئلہ میں تفصیل ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کی مشیئت فرماتا ہے لیکن اس سے محبت نہیں کرتا، مثلاً: کافر کا کفر اور دیگر معصیت کے کام اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

ایک چیز کی مشیئت فرماتا ہے اور اس سے محبت بھی کرتا ہے، مثلاً: ایمان اور دیگر نیک اعمال۔

ان آیات کی تشریح

﴿ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾ (البقرۃ:۱۹۵)

"اور احسان کرو، اللہ تعالیٰ احسان کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے"

...... **شرح** ......

اللہ تعالیٰ کا فرمان: " وَأَحْسِنُوا " (احسان کرو) یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے احسان کرنے کا حکم ہے۔ جو کسی بھی عمل کو احسن و اکمل طریقے سے کرنے کا نام ہے، "احسان" اطاعت کا انتہائی اعلیٰ مقام ہے۔

" إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ " (اللہ تعالیٰ احسان کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے)

آیتِ کریمہ کا یہ ٹکڑا امر بالاحسان کی علت ہے اور اس میں دوبارہ امر بالاحسان بھی ہے؛ کیونکہ احسان اور اہلِ احسان سے اللہ تعالیٰ کا محبت کرنا امرِ احسان کی بجا آوری پر ابھارنے کا باعث ہے

﴿ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴾ (الحجرات:۹)

"اور عدل کرو، بے شک اللہ تعالیٰ عدل کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے"

...... **شرح** ......

اللہ تعالیٰ کا فرمان: "وَأَقْسِطُوا" (عدل کرو)

اللہ تعالیٰ کے فرمان "وَأَقْسِطُوا" میں عدل وانصاف کا حکم ہے جس کا مطلب ہے کہ تمام قسم کے معاملات واحکام میں ہر قریب وبعید کے ساتھ عدل وانصاف کیا جائے۔

" إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ " (اللہ تعالیٰ عدل کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے)

یہ امر بالعدل کی تعلیل ہے، جس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عدل وانصاف کا حکم اس لئے دیا کہ اسے عدل کرنے والوں سے محبت ہے۔ عدل کرنیوالوں سے اللہ کی محبت اس بات کو مستلزم ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں بہترین بدلہ عطا فرمائے گا۔

﴿ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴾

(جب تک وہ تم لوگوں سے معاہدہ نبھائیں، تم بھی ان سے وفاداری کرو، اللہ تعالیٰ متقین سے محبت کرتا ہے) (التوبۃ:۴)

...... **شرح** ......

اللہ تعالیٰ کا فرمان: " فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ "

یعنی جب تک مشرکین تمہارے ساتھ کیئے ہوئے معاہدہ پر قائم رہیں اور اسے نہ توڑیں تو تم بھی معاہدہ کی پاسداری کرتے ہوئے ان سے قتال سے گریز کرو۔

"إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ" یہ عہد نبھانے کے حکم کی علت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عہد پر قائم رہنے کا حکم اس لئے دیا کہ یہ اہلِ تقویٰ کا عمل اور وظیفہ ہے جن سے اللہ رب العزت محبت فرماتا ہے تو گویا اس آیتِ کریمہ میں اس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ عہد پر قائم رہنا اوصافِ متقین میں سے ہے۔ تقوی: اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید اور اس کی سزا کے ڈر سے اس کی اطاعت کرتے ہوئے اس کی معصیت سے بچنے کا نام ہے۔

﴿ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴾ (البقرۃ:۲۲۲)

"اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں سے محبت کرتا ہے"

شرح

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ''اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ''

''توابین'' تواب، کی جمع ہے، اور ''تواب'' مبالغے کا صیغہ ہے، جو ''التوبۃ'' سے مأخوذ ہے۔ توبہ، کا لغوی معنی رجوع کرنا ہے، جبکہ شرعی اصطلاح میں گناہوں سے رجوع کرنے کو توبہ کہتے ہیں۔

تواب، کی یہ تفسیر بندے کے تعلق سے ہے، اور اگر ''التواب'' اللہ تعالیٰ کے تعلق سے مذکور ہو تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ہے (یعنی ''التواب'' اگر بندہ ہے تو مراد، توبہ کرنے والا اور اگر اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے تو معنی توبہ قبول کرنے والا۔ امام ابنِ قیم فرماتے ہیں: بندہ بھی ''تواب'' ہے اور اللہ بھی ''تواب'' ہے، بندے کے تواب ہونے کا مطلب اس کا اپنے مالک کی طرف رجوع کرنا جبکہ اللہ تعالیٰ کے تواب ہونے کی دو قسمیں ہیں:

(۱) بندے کو توبہ کی توفیق دینا (۲) بندے کی توبہ قبول کرنا۔

''وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ'' ''المتطهرین'' متطهر، کی جمع ہے متطهر اسم فاعل کا صیغہ ہے اور طہارت سے مأخوذ ہے۔ طہارت کا مطلب ہے حسی و معنوی ہمہ قسم کی گندگی اور نجاست وغیرہ سے پرہیز واجتناب کرنا، اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں توابین اور متطہرین کے بارے میں خبر دی ہے کہ مجھے ان سے محبت ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ﴾ (آل عمران:۳۱)

''آپ کہہ دیجئے! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو، خود اللہ تم سے محبت کرے گا''

شرح

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ''قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ''

امام ابنِ کثیر وغیرہ اس آیت کا شانِ نزول بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے ان کی محبت کو آزمایا لہٰذا اب جو شخص اللہ سے محبت کا دعویٰ کرے لیکن محمد ﷺ کے طریقے پر نہ چلے اس آیت نے فیصلہ کر دیا کہ وہ اپنے دعویٔ محبت میں جھوٹا ہے۔

'' یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ ''، یعنی اللہ تمہیں تمہاری طلب سے بڑھکر دے گا، تمہاری طلب تو اللہ سے محبت کرنا تھی مگر اللہ نے تمہیں اس سے کہیں بڑھ کر اپنی محبت عطا فرما دی، اور اللہ کی تم سے محبت تمہاری اس سے محبت سے افضل واعظم ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿فَسَوْفَ یَأْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ﴾ (المائدۃ:۵۴)

''تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو لائے گا جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرے گا اور وہ بھی اللہ تعالیٰ سے محبت کرے گی''

شرح

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ''فَسَوْفَ یَأْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ''

آیت کا یہ حصہ جوابِ شرط ہے جبکہ شرط آیت کا پہلا حصہ ''مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ'' (تم میں سے جو اپنے دین سے پھر گیا) ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اپنی قدرتِ عظیمہ کی خبر دیتے ہوئے فرما رہا ہے کہ اگر کوئی نصرتِ دین اور اقامتِ شریعت سے پھر گیا تو اللہ تعالیٰ ان کی جگہ ان سے اچھے لوگ لے آئیگا، جو بڑی عظیم صفات کے حامل ہوں گے، ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوگی کہ اللہ کو ان سے اور انہیں اللہ سے محبت ہوگی۔ اس جماعت سے مراد ابو بکر الصدیق اور (خدمتِ دین میں) ان کے ساتھی، صحابہ و تابعین رضی اللہ عنھم ہیں، جنہوں نے مرتدین سے قتال کیا، اس کے بعد قیامت تک آنیوالوں میں سے وہ تمام لوگ جو مرتدین سے قتال کریں گے بھی اس آیت کا مصداق ہیں۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمۡ بُنۡيَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ﴾

’’بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے، جو اس کی راہ میں ایک صف بن کر جہاد کرتے ہیں، گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں‘‘ (الصف:۴)

...... **شرح**

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ’’ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِهٖ ‘‘

اللہ تعالیٰ تاکیدی خبر دے رہا ہے کہ مجھے کچھ لوگوں سے محبت ہے، جن کی صفت یہ ہے کہ وہ اعلاءِ کلمۃ اللہ کیلئے ایک صف ہو کر اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں، قتال کے وقت صفیں بنا لیتے ہیں اور ان صفوں میں ثابت قدمی کیساتھ جمے رہتے ہیں ڈر اور خوف کی بناء پر پیچھے نہیں ہٹتے، سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ملکر اور چپک کر کھڑے ہوتے ہیں درمیان میں کوئی خلل اور شگاف نہیں ہوتا۔

❁ ❁ ❁

﴿ وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ الۡوَدُوۡدُ ﴾ (البروج:۱۴)

’’وہ بڑا بخشنے والا اور بہت محبت کرنیوالا ہے‘‘

...... **شرح**

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ’’ وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ الۡوَدُوۡدُ ‘‘

’’الغفور‘‘ کا معنی بہت زیادہ بخشنے والا۔ ’’غفر‘‘ پردے کو کہتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کے گناہوں سے درگزر فرماتے ہوئے ان پر مکمل پردہ ڈال دیتا ہے۔

’’الودود‘‘ ’’ود‘‘ سے مأخوذ ہے، جو خالص محبت کے معنی میں مستعمل ہے، ’’الودود‘‘ کا معنی اپنے فرمانبرداروں سے محبت کرنے والا۔ اس آیت میں ’’الغفور‘‘ اور ’’الودود‘‘ دو اسموں کو اکٹھا ذکر کرنے میں یہ لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مغفرت فرما کر اس سے محبت کرتا ہے، گویا اپنے بندے کو معاف بھی فرماتا ہے اور معاف فرمانے کے بعد پیار بھی کرتا ہے۔

مصنف رحمہ اللہ ان آیات کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ محبت ومودت کا اثبات کر رہے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ بعض اشخاص، اعمال اور بعض اخلاق سے محبت کرتا ہے، اور بعض سے محبت نہیں بھی کرتا۔ اس کا یہ محبت کرنا اور نہ کرنا اس کی حکمتِ بالغہ کے عین مطابق ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں، انصاف کرنے والوں، تقویٰ والوں، اپنے رسول کی اتباع کرنے والوں، اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں، توبہ کرنے والوں اور طہارت وپاکیزگی اختیار کرنے والوں، سب سے محبت کرتا ہے۔

ان آیات میں محبت من الجانبین کا بھی اثبات ہے: (یعنی محبت من جانبِ بندہ اور محبت من جانبِ رب تعالیٰ) چنانچہ ان دونوں آیات میں غور کرنے سے یہ نکتہ حاصل ہوتا ہے:

’’يُحِبُّهُمۡ وَيُحِبُّوۡنَهٗۤ‘‘ ’’ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ‘‘

ان آیات میں جہمیہ اور معتزلہ کا رد ہے، جو محبت من الجانبین کی نفی کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے: لا یُحَبُّ و لا یُحِبُّ یعنی ’’اللہ تعالیٰ نہ تو محبت کیا جاتا ہے اور نہ ہی کرتا ہے۔‘‘ بندوں کی اللہ تعالیٰ سے محبت کی تاویل، عبادت واطاعت سے کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی بندوں سے محبت کی تاویل، بندوں پر احسان کرنے اور انہیں ان کے اعمال کا ثواب دینے سے کرتے ہیں۔

ان کی یہ تاویل باطل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بندوں سے محبت، اسکی شایانِ شان، مبنی برحق حقیقت ہے، جس طرح اس کی دیگر صفات ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی محبت ومودت بندوں کی محبت ومودت جیسی نہیں۔

[۷] اثبات اتصافه بالرحمة والمغفرة سبحانه وتعالیٰ

اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت ومغفرت کا اثبات

وقولہ: ﴿ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴾ ﴿رَبَّنَاوَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا ﴾ (الغافر:۷) ﴿ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴾ (الاحزاب:۴۳) ﴿وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (الاعراف:۱۵۶) ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ (الانعام:۵۴) ﴿وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ (یونس:۱۰۷) ﴿ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ ﴾ (یوسف:۶۴)

۞ ۞ ۞

ان آیات کی تشریح

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴾

ترجمہ: ''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے''

...... شرح ......

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' اس کی تفسیر کتاب کے شروع میں گزر چکی ہے، یہاں لانے کا مقصد اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ رحمت کا اثبات ہے، امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''الرَّحْمٰن'' اللہ کی صفتِ رحمت جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے پر دلالت کر رہا ہے، اور کلمہ ''الرَّحِيْم'' اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ صفتِ رحمت کا تعلق مرحوم (جس پر رحم کیا گیا) کے ساتھ ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴾ (الاحزاب:۴۳)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ مؤمنوں پر بہت ہی مہربان ہے''

اس طرح کہیں نہیں آیا ''رحمٰن بھم'' (اللہ فلاں کے ساتھ رحمٰن ہے)

لہذا ''الرحمٰن'' صفتِ رحمت اور ''الرحیم'' فعلِ رحمت پر دلالت کرتے ہیں۔ یعنی ''رحمٰن'' دلالت کرتا ہے کہ رحمت اللہ کی صفت ہے اور ''رحیم'' دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنی مخلوق پر فعلاً رحمت کرتا ہے''

۞ ۞ ۞

﴿ رَبَّنَاوَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا ﴾ (الغافر:۷)

ترجمہ: ''اے ہمارے پروردگار تو نے ہر چیز کو اپنی رحمت وعلم سے گھیر رکھا ہے''

...... شرح ......

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں حاملینِ عرش فرشتوں کے متعلق خبر دی جارہی ہے کہ وہ اہلِ ایمان کیلئے استغفار کرتے ہوئے کہتے ہیں'' رَبَّنَاوَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا -یعنی اے اللہ تیری رحمت اور علم ہر چیز پر وسیع ہے، یہ آیت اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت وعموم پر دلالت کرتی ہے، چنانچہ دنیا میں ہر مسلم وکافر کو اللہ تعالیٰ کی رحمت پہنچتی ہے، لیکن آخرت میں اللہ کی رحمت صرف مؤمنوں کے ساتھ خاص ہوگی۔

ملاحظہ: آیتِ کریمہ میں ''رحمةً'' اور ''علماً'' بربناءِ تمیز منصوب ہیں، یہاں تمیز محوّل عن الفاعل ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴾ (الاحزاب:۴۳)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ مؤمنوں پر بہت ہی مہربان ہے''

...... شرح ......

اس آیت میں اللہ تعالیٰ خبر دے رہا ہے کہ وہ دنیا اور آخرت میں مؤمنوں کے ساتھ رحیم ہے، دنیا میں اسطرح کہ انہیں حق کی طرف ہدایت دی، جس سے بہت سے لوگ نا آشنا ہے، اور انہیں صراطِ مستقیم دکھا دیا جس سے بہت سے لوگ گمراہ رہے، اور آخرت میں اس طرح کہ انہیں فزعِ اکبر سے محفوظ فرمائے گا اور جنت میں داخل فرمائے گا۔

﴿ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ (الانعام:۵۴)

ترجمہ: ''تمہارے رب نے رحمت کرنا اپنے ذمہ مقرر کرلیا''

...... **شرح**

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نفسِ کریم پر فضل واحسان کرنا واجب کرلیا ہے۔ یہ لکھنا ''کونیہ قدریہ'' ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی بھی کوئی بات واجب نہیں کرسکتا۔ (اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات پر رحمت کرنا واجب فرمانا اس معنی میں ہے کہ اُس نے تقدیر میں رحمت فرمانے کا حتمی اور قطعی فیصلہ فرمالیا ہے۔ مترجم)

﴿ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ (یونس:۱۰۷)

ترجمہ: ''اور وہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے''

...... **شرح**

اللہ تعالیٰ اپنے متعلق خبر دے رہا ہے کہ میں صفتِ رحمت ومغفرت کے ساتھ متصف ہوں، لہذا جو شخص اپنے گناہوں سے توبہ کرلے چاہے جیسے بھی گناہ ہوں حتی کہ شرک ہی کیوں نہ ہو، نیز اس پر توکل کرلے، تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادیتا ہے، اور اس پر رحمت فرماتا ہے۔

﴿ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَّهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ ﴾ (یوسف:۶۴)

ترجمہ: ''بس اللہ ہی بہترین نگہبان ہے اور وہ سب سے بڑھکر رحم کرنیوالا ہے''

...... **شرح** ......

یہ یعقوب علیہ السلام قول ہے جب ان کے بیٹوں نے مطالبہ کیا کہ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی (بنیامین کو مصر کی طرف غلّہ لینے کیلئے) بھیجیں ہم اس کی مکمل حفاظت کریں گے، تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: ''فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا'' یعنی میں اسے اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دیتا ہوں اور اس کی حفاظت تمہاری حفاظت سے بہت بہتر ہے

اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ''حفیظ'' بھی ہے جس کا معنی ہے کہ وہ اپنی حفظِ عام کے ذریعے بندوں کو ہلاکتوں سے محفوظ رکھتا، اور ان کے اعمال کی بھی حفاظت فرماتا ہے، اور اپنی حفظِ خاص کے ساتھ اپنے مؤمن بندوں کی ہر اس چیز سے خصوصی حفاظت فرماتا ہے جو اُن کے ایمان کو فاسد کردے یا ان کے دین ودنیا میں کسی قسم کے بگاڑ یا نقصان کا باعث بنے۔

ان آیاتِ کریمہ کو ذکر کرنے کا مقصد: ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت ومغفرت کا اثبات ہے۔ یہ دونوں صفات اللہ تعالیٰ کی دیگر تمام صفات کی طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ بالکل اسی طرح ثابت ہیں جس طرح اس کی عظمت وجلالت کے لائق ہیں۔ اس سے جہمیہ اور معتزلہ وغیرہ کا رد بھی ہو رہا ہے، جو کہ اللہ تعالیٰ سے صفتِ رحمت ومغفرت کی نفی کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ کیونکہ مخلوق بھی صفتِ رحمت سے متصف ہے اگر اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ رحمت کو ثابت کیا جائے تو تشبیہ کا محذور لازم آتا ہے، اور یہ لوگ مذکورہ آیات کی تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حقیقی معنی پر نہیں بلکہ مجازی معنی پر قائم ہیں، لیکن ان کی یہ تاویل باطل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کیلئے اس صفتِ رحمت کو ثابت کیا ہے، پھر اللہ کی رحمت مخلوق کی رحمت کی طرح نہیں کہ اس سے ان کے زعمِ باطل کے مطابق تشبیہ کا محذور لازم آئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ایک

قاعدہ کلیہ ہے: ﴿ لَیۡسَ کَمِثۡلِهٖ شَیۡءٌ وَهُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴾ (اللہ تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں) باقی اتفاق فی الاسم اتفاق فی المسمّیٰ کو مقتضی نہیں ہے۔ (یعنی اگر کوئی صفت مخلوق کیلئے مذکور ہے اور وہی صفت خالق کیلئے بھی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں کا معنی بھی ایک جیسا ہو) پس اللہ تعالیٰ کی جو صفات ہیں وہ اُس معنیٰ کامل کے ساتھ ہیں جو اس کے لائق ہے، اور اس کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، جبکہ مخلوق کی صفات اس معنی کے ساتھ ہیں جو مخلوق کے لائق ہے۔

(واللہ اعلم)

[۸] ذکر رضی اللّٰہ وغضبه وسخطه وکراهیته فی القرآن الکریم وأنه متصف بذلک

اللہ تعالیٰ کی رضا، غضب، ناراضگی اور ناپسندیدگی کا قرآنِ حکیم کی روشنی میں بیان۔ اللہ تعالیٰ ان تمام صفات کے ساتھ متصف ہے

وقوله: ﴿ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ ﴾ (المائدۃ:۱۱۹) وقوله: ﴿وَمَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیۡهَا وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَلَعَنَهٗ ﴾ (النساء:۹۳) وقوله: ﴿ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوۡا مَاۤ اَسۡخَطَ اللّٰہَ وَکَرِهُوۡا رِضۡوَانَهٗ ﴾ (محمد:۲۸) وقوله: ﴿ فَلَمَّاۤ اٰسَفُوۡنَا انۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ ﴾ (الزخرف:۵۵) وقوله: ﴿وَلٰکِنۡ کَرِهَ اللّٰہُ انۡۢبِعَاثَهُمۡ فَثَبَّطَهُمۡ ﴾ (التوبۃ:۴۶) وقوله: ﴿ کَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰہِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴾ (الصف:۳)

❁ ❁ ❁

ان آیات کی تشریح

﴿ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ ﴾ (المائدۃ:۱۱۹)

ترجمہ: ’’اللہ ان سے راضی اور یہ اللہ سے راضی‘‘

...... **شرح** ......

یعنی اخلاص کے ساتھ انہوں نے جو نیکی کے کام کیئے ہیں اس پر اللہ ان سے راضی ہوگیا ہے، اور اللہ نے ان کی نیکیوں کے عوض انہیں بطور بدلے کے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان کے ملنے پر وہ بھی اللہ سے راضی ہوگئے ہیں۔

رضائے الٰہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے سب سے ارفع واعلیٰ نعمت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ اَكْبَرُ ﴾ (التوبۃ:۷۲)

ترجمہ: (اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے)

اہلِ ایمان کا اللہ سے راضی ہونا یہ ہے کہ آخرت میں انہیں جو درجات ملیں گے ہر ایک اپنے اپنے درجہ پر راضی اور خوش ہوگا، حتی کہ ہر ایک یہ سمجھے گا کہ مجھ سے بڑھ کر کسی کا درجہ نہیں ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ ﴾ (النساء:۹۳)

ترجمہ: ''اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر ڈالے، اس کی سزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے''

...... **شرح** ......

آیت میں ''مُؤْمِنًا'' کہہ کر کافر سے احتراز کیا گیا ہے، اور ''مُتَعَمِّدًا'' کہہ کر قتلِ خطأ سے احتراز کیا گیا ہے۔ (یعنی یہ سزا اُس شخص کیلئے ہے جو کسی مؤمن کو قتل کرے اور جان بوجھ کر قتل کرے، قتلِ کافر کی یہ سزا نہیں ہے اور نہ ہی غلطی سے قتل کرنے کی یہ سزا ہے)

قتلِ عمد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو جانتے بوجھتے ایسے آلہ سے کہ عرف عام میں اس سے موت واقع ہو جاتی ہے، قتل کرے'' فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ '' آخرت میں اس کی سزا جہنم ہے جہنم آگ کے طبقات میں سے ایک طبقہ ہے۔ ''خَالِدًا فِيهَا'' الخلو دطویل عرصے تک ٹھہرے رہنے کو کہتے ہیں، لیکن یہاں جہنم میں ہمیشہ رہنا مراد ہے۔ ''وَغَضِبَ اللهُ عَلَيْهِ '' عطف ہے، معطوف علیہ مقدر پر، جس پر سیاقِ کلام دلالت کر رہا ہے عبارت یوں ہے'' جعل جزاءه جهنم وغضب عليه '' یعنی اللہ نے اس کی سزا جہنم مقرر کی ہے اور اس پر غضب فرمایا ہے۔

''وَلَعَنَهُ '' یعنی اسے اپنی رحمت سے دھتکار دیا ہے، لعنت کا مطلب ہے، اللہ کی رحمت سے دھتکار دیا جانا اور دور کر دیا جانا۔

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَا اَسْخَطَ اللهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهُ ﴾ (محمد:۲۸)

ترجمہ: ''یہ اس بناء پر ہے کہ یہ وہ راہ چلے جس سے انہوں نے اللہ کو ناراض کر دیا اور انہوں نے اس کی رضامندی کو برا جانا''

...... **شرح** ......

پچھلی آیت میں موت کے وقت فرشتوں کے کفار کے ساتھ سختی کرنے کا جو ذکر ہوا ہے اس کی طرف اشارہ ہے، یعنی فرشتوں کے اس سخت سلوک کی علت بیان ہو رہی ہے، اور وہ علت یہ ہے: '' اتَّبَعُوْا مَا اَسْخَطَ اللهَ ''یعنی یہ لوگ معصیتوں اور حرام شہوات میں منہمک ہو گئے تھے، ''وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهُ '' یعنی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والی چیزوں، مثلاً: ایمان اور اعمالِ صالحہ کو ناپسند کرتے تھے۔

۞ ۞ ۞

﴿ فَلَمَّا آسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ﴾ (الزخرف:۵۵)

ترجمہ: ''پس جب انہوں نے ہمیں ناراض کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا''

...... **شرح** ......

'' فَلَمَّا آسَفُوْنَا ''یعنی جب انہوں نے ہمیں غصہ دلا دیا'' انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ''تو ہم نے انہیں سزا دی۔ ''انتقام'' شدید ترین سزا دینے کو کہتے ہیں۔

﴿ وَلٰكِنْ كَرِهَ اللهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ ﴾ (التوبۃ:۴۶)

ترجمہ: ''لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا ناپسند جانا اس لئے انہیں بٹھا دیا''

...... **شرح** ......

''وَلٰكِنْ كَرِهَ اللهُ انْبِعَاثَهُمْ ''یعنی اللہ نے ان (منافقین) کے تمہارے ساتھ غزوہ میں جانے کو ناپسند جانا'' فَثَبَّطَهُمْ ''یعنی انہیں تمہارے ساتھ جانے سے روک دیا، اپنی قضاء وقدر

سے انہیں روک کر ذلیل وخوار کردیا، اگر چہ شرعاً انہیں ساتھ جانے کا حکم تھا، اور حسی طور پر انہیں ساتھ جانے کی قدرت بھی دے رکھی تھی، لیکن اپنی حکمت جو اس کے علم میں تھی کے پیشِ نظر انہیں ساتھ جانے کی توفیق نہیں دی۔ اس حکمت کو اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں بیان فرما دیا:

﴿ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَازَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا ﴾

ترجمہ: ''اگر یہ تم میں مل کر نکلتے بھی تو تمہارے لئے سوائے فساد کے اور کوئی چیز نہ بڑھاتے''

﴿ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ (الصف:۳)

ترجمہ: ''اللہ کے ہاں بڑی ناراضگی کی بات ہے کہ تم وہ بات کہو جس پر تمہارا عمل نہیں''

...... **شرح** ......

''كَبُرَ مَقْتًا'' یہ بات اللہ کو بہت ناراض کرنے والی ہے، ''اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ'' یعنی تم کسی نیکی کا عزم کرو پھر پورا نہ کرو، اس آیت کے شانِ نزول میں آیا ہے کہ فرضیتِ جہاد سے قبل اہلِ ایمان میں سے کچھ لوگ کہتے تھے کاش اللہ ہمیں احب الاعمال (سب سے بہترین عمل) کی خبر دے تا کہ ہم اس پر عمل کریں، تو اللہ نے نبی ﷺ کو آگاہ کیا کہ احب الاعمال، اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا ایمان لانا ہے جو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہو، نیز ایسے نافرمانوں کے ساتھ جو ایمان کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں اور اقرار نہ کرنے کی روش پر قائم ہیں، کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔ جب جہاد کا یہ حکم نازل ہوا تو بعض مسلمانوں پر یہ حکم ناگوار اور شاق گزرا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ان آیات کو ذکر کرنے کا مقصد

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفات: الغضب (غصہ کرنا) الرضا (راضی ہونا) اللعن (لعنت فرمانا) الانتقام (بدلہ لینا) الکراھیة (ناپسند جاننا) الأسف (ناراض ہونا) المقت (ناراض

ہونا) ذکر ہوئی ہیں، یہ سب صفاتِ افعال ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اور جیسے چاہتا ہے ان افعال کو رونما کرتا ہے۔ اہلِ سنت ان تمام صفات وافعال کو اللہ تعالیٰ کیلئے جیسے اس کی عظمت وجلالت کے لائق ہے ثابت مانتے ہیں۔

[۹] ذکر مجیء اللہ سبحانہ لفصل القضاء بین عبادہ علی ما یلیق بجلالہ

صفتِ مجیٔ کا بیان

یعنی قیامت کے دن بندوں کا حساب لینے کیلئے اللہ تعالیٰ کے آنے کا بیان ایسا آنا جو اس کی شان کے لائق ہے۔

قولہ: ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ ﴾ (البقرۃ:۲۱۰) وقولہ: ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ ﴾ (الانعام:۱۵۸) وقولہ: ﴿ كَلَّا اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا . وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴾ (الفجر:۲۱) وقولہ: ﴿ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلَائِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴾ (الفرقان:۲۵)

۞ ۞ ۞

ان آیات کی تشریح

﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ ﴾ (البقرۃ:۲۱۰)

ترجمہ: ’’کیا لوگوں کو اس بات کا انتظار ہے کہ ان کے پاس خود اللہ تعالیٰ ابر کے سائبانوں میں آجائے اور فرشتے بھی اور کام کو انتہاء تک پہنچا دیا جائے‘‘

...... **شرح** ......

’’يَنْظُرُوْنَ‘‘ بمعنی ینتظرون ہے، یہ کفار کیلئے تہدید (ڈانٹ ڈپٹ) ہے جنہوں نے

اسلام قبول کرنے کی بجائے شیطان کی راہ اپنائی ہوئی ہے۔ ’’اِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ بذاتِ خود قیامت کے دن بندوں کے حساب کیلئے آجائے اور ہر عامل کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے۔ ’’فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ‘‘ ظلل، ظُل کی جمع ہے، جس سے مراد ہر سایہ کرنے والی چیز ہے۔ اور ’’الغمام‘‘ سفید اور باریک بادلوں کو کہتے ہیں۔ ’’غمام‘‘ ڈھانپنے والی چیز کو کہتے ہیں کیوں کہ بادل بھی اپنی نیچے والی چیزوں کو ڈھانپ لیتے ہیں اس لیئے بادلوں کو غمام کہا جاتا ہے، ’’الْمَلَائِكَةُ‘‘ یعنی فرشتے بھی بادلوں کے سائبانوں میں آئیں گے۔

’’وَقُضِيَ الْأَمْرُ‘‘ یعنی کفار کی ہلاکت کا فیصلہ کر کے معاملے کو لپٹا دیا جائے۔

۞ ۞ ۞

﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ ﴾ (الانعام:۱۵۸)

ترجمہ: ’’کیا یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہے کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا ان کے پاس آپ کا رب آئے یا آپ کے رب کی کوئی بڑی نشانی آئے‘‘

...... **شرح** ......

’’هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ‘‘ یعنی فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کیلئے آئیں۔ ’’أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ‘‘ یعنی، یا اللہ تعالیٰ بذاتِ خود ان کے درمیان فیصلے کرنے آئے۔ ’’أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ‘‘ یہاں نشانی سے مراد طلوع الشمس من المغرب (سورج کا مغرب سے طلوع ہونا) ہے، یہ نشانی قیامت کی بڑی علامات میں سے ہے، جب یہ علامت ظاہر ہو جائے گی تو توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا، پھر کسی کی بھی توبہ قبول نہ کی جائے گی۔

۞ ۞ ۞

﴿ كَلَّا اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا . وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴾

ترجمہ:'' یقیناً جس وقت زمین کوٹ کوٹ کر برابر کردی جائے گی ، اور تیرا رب خود آجائے گا اور فرشتے صفیں باندھ کر (آجائیں گے)'' (الفجر:۲۱)

...... **شرح** ......

''کَلَّا '' کلمہ زجر وتوبیخ ہے، جس سے ماقبل ذکر کیئے گئے کسی جرم پر زجر وتوبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں جن باتوں پر ڈانٹنا مقصود ہے وہ یتیم کا عدمِ اکرام، مسکین کو کھانا کھلانے کی عدمِ ترغیب، وراثت کا مال کھا جانا اور ورثاء کو ان کے حق سے محروم کردینا اور مال سے شدید ترین محبت کرنا ہے۔

''اِذَا دُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا ''یعنی جب زمین کو بار بار اور مسلسل حرکت دی جائے گی حتی کہ زمین پر قائم تمام عمارتیں و پہاڑ وغیرہ منہدم ہوجائیں گے، اور ہر چیز روئی کے ذرات کی طرح اڑتی پھرے گی۔ ''وَجَاءَ رَبُّکَ ''یعنی اللہ تعالیٰ بذاتِ خود بندوں کے درمیان فیصلے کرنے کیلئے آجائے گا''وَالْمَلَکُ ''جنس ملائکہ مراد ہے، (یعنی فرشتے بھی آجائیں گے) ''صَفًّا صَفًّا ''یعنی فرشتے صفیں بنا کر انسانوں اور جنوں کو گھیرے میں لئے ہوئے ہوں گے، ہر آسمان کے فرشتوں کی ایک صف ہوگی، اس طرح کل سات صفیں ہوگی جو زمین اور اس کے تمام باشندوں کا احاطہ کئے ہونگی۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلَائِكَةُ تَنْزِيلًا ﴾ (الفرقان:۲۵)

ترجمہ:'' اور جس دن آسمان (نور کے) بادلوں سے پھٹ جائیگا اور فرشتے لگا تار اتارے جائیں گے''

...... **شرح** ......

اس سے قیامت کا دن مراد ہے، یعنی قیامت کے دن آسمان پھٹ جائیں گے۔''بِالْغَمَامِ''

یہاں غمام سے نورِ عظیم، جو آنکھوں کو چکا چوند کردینے والا ہے کے سائے مراد ہے (جس کی تاب نہ لانے کی وجہ سے آسمان پھٹ جائیں گے) ''وَنُزِّلَ الْمَلائِکَۃُ تَنْزِیْلاً ''یعنی فرشتوں کو زمین کی طرف اتارا جائیگا، اور وہ اس مقام پر تمام مخلوقات کو گھیر لینگے جہاں حشر بپا ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ بندوں میں فیصلے کیلئے آئے گا۔

ان آیات کو ذکر کرنے کا مقصد

ان آیات سے قیامت کے دن بندوں میں فیصلے کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کے آنے کا اثبات ہورہا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بذاتہ، جیسے اس کی عظمت وجلالت کے لائق ہے آئے گا، تاکہ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے۔ مجی واتیان (آنا) اللہ تعالیٰ کی صفاتِ فعلیہ میں سے ہیں، انہیں ان کی اصل حقیقت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت کرنا واجب ہے۔ ان صفات میں نفاۃِ صفات (اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرنے والوں) مثلاً: جہمیہ وغیرہ کی طرح جائز نہیں ہے، وہ لوگ صفتِ مجی واتیان سے مراد، اللہ تعالیٰ کا بذاتہ آنا نہیں مانتے بلکہ اللہ تعالیٰ کا امر آنا مراد لیتے ہیں۔ یہ لوگ قولہ تعالیٰ: ''جاءَ رَبُّکَ '' کی تفسیر ''جاءَ امرُ رَبِّکَ ''(تیرے رب کا امر آئے گا) سے کرتے ہیں۔ یہ تاویل بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی آیت میں کھلم کھلا تحریف بھی۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں اتیان اور مجی (آنا) جب اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہوں، تو اس کی دو نوع ہیں: مطلق ومقید

نوع اول :اگر مجی واتیان سے مراد رحمت وعذاب کا آنا ہو تو اتیان ومجی رحمت وعذاب سے مقید ہوگا، جیسا کہ اس حدیث میں ہے:

[حتی جاء الله بالرحمة والخير] ترجمہ:[حتی کہ اللہ کی رحمت وخیر آگئی]

اور یہ آیت:﴿ وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلٰى عِلْمٍ ﴾ (الاعراف:۵۲)

ترجمہ:''اور ہم نے ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب پہنچادی ہے جس کو ہم نے اپنے کامل

علم سے بہت واضح کر کے بیان کر دیا ہے"

نوع ثانی: اگر اتیان ومجی مطلق مذکور ہو تو اس وقت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا آنا مراد ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ ﴾ (البقرۃ:۲۱۰)

اور اللہ کا فرمان: ﴿ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴾ (الفجر:۲۱)

[۱۰] اثبات الوجه لله سبحانه

اللہ تعالیٰ کیلئے "الوجہ" (چہرہ) کا اثبات

وقوله: ﴿ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ﴾ (الرحمٰن:۲۷)

﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ﴾ (القصص:۸۸)

❁ ❁ ❁

ان آیات کی تشریح

﴿ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ﴾ (الرحمٰن:۲۷)

ترجمہ: "اور تیرے رب کا چہرہ جو عزت وعظمت والا ہے باقی رہ جائے گا"

...... **شرح** ......

" وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ " اس سے پہلے ہے ﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴾ اب معنی یہ ہوگا: کہ جمیع اہل الارض ختم ہو جائیں، مر جائیں گے، صرف اللہ تعالیٰ کا وجہ کریم باقی رہ جائے گا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ پر موت نہیں آئے گی وہ تو ہمیشہ رہنے والی ذات ہے،" ذُو الْجَلَالِ " جلال، عظمت وکبریائی کو کہتے ہیں،" وَالْاِكْرَامِ "یعنی اپنے انبیاء اور دیگر نیک لوگوں کو عزت بخشنے والا،" وَالْاِكْرَامِ "میں ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ ہر ایسی چیز سے پاک ہے جو اس کے شایانِ شان نہیں۔

❁ ❁ ❁

﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ﴾ (القصص:۸۸)

ترجمہ: (ہر چیز فنا ہونے والی ہے مگر اس کا چہرہ)

...... **شرح** ......

" كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ "یعنی آسمان وزمین میں بسنے والے سب کے سب عنقریب ختم

ہونے والے اور مرنے والے ہیں، "اِلَّا وَجْهَهُ" یہ استثناء کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہاں یہ خبر دینا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ قائم اور باقی رہنے والا ہے، تمام مخلوقات پر موت آجائے گی لیکن اللہ تعالیٰ پر موت نہیں آئے گی۔

ان آیات کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد: ان آیات میں اللہ تعالیٰ کیلئے **صفتِ الوجہ** (چہرہ) کا اثبات ہے۔ "الوجہ" اللہ کی صفاتِ ذاتیہ میں سے ہے، جو کہ اپنے حقیقی معنی، جو اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت کے لائق ہے، پر قائم ہے۔ ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ﴾

منکرینِ صفات "الوجہ" کو مبنی برحقیقت تسلیم نہیں کرتے، وہ "الوجہ" کا معنی ذات، ثواب یا جہت وغیرہ سے کرتے ہیں، یہ تمام تاویلات درج ذیل وجوہ کی بناء پر باطل ہیں:

(۱) "الوجہ" کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر عطف نصاً ثابت ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: [اعوذ باللہ العظیم وبوجھہ الکریم] اور عطف مغایرت چاہتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے "الوجہ" کی اضافت ذات کی طرف کی ہے، چنانچہ فرمایا: "وَجْهُ رَبِّكَ" نیز "الوجہ" کی صفت بھی ذکر فرمائی ہے، چنانچہ فرمایا: "ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ" اگر "الوجہ" سے مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہے جو لفظ "الوجہ" آیت میں صلہ ہوتا، ورنہ "ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ" کی بجائے "ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ" ہوتا، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے "ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ" فرمایا ہے، تو ثابت ہوا کہ یہ "الوجہ" کی صفت ہے نہ کہ ذات کی، اور یہ بھی ثابت ہوا کہ "الوجہ" اللہ تعالیٰ کی ذات کی صفت ہے۔

(۳) دنیا کی کسی بھی لغت میں یہ بات نہیں کہ "وجہ الشیء" بمعنی ذات یا ثواب کے ہو۔ الوجہ لغت میں ہر چیز کے آگے والے حصے کو کہتے ہیں کیونکہ سب سے پہلے اسی کی مواجہت (سامنا) ہوتی ہے۔ ہر چیز کا "وجہ" اس کے مضاف الیہ کے اعتبار سے ہے۔

[۱۱] اثبات الیدین للہ تعالیٰ فی القرآنِ الکریم

قرآنِ کریم سے اللہ تعالیٰ کیلئے "یدان" (دو ہاتھوں) کا اثبات

وقولہ: ﴿ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ﴾ (ص:۷۵)

وقولہ ﴿ وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ﴾ (المائدۃ:۶۴)

۞ ۞ ۞

ان آیات کی تشریح

﴿ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ﴾ (ص:۷۵)

"تجھے اسے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا، جسے میں نے اپنے دو ہاتھوں سے پیدا کیا"

......**شرح**......

یہ خطاب ابلیسِ لعین سے ہے، جب اسے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے انکار کر دیا۔ یعنی کس چیز نے تمہیں سجدہ کرنے سے روک دیا۔ "لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ" جسے میں نے واقعتاً بغیر کسی واسطے کے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔ اس میں آدم علیہ السلام کیلئے بڑے شرف وتکریم کا پہلو ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ﴾ (المائدۃ:۶۴)

ترجمہ "اور یہودیوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ انہی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، اور ان کے اس قول کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے

تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔''

شرح

''اَلْیَھُوْدُ'' یہودیوں کے قول '' ھُدْ نَا اِلَیْکَ '' سے ماخوذ ہے، یہ اسمِ مدح تھا، اُن کی شریعت کے منسوخ ہونے کے بعد یہ نام ان کیلئے مختص ہوگیا، اب اس نام میں کوئی مدح کا پہلو نہیں ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہودا بن یعقوب کی طرف نسبت کی وجہ سے انہیں الیھود کہا جاتا ہے۔'' یَدُاللہ مَغْلُوْلَۃٌ 'یہودیوں کے متعلق بتلایا جا رہا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو بخیل کہا، جس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کو فقیر اور اپنے آپ کو غنی کہا۔ ان کے اس قول کا مطلب یہ نہیں کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ''غُلَّتْ اَیْدِیْھِمْ '' یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہودیوں کی اس بات کا رد ہے، ان کے جھوٹ وافتراء کے بدلے میں انہیں یہ سزا ملی ہے۔ آج فی الواقع صورتِ حال بھی یہی ہے، سب سے زیادہ بخل وحسد یہودیوں میں ہی پایا جاتا ہے۔ آپ کسی بھی یہودی سے ملیں اسے سب سے بڑا بخیل اور حاسد پائیں گے۔ ''وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا'' اس کا عطف ماقبل پر ہے، اور اس میں باء سببیہ ہے۔ یعنی انہیں ان کی اس غلط بات کے سبب سے اللہ کی رحمت سے دور کر دیا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا مزید رد کرتے ہوئے کہا: ''بَلْ یَدَاہُ مَبْسُوطَتَانِ ''یعنی اللہ تعالیٰ تو انتہائی سخی ہے، اس کے دونوں ہاتھ انتہائی سخاوت کرنے کی وجہ سے کھلے ہوئے ہیں۔

''یُنْفِقُ کَیْفَ یَشَاءُ ''جملہ مستأنفہ ہے، اس کی کمالِ سخاوت کی مزید تاکید کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا انفاق اس کی مشیئت کے اقتضاء کے مطابق ہوتا ہے، اپنی مشیت سے جس پر چاہتا ہے وسعت فرما دیتا ہے، جس پر چاہتا ہے تنگی کر دیتا ہے، وہ اپنی حکمت کے اقتضاء کے مطابق ''الباسط'' بھی ہے اور ''القابض'' بھی۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کیلئے ''یدان'' (دو ہاتھوں) کا اثبات ہے۔ اور یہ دونوں ہاتھ حقیقی

ہیں بلکل ویسے جیسے اس کی عظمت وجلالت کے لائق ہیں، مخلوق کے ہاتھوں کی طرح نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ﴾ اور اس سے ان لوگوں کا بھی رد ہو رہا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کے حقیقی ہونے کی نفی کرتے ہیں، ان حضرات کا زعمِ باطل یہ ہے کہ ''ید'' سے مراد قدرت یا نعمت ہے۔ لیکن یہ تاویل باطل بلکہ تحریف للقرآن ہے۔

''ید'' (ہاتھ) سے مراد ید ذات ہے، ید قدرت یا نعمت نہیں، اس لئے کہ ''ید'' سے مراد ید قدرت ہو تو یدین (دو ہاتھ) سے تخلیق آدم کی تخصیص ہی باطل ہو جاتی ہے، کیونکہ تمام مخلوقات حتی کہ ابلیس کی تخلیق بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوئی ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ﴾ میں آدم کو ابلیس پر کون سی فضیلت حاصل ہے، کیونکہ اگر ید سے مراد قدرت ہو تو ابلیس بھی کہہ سکتا تھا ''وانا خلقتنی بیدیک'' کہ مجھے بھی تو، تو نے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے۔ نیز اگر ید سے مراد قدرت ہو تو اللہ تعالیٰ کیلئے دو قدرتیں لازم آتی ہے، حالانکہ اس کے بطلان پر مسلمانوں کا اجماع ثابت ہے۔ نیز اگر ید سے مراد نعمت ہو تو معنی ہوگا ''اللہ تعالیٰ نے آدم کو دو نعمتوں سے پیدا کیا'' یہ بات بھی باطل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں صرف دو نہیں بلکہ بہت ہیں، اتنی کہ احاطۂ شمار میں بھی نہیں آسکتیں۔

[۱۲] اثبات العینین للہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کیلئے دو آنکھوں کا اثبات

وقوله : ﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ﴾ (الطور:۴۸)

وقوله : ﴿ وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ . تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا جَزَاءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴾ (القمر:۱۳،۱۴)

وقوله: ﴿ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي ﴾ (طٰہٰ:۳۹)

❁ ❁ ❁

ان آیات کی تشریح

﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ﴾ (الطور:۴۸)

ترجمہ ”تو اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر سے کام لے، بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے“

...... **شرح** ......

صبر کا لغوی معنی روکنا ہے۔ اس مناسبت سے اصطلاحی معنی یہ ہوگا: اپنے نفس کو جزع فزع سے روک لینا، اور اپنی زبان کو شکوہ شکایت اور اظہارِ ناراضگی وغصہ سے روک لینا، اور اپنے اعضاء کو رخسار پیٹنے اور دامن پھاڑنے سے روک لینا۔ ”لِحُكْمِ رَبِّكَ“ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مراد اللہ تعالیٰ کا کونی وشرعی فیصلہ اور حکم ہے۔ (حکمِ کونی سے مراد مخلوقات کے تعلق سے تقدیر میں لکھے ہوئے اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور حکمِ شرعی سے مراد قرآن وحدیث پر مبنی اللہ تعالیٰ کے شرعی فیصلے ہیں) ”فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا“ یعنی آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ہماری حفاظت اور نگرانی میں ہیں، لہٰذا کفار کی ایذاء رسانی کی پروانہ کریں کیونکہ وہ آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

﴿ وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ . تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا جَزَاءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴾ (القمر:۱۳،۱۴)

ترجمہ ”اور ہم نے اسے تختوں اور کیلوں والی (کشتی) پر سوار کرلیا، جو ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی، بدلہ ہے اس کی طرف سے جس کا کفر کیا گیا تھا“

...... **شرح** ......

”وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ“ یعنی ہم نے نوح علیہ السلام کو ایسی کشتی پر سوار کیا جو چوڑے چوڑے تختوں سے بنی ہوئی تھی، اور کیلوں سے ان تختوں کو باہم باندھ دیا گیا تھا۔ ”دُسُرٌ“ جمع ہے جس کا واحد ”دسار“ ہے۔ ”تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا“ یعنی وہ کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے، ہماری حفاظت میں چل رہی تھی۔ ”جَزَاءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ“ اس کا معنی یہ ہے کہ ہمارا نوح علیہ السلام اور انکے ساتھیوں کو نجات دینا اور باقی پوری قوم کو غرق کردینا، بدلہ اور ثواب ہے اس کفر وجحود کا جس کا قومِ نوح نے ارتکاب کیا۔ ”لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ“ سے مراد نوح علیہ السلام ہیں۔

❁ ❁ ❁

﴿ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي ﴾ (طٰہٰ:۳۹)

ترجمہ ”اور میں نے اپنی طرف کی خاص محبت ومقبولیت تجھ پر ڈال دی، تاکہ تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے کی جائے“

...... **شرح** ......

”وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي“ یہ خطاب موسیٰ علیہ السلام سے ہے، یعنی میں نے تجھ پر اپنی محبت ڈال دی، چنانچہ میں بھی تجھ سے محبت کرتا ہوں اور اپنی مخلوق کا بھی تجھے محبوب بنادیا ہے۔“ ”وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي“ تاکہ میرے سامنے تیری پرورش کی جائے، میں تجھے دیکھتا رہوں اور تیری حفاظت کرتا رہوں۔

ان آیات کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کیلئے "عینین" (دو آنکھوں) کا اثبات ہے، جو اپنے حقیقی معنی میں قائم ہیں اور بالکل ایسی ہیں جیسی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شان وعظمت کے لائق ہیں۔

قرآن میں لفظِ "عین" کی اللہ تعالیٰ کی طرف بصیغۂ مفرد (العین) اور بصیغۂ جمع (اعین) جبکہ حدیثِ رسول ﷺ میں اللہ تعالیٰ کی طرف مثنیٰ اضافت مذکور ہیں۔ اور نبی ﷺ کا یہ فرمان بھی موجود ہے: [ان ربکم لیس بأعور] یعنی [تمہارا رب کانا نہیں ہے۔] (متفق علیہ)

اور یہ حدیث اس معنی میں صریح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت صرف ایک آنکھ کا اثبات نہیں، کیونکہ ایک آنکھ ہونا تو ظاہراً کانا پن ہے، جس سے اللہ تعالیٰ پاک ہے۔

لغتِ عرب میں مضاف مفرد، تثنیہ، اور جمع بحسبِ احوالِ مضاف الیہ مستعمل ہوا ہے، لہذا اگر واحد کو مفرد کی طرف مضاف کرنا ہو تو مضاف کو مفرد لاتے ہے، اور اگر مضاف الیہ جمع ہو چاہے اسم ظاہر ہو یا اسم ضمیر، تو احسن بات یہ ہے کہ مضاعف کو بھی جمع لایا جائے، تا کہ لفظی مشاکلت پیدا ہو جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: "تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا" یا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَھُمْ مِمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَا اَنْعَامًا ﴾ اور اگر اسمِ مثنیٰ کی طرف اضافت کرنی ہو تو لغتِ عرب میں افصح بات یہ ہے کہ مضاف کا جمع لایا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا ﴾ (یقیناً تمہارے دل جھک پڑے ہیں) یہاں قلوب بصیغہ جمع مذکور ہے حالانکہ یہاں دو دلوں کا ذکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص یوں کہے: "نراک باعیننا ونأخذک بایدینا" (ہم تجھے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور تجھے اپنے ہاتھوں سے پکڑیں گے) تو یہاں اگرچہ "اعین" بصیغہ جمع مذکور ہے لیکن سامع کسی قسم کے التباس میں نہیں پڑتا اور نہ ہی روئے زمین کا کوئی بشر اس جملہ سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہی چہرے پر بہت ساری آنکھیں ہوتی ہیں۔ (واللہ اعلم)

[۱۳] اثبات السمع والبصر للہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کیلئے سمع (سننا) وبصر (دیکھنا) کا اثبات

وقولہ: ﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُکَ فِیْ زَوْجِھَا وَتَشْتَکِیْ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَکُمَا اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ ﴾ (المجادلۃ:۱)

وقولہ: ﴿ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَنَحْنُ اَغْنِیَاءُ ﴾ (آل عمران:۱۸۱)

وقولہ: ﴿ اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّھُمْ وَنَجْوَاھُمْ بَلٰی وَرُسُلُنَا لَدَیْھِمْ یَکْتُبُوْنَ ﴾ (الزخرف:۸۰)

وقولہ: ﴿ اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی ﴾ (طہ:۴۶)

وقولہ: ﴿ اَلَمْ یَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ یَرٰی ﴾ (العلق:۱۴)

وقولہ: ﴿ اَلَّذِیْ یَرَاکَ حِیْنَ تَقُوْمُ. وَتَقَلُّبَکَ فِی السَّاجِدِیْنَ. اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴾ (الشعراء:۲۱۸تا۲۲۰)

وقولہ: ﴿ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُہٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ (التوبۃ:۱۰۵)

۞ ۞ ۞

ان آیات کی تشریح

﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُکَ فِیْ زَوْجِھَا وَتَشْتَکِیْ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَکُمَا اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ ﴾ (المجادلۃ:۱)

ترجمہ: "یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سنی جو تجھ سے اپنے شوہر کے بارے

میں تکرار کر رہی تھی اور اور اللہ کے آگے شکایت کر رہی تھی ، اللہ تعالیٰ تم دونوں کے سوال وجواب سن رہا تھا بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے‘‘

شرح

اس عورت کا نام خولہ بنت ثعلبۃ تھا، ’’تُجَادِلُکَ‘‘ یعنی اے پیغمبر وہ آپ سے تکرار کر رہی تھی اپنے شوہر کے بارے میں، اس کے شوہر کا نام اوس بن صامت تھا، تکرار کرنے کا یہ واقعہ اس وقت رونما ہوا جب اس کے شوہر نے اس سے ظہار کر لیا تھا۔ ’’وَتَشْتَكِي إِلَى اللهِ‘‘ اس جملہ کا عطف ’’تُجَادِلُکَ‘‘ پر ہے، کیونکہ کیفیت یہ تھی کہ آپ ﷺ اسے فرماتے کہ تو اپنے خاوند پر حرام ہوگئی ہے اور وہ کہتی: اللہ کی قسم اس نے لفظِ طلاق نہیں کہا، پھر کہنے لگی: میں اللہ کی طرف اپنے فقر و فاقے اور اپنی تنہائی کی شکایت کرتی ہوں، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اگر انہیں اپنے شوہر کے سپرد کرتی ہوں تو ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے، اور اگر انہیں اپنے پاس رکھتی ہوں تو میرے پاس انہیں کھلانے کیلئے کچھ نہیں، اور بار بار اپنا سر آسمان کی طرف اٹھاتی اور کہتی: ’’اللھم انی أشکو الیک‘‘ (اے اللہ میں تیری طرف اپنی شکایت کرتی ہو)۔

’’وَاللهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا‘‘ یعنی تم دونوں کی تکرار، سوال وجواب اللہ تعالیٰ سن رہا تھا ’’إِنَّ اللهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ تمام آوازوں کو سنتا ہے اور تمام مخلوقات کو دیکھتا ہے، اور منجملہ ان آوازوں اور مخلوقات کے اس عورت کا آپ ﷺ سے مجادلہ و مکالمہ بھی ہے۔

❁ ❁ ❁

﴿ لَقَدْ سَمِعَ اللهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ ﴾

ترجمہ: ’’یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا قول بھی سنا جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم تونگر ہیں‘‘ (آل عمران:۱۸۱)

❁ ❁ ❁

شرح

یہ یہودیوں میں سے بعض لوگوں کا قول ہے، جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ (البقرۃ:۲۴۵)

ترجمہ: ’’کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے‘‘ تو بعض یہودیوں نے اپنے نچلے طبقے کو اسلام سے برگشتہ کرنے اور ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنے کیلئے یہ بات کہی تھی وگرنہ اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے یہ ان کا اعتقاد نہ تھا۔

❁ ❁ ❁

﴿ أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ بَلَى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ ﴾ (الزخرف:۸۰)

ترجمہ: ’’کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ہم ان کی پوشیدہ باتوں کو اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سنتے، بلکہ ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں‘‘

شرح

’’أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ‘‘ یعنی جو باتیں اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں یا آپس میں چھپ کر جو باتیں کرتے ہیں، ’’وَنَجْوَاهُمْ‘‘ یعنی آپس میں جو سرگوشیاں کرتے ہیں، ’’نَجْوَى‘‘ ان باتوں کو کہتے ہیں جو کوئی شخص اپنے دوست سے دوسرے سے چھپا کر کرتا ہے‘‘ بَلَى ’’کیوں نہیں ہم ان باتوں کو سنتے ہیں اور جانتے ہیں، ’’وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ‘‘ یعنی ہمارے نگران فرشتے جو ان کے پاس ہوتے ہیں وہ ان سے صادر ہونے والے ہر قول و فعل کو لکھ لیتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

﴿ إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَى ﴾ (طٰہٰ:۴۶)

ترجمہ: ''میں تمہارے ساتھ ہوں، سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں''

...... **شرح** ......

'' اِنَّنِیْ مَعَکُمَا '' یہ اللہ تعالیٰ قول ہے جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ وہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تھا تو اس وقت یہ فرمایا تھا، معنی یہ ہے کہ تم دونوں میری حفاظت اور نگرانی میں ہو اور میری مدد تمہیں حاصل ہوگی۔ '' أَسْمَعُ وَأَرٰی '' یعنی میں تمہاری اور تمہارے دشمن کی باتوں کو سنوں گا اور تمہارے دشمن کی جگہ کو دیکھوں گا اور تمہارے اور تمہارے دشمن کے درمیان جو بھی معاملہ ہوگا میں اسے سنوں گا اور دیکھوں گا......اور یہ علت ہے اللہ کے قول '' لاتخافا '' '' تم دونوں نہ ڈرو'' کی۔

۞ ۞ ۞

﴿ أَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴾ (العلق:۱۴)

ترجمہ: ''کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ تعالیٰ اسے خوب دیکھ رہا ہے''

...... **شرح** ......

'' أَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ يَرٰى '' ابوجہل سے کہا جا رہا ہے جب اس نے نبی ﷺ کو نماز پڑھنے سے روک دیا تھا یعنی کیا اسے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے اور اس کی بات سن رہا ہے، اور عنقریب اسے اسکے اس فعل کی پوری پوری سزا دے گا۔ یہاں استفہام زجر وتوبیخ کیلئے ہے۔

۞ ۞ ۞

نیز فرمایا: ﴿ اَلَّذِیْ یَرٰکَ حِیْنَ تَقُوْمُ. وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ. اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴾ (الشعراء:۲۱۸تا۲۲۰)

ترجمہ: ''جو تجھے دیکھتا ہے جب تو کھڑا ہوتا ہے اور سجدہ کرنے والوں کے درمیان تیرا گھومنا پھرنا بھی، وہ بڑا ہی سننے والا اور خوب جاننے والا ہے''

...... **شرح** ......

'' اَلَّذِیْنَ یَرٰکَ حِیْنَ تَقُوْمُ '' یعنی آپ کو جب آپ تنہا نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں وہ دیکھتا ہے۔ '' وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ '' یعنی اگر آپ نماز باجماعت پڑھیں تو وہ آپ کو رکوع، سجدہ اور قیام کی حالت میں دیکھتا ہے۔ '' اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ '' آپ جو کہتے ہیں وہ اسے سنتا بھی ہے اور اسے جانتا بھی ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰهُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ (التوبۃ:۱۰۵)

ترجمہ: ''کہہ دیجئے کہ تم عمل کیئے جاؤ تمہارے عمل خود اللہ دیکھ لے گا اور اس کا رسول اور ایمان والے بھی''

...... **شرح** ......

'' وَقُلِ اعْمَلُوْا '' یعنی اے محمد ﷺ آپ ان منافقین سے کہہ دیں کہ تم جو چاہو کرو اور بھلے اپنے باطل اعمال پر جمے رہو لیکن یہ نہ سمجھو کہ تمہارے یہ اعمال مخفی ہی رہیں گے '' فَسَیَرَی اللّٰهُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ '' یعنی عنقریب تمہارے یہ اعمال دنیا میں ہی لوگوں پر ظاہر ہو جائیں گے '' وَسَتُرَدُّوْنَ '' یعنی موت کے بعد تم لوٹا دیئے جاؤ گے ﴿ عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ ایسی ذات کی طرف جو ظاہر و پوشیدہ سب کو جانتا ہے، اور وہ تمہیں تمہارے اعمال سے آگاہ کر کے تمہیں اس کی جزا دے گا۔

ان آیات کو ذکر کرنے کا مقصد

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ سمع (سننا) اور صفتِ بصر (دیکھنا) کا بیان ہوا ہے، لہذا اللہ تعالیٰ سنتا اور دیکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کا سننا اور دیکھنا اپنے حقیقی معنی پر قائم ہے، بلکل ایسا جیسے اس کی عظمت وجلالت کے لائق ہے، اللہ رب العزت مخلوقات کی صفات سے مشابہت اور مماثلت سے

پاک ہے۔ یہ آیات اللہ تعالیٰ کیلئے سمع وبصر کے اثبات میں انتہائی صریح ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کیلئے صفت سمع کا اثبات لفظِ ماضی (سَمِعَ) مضارع (یَسْمَعُ) اور اسمِ فاعل (سَمِیْعٌ) کے صیغوں سے ثابت کیا گیا ہے۔

کلامِ عرب میں سمیع (سننے والا) وبصیر (دیکھنے والا) صرف اس چیز کو کہا جاتا ہے جو سنے اور دیکھے، یہی وجہ ہے کہ پہاڑ کو سمیع بصیر نہیں کہا جاتا کیوں کہ پہاڑ کیلئے سننا اور دیکھنا محال ہے۔

[۱۴] اثبات المکر والکید للہ تعالیٰ علی ما یلیق بہ

اللہ تعالیٰ کیلئے مکر وکید جیسا اس کی شایانِ شان ہے کا اثبات

وقولہ: ﴿ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ﴾ (الرعد:۱۳)

وقولہ: ﴿ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللهُ وَاللهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ﴾ (آل عمران:۵۴)

وقولہ: ﴿ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ (النمل:۵۰)

وقولہ: ﴿ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴾ (الطارق:۱۵،۱۶)

ان آیات کی تشریح

﴿ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ﴾ (الرعد:۱۳)

ترجمہ: ''اللہ سخت قوت والا ہے''

...... **شرح** ......

''وَھُوَ'' یعنی اللہ تعالیٰ ''شَدِیْدُ الْمِحَالِ'' ''المحل'' کا لغوی معنی ''الشدۃ'' ہے معنی ہوگا شدید اور زبردست مکر تدبیر والا۔ (لغت کے بہت بڑے امام) زجاج کا کہنا ہے: اہل لغت ''مَاحَلْتُہٗ مِحَالاً'' کہتے ہیں جس کا معنی یہ ہے: میں نے اس سے زور آزمائی کی حتی کہ واضح ہوگیا کہ زیادہ اور سخت طاقت ور کون ہے۔

ابن الأعرابی کہتے ہیں کہ ''المحال'' بمعنیٰ ''المکر'' ہے، آیت کا معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ شدید اور زبردست مکر وتدبیر کرنیوالا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے مکر کرنے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جو سزا اور تکلیف کا مستحق ہوتا ہے ایسے انداز وطریقے سے سزا اور تکلیف پہنچاتا ہے کہ اسے خبر تک نہیں ہوتی۔

﴿ وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللهُ وَاللهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ﴾ (آل عمران:۵۴)

ترجمہ: ''اور کافروں نے مکر کیا اللہ تعالیٰ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ سب خفیہ تدبیر کرنیوالوں سے بہتر ہے''

شرح

یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جن سے عیسیٰ علیہ السلام نے کفر اختیار کرنے کو محسوس کرلیا تھا، یہ کفار بنی اسرائیل ہیں جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور صلیب پر چڑھانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ ''مکر'' کا معنی ہے کوئی کام کرنا لیکن نیت کچھ اور ہو۔ ''وَمَكَرَ اللهُ'' یعنی اللہ نے انہیں ڈھیل دی اور انہیں ان کے مکر کی سزا دی، اسطرح کہ عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ کسی اور پر ڈال دی، اور عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھالیا۔ ''وَاللهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ'' یعنی اللہ تعالیٰ سب سے بڑھکر قدرت وطاقت رکھتا ہے کہ مستحق ضرر کو اسطرح ضرر پہنچائے کہ اس کے وہم وگمان اور علم میں نہ آسکے۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ (النمل:۵۰)

''انہوں نے بھی مکر کیا اور ہم نے بھی مکر کیا اور وہ (ہمارے مکر کو) سمجھتے ہی نہ تھے''

شرح

اس سے مراد صالح علیہ السلام کی قوم کے وہ کفار ہیں، جنہوں نے صالح علیہ السلام اور ان کے اہل کو قتل کی سازش کا باہم حلف اٹھایا اور صالح علیہ السلام کے اولیا کے ڈر کی وجہ سے اس منصوبے پر خفیہ طریقے سے عمل پیرا ہونے کی کوشش کی۔ ''وَمَكَرْنَا مَكْرًا'' ہم نے انہیں اس فعل کی جزا دی اسطرح کہ ہم نے ان کفار کو ہلاک کردیا اور اپنے نبی کو بچالیا۔ ''وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ'' انہیں ہمارے اس مکر کا شعور ہی نہیں ہوسکا۔

۞ ۞ ۞

﴿ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَأَكِيْدُ كَيْدًا ﴾ (الطارق:۱۵،۱۶)

ترجمہ: ''البتہ کافر داؤ گھات میں ہیں اور میں بھی ایک چال چل رہا ہوں''

شرح

''اِنَّهُمْ'' یعنی کفارِ قریش ''يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا'' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین حق کو غلط اور باطل ثابت کرنے کیلئے مکر کرتے ہیں۔ ''وَأَكِيْدُ كَيْدًا'' میں انہیں ڈھیل دیکر ان کے مکر وفریب کی انہیں سزا دیتا ہوں اور انہیں ان کی غفلت میں پکڑتا ہوں کہ انہیں شعور تک نہیں ہوتا۔

ان آیات کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ مکر وکید بیان ہوئی ہیں، مکر وکید کی نسبت اللہ کی طرف اپنے باب میں اپنی حقیقت پر قائم ہے؛ کیونکہ ''مکر'' کا معنی ہے کسی چیز کو کسی تک مخفی طور پر پہنچانا۔ کید، مکر اور مخادعت سب سے یہی مراد ہے۔

''کید'' کی دو قسمیں ہیں: قبیح، وحسن۔ قبیح یہ ہے کہ مکر وکید اس شخص تک پہنچانا جو اس کا مستحق نہیں ہے، جبکہ حسن یہ ہے کہ جو مکر وکید کے معاملے کا مستحق ہے اسے بطور سزا مکر وکید پہنچانا۔ کید کی پہلی قسم مذموم ہے جبکہ دوسری قسم ممدوح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا کید کیدِ محمود ہے اور مبنی بر عدل وحکمت ہے، اللہ تعالیٰ ظالم وفاجر کی اس طرح گرفت کرتا ہے کہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کا معاملہ ان ظالموں کی طرح نہیں جو لوگوں پر ظلم وستم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو کید، مکر اور خداع جیسی صفات سے اس لئے متصف فرمایا ہے کہ مخلوقات میں سے جو ناحق کید، مکر اور خداع کا ارتکاب کرے اسے اس کے جرم کے (بالمقابل) اسی طریقے سے بدلہ اور سزا سے ہمکنار فرمادے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ اس طریقے سے بدلہ اور سزا کا نظام اگر مخلوق قائم کرے تو انتہائی قابلِ تعریف ہے تو پھر اللہ رب العزت تو بالاولیٰ اس تعریف کا مستحق ہے۔

تنبیہ:

کید ومکراور اس قسم کے دیگر الفاظ کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت باعتبارِ فعل ہے (نا کہ باعتبارِ اسم) فعل، اسم کی بنسبت زیادہ وسعت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کیلئے کچھ افعال منسوب فرمائے ہیں لیکن ان افعال کے اسماءِ فاعل سے اپنا نام نہیں رکھا، جیسے ''اراد'' (اس نے ارادہ کیا) ''شاء'' (اس نے چاہا) یہ افعال اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہیں لیکن ان فعال کے اسماءِ فاعل ''المرید'' اور ''الشائی'' اللہ تعالیٰ موسوم نہیں۔اسی طرح افعال مَکَرَ، یَمْکُرُ، اَکِیْدُ وغیرہ افعال اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف منسوب ہیں لیکن ان کے اسماءِ فاعل ''الماکر'' اور ''الکائد'' اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں شامل نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اسماء کے جومسمیات یا معانی ہیں وہ ممدوح اور مذموم دونوں ہوسکتے ہیں۔(تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے اسم کی اضافت جائز نہیں جس میں کسی بھی طور مذموم معنی پایا جائے ،البتہ ان اسماء کے افعال میں سے جوفعل ممدوح ہے اس کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت جائز بھی ہے اور ثابت بھی۔)

[۱۵] وصف اللّٰہ بالعفو والمغفرۃ والرحمۃ والعزۃ والقدرۃ

اللہ تعالیٰ کا صفاتِ عفو، مغفرت، رحمت، غلبہ اور قدرت سے متصف ہونا

وقولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْتُخْفُوْهُ اَوْتَعْفُوْا عَنْ سُوْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴾ (النساء:۱۴۹)

وقولہ: ﴿ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (النور:۲۲)

وقولہ: ﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ ﴾ (المنافقون:۸)

وقولہ عن ابلیس: ﴿ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ (ص:۸۲)

ان آیات کی تشریح

﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْتُخْفُوْهُ اَوْتَعْفُوْا عَنْ سُوْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴾

ترجمہ: ''اگر تم کسی نیکی کو اعلانیہ کرو یا پوشیدہ، یا کسی برائی سے درگزر کرو، پس یقیناً اللہ تعالیٰ پوری معافی دینے والا اور پوری قدرت والا ہے'' (النساء:۱۴۹)

...... **شرح** ......

''اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا ''یعنی اگر تم نیکی کو ظاہر کردو۔ ''اَوْتُخْفُوْهُ'' یا اسے پوشیدہ کرکے کرو۔ ''اَوْتَعْفُوْا عَنْ سُوْءٍ ''یعنی جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تم اس سے درگزر کرو۔ ''فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا ''یعنی اللہ اپنے بندوں کو معاف کرنے والا اور ان سے درگزر کرنے والا ہے۔ ''قَدِيْرًا ''یعنی اللہ لوگوں سے ان کے اعمال کی وجہ سے انتقام لینے پر قدرت رکھتا ہے، تو اے لوگو قدرت کے باوجود معاف کرکے اس وصف میں تم اللہ کی اقتداء کرو۔

﴿ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴾

ترجمہ: ''انہیں چاہئے کہ معاف کریں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف فرمادے، اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا، مہربان ہے'' (النور:۲۲)

شرح

آیت کے شروع میں جن اولوالفضل والسعۃ (بزرگی اور کشادگی) والوں کا تذکرہ ہوا ہے انہیں کہا جا رہا ہے کہ پردہ پوشی، معافی اور درگزر سے کام لو، یعنی مجرموں سے اعراض ودرگزر کرو اور ان کے جرم سے چشم پوشی کرو۔ ''أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ'' کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف فرمائے بسبب اسکے کہ جو تمہارے ساتھ بُرا کریں تم انہیں معاف کرو اور درگزر کرو، ''وَاللَّهُ غَفُورٌ'' بہت زیادہ مغفرت کرنے والا ''رَحِيمٌ'' بہت زیادہ رحمت کرنیوالا ہے۔

﴿ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ ﴾ (المنافقون:۸)

ترجمہ: ''عزت تو صرف اللہ کیلئے اس کے رسول کیلئے اور اہلِ ایمان کیلئے ہے''

شرح

یہاں منافقین کا رد ہو رہا ہے جن کا زعم تھا کہ انہیں اہلِ ایمان پر عزت حاصل ہے ''الْعِزَّةُ'' قوت اور غلبہ کو کہتے ہیں، اور یہ صرف اللہ کیلئے ہے یا پھر رسولوں اور نیک بندوں میں سے جس کیلئے اللہ چاہے ان کے علاوہ کسی کیلئے عزت نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ابلیس کا قول ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴾ (ص:۸۲)

ترجمہ: ''تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو یقیناً بہکا دوں گا''

شرح

اللہ تعالیٰ نے ابلیس کا قول ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''فَبِعِزَّتِكَ'' ابلیس نے اللہ کی عزت کی قسم کھائی۔ ''لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ'' یعنی میں اولادِ آدم کو ان پر ان کی خواہشات نفس کو مزین کرکے اور ان پر شبہات وارد کرکے گمراہ کروں گا حتی کہ سب کے سب گمراہ ہو جائیں گے، پھر جب ابلیس نے یہ بات جان لی کہ میرا مکر وفریب تو صرف کافروں اور اہلِ معصیت میں سے جو میرے پیروکار رہوں گے ان پر چل سکے گا تو فوراً استثناء کرتے ہوئے کہا: ﴿ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴾ مگر تیرے مخلص بندے (یعنی انہیں گمراہ نہیں کرسکوں گا)

ان آیات کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے اوصاف: العفو، القدرۃ، المغفرۃ، الرحمۃ اور العزۃ کا ذکر ہے، یہ تمام صفاتِ کمال اللہ تعالیٰ کیلئے اس کی شایانِ شان ثابت ہیں۔

[۱۶] اثبات الاسم للہ ونفی المثل عنہ

اللہ تعالیٰ کیلئے اسم (نام) کا اثبات اور اس کے مثل کی نفی

وقولہ: ﴿ تَبَارَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلَالِ وَالْإِکْرَامِ ﴾ (الرحمٰن:۷۸)

وقولہ: ﴿ فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ﴾ (مریم:۶۵) ﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ﴾ (الاخلاص:۴) ﴿ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾ (البقرۃ:۲۲) ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

❁ ❁ ❁

ان آیات کی تشریح

﴿ تَبَارَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلَالِ وَالْإِکْرَامِ ﴾ (الرحمٰن:۷۸)

ترجمہ: ”تیرے پروردگار کا نام بابرکت ہے، جو عزت وجلال والا ہے“

...... **شرح** ......

”تَبَارَکَ اسْمُ رَبِّکَ“ ”البرکۃ“ کا لغوی معنی بڑھنا اور زیادہ ہونا ہے، اور ”التبریک“ برکت کی دعا کرنے کو کہتے ہیں، آیت کا معنی ہوگا تیرے رب کا نام بڑا عظیم اونچا اور بلند شان والا ہے، اس لفظ کا اطلاق صرف اللہ کیلئے ہی ہوسکتا ہے، ”ذِی الْجَلَالِ وَالْإِکْرَامِ“ اس کی تفسیر ان آیات کے ضمن میں بیان ہوچکی جن میں صفت ”الوجہ“ کا اثبات مذکور ہے۔

❁ ❁ ❁

﴿ فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ﴾ (مریم:۶۵)

ترجمہ: ”تو اس کی عبادت کر اور اس کی عبادت پر جم جا، کیا تیرے علم میں اس کا ہمنام ہم پلہ اور بھی ہے“

...... **شرح** ......

”فَاعْبُدْهُ“ یعنی صرف اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کریں۔

”العبادۃ“ کا لغوی معنی ذلت وانکساری ہے جبکہ شرعی اصطلاح میں عبادت ایک ایسا جامع نام ہے جو ان تمام اعمال واقوال، جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہوں پر بولا جاتا ہے، وہ اعمال واقوال ظاہری ہوں یا باطنی۔ ”وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ“ یعنی اللہ کی عبادت پر جم جائیں اور اسے لازم کرلیں اور اس کی راہ میں جو مشقتیں آئیں ان پر صبر کریں۔

”هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا“ استفہام انکاری ہے، معنی ہوگا، اللہ کے مثل کوئی نہیں کہ اسے شریک فی العبادۃ کیا جائے۔

❁ ❁ ❁

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ﴾ (الاخلاص:۴)

ترجمہ: ”اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے“

...... **شرح** ......

”وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ“ لغت عرب ”الکفو“ بمعنی نظیر ومثل کے ہے، یعنی اللہ کی مخلوق میں سے کوئی اس کا مثل وشریک نہیں۔

❁ ❁ ❁

﴿ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾ (البقرۃ:۲۲)

ترجمہ: ”خبردار باوجود جاننے کے اللہ کے ساتھ شریک مقرر نہ کرو“

...... **شرح** ......

”فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا“ ”النِّد“ لغت میں مثل، نظیر اور شبیہ کو کہتے ہیں، یعنی اللہ کے مثل کسی کو نہ بناؤ کہ اللہ کے ساتھ ساتھ ان کی بھی عبادت کرنے لگو اور محبت وتعظیم میں انہیں اللہ کے برابر جاننے لگو۔ ”وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ“ یعنی تم جانتے ہو کہ اللہ ہی تمہارا رب وخالق ہے اور وہی ہر چیز کا خالق ہے، اور مخلوق میں سے کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ﴾

ترجمہ: ’’اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے شریک اوروں کو ٹھہرا کر ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہیے‘‘ (البقرۃ:۱۶۵)

...... **شرح** ......

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی دلیل بیان فرمائی، اور اس آیت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظیم سلطنت، عظیم قدرت اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی تنہا پوری کائنات کا خالق ہے کے واضح ہوجانے کے باوجود بھی بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے عاجز اور کمزور بتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے اور ان کی عبادت کرتے ہیں، ’’يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ‘‘یعنی ان کفار نے ان شریکوں کی عبادت کرنے پر ہی بس نہیں کی بلکہ ان سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں، اتنی محبت کہ جتنی اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں، چنانچہ انہوں نے ان شریکوں کو پیدا کرنے، روزی دینے اور کائنات کے امور کی تدبیر کرنے میں تو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں جانا لیکن محبت میں انہیں اللہ کے برابر درجہ دے دیا۔

ان آیات کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد

یہ آیات اللہ تعالیٰ کے اسمِ مبارک کے اثبات، تعظیم اور اجلال پر مشتمل ہیں۔ نیز ان آیات میں کسی کے اللہ تعالیٰ کے ہم نام ہونے اور ہم مثل ہونے کی بھی نفی ہے۔ یہ نفی مجمل طریقے سے ہے، کتاب وسنت میں جب بھی امور سے نفی کی گئی ہے تو اسی طرح مجمل طریقے سے کی گئی ہے، اور وہ طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے عیوب ونقائص کی ان تمام انواع کی نفی کردی جائے جو اس کے کمالِ واجب سے متضاد ہو۔

[۱۷] نفی الشریک عن اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ سے ہر قسم کے شریک کی نفی کا بیان

قولہ: ﴿ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴾ (الاسراء:۱۱۱)

قولہ: ﴿يُسَبِّحُ لَهُ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَمَافِي الْاَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (التغابن:۱)

قولہ: ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا . الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴾ (الفرقان:۱،۲)

قولہ: ﴿ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ . عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ (المؤمنون:۹۱،۹۲)

قولہ: ﴿ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (النحل:۷۴)

قولہ: ﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (الاعراف:۳۳)

ان آیات کی تشریح

﴿ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا ﴾

ترجمہ ”اور کہہ دیجئے! تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہیں۔ جو نہ اولاد رکھتا ہے اور نہ اپنی بادشاہت میں کسی کو شریک رکھتا ہے۔ نہ اس سبب سے کہ وہ کمزور ہے کوئی اس کا حمایتی ہے۔ اور تو اس کی پوری پوری بڑائی بیان کرتا رہ“

شرح ......

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ“ حمد کا معنی تعریف ہے، اور اس پر ”ال“ استغراق کیلئے ہے، یعنی تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں۔ ”الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا“ یعنی جس کی اولاد نہیں (بخلاف) یہود و نصاریٰ اور بعض مشرکین کے عقیدے کے۔ ”وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ“ یعنی اللہ تعالیٰ کی بادشاہت اور ربوبیت میں کوئی شریک نہیں بخلاف ان بت پرستوں کے عقیدے کے جو تعدد آلھۃ کے قائل ہیں۔ ”وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ“ یعنی اللہ تعالیٰ کمزور نہیں کہ ولی، وزیر یا کسی مشیر کا محتاج ہو، اس لیئے نہ تو وہ کسی کو اپنا حلیف بناتا ہے اور نہ ہی کسی سے مدد طلب کرتا ہے۔ ”وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا“ یعنی ظالموں (مشرکوں) کی باتوں سے اللہ کی پاکی اور بڑائی بیان کرو۔

۞ ۞ ۞

﴿ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾ (التغابن:۱)

ترجمہ ”آسمانوں اور زمینوں کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہے، اسی کی سلطنت ہے اور اسی کی تعریف ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

شرح ......

”یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ“ یعنی آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات، ہر نقص و عیب سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ و پاکی بیان کرتی ہیں۔ ”لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ“ یعنی بادشاہت اور حمد دونوں اللہ تعالیٰ کیلئے مختص ہیں ان میں کسی اور کے لیئے کچھ بھی نہیں، بندوں کو جو بادشاہتیں ملی ہوئی ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہیں۔ ”وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ“ یعنی ہر چیز پر قادر ہونے کی وجہ سے کوئی چیز اسے عاجز نہیں کرسکتی۔

۞ ۞ ۞

﴿ تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا . الَّذِیْ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ﴾ (الفرقان:۱،۲)

ترجمہ ”بہت بابرکت ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندہ پر فرقان اتارا تا کہ وہ تمام لوگوں کیلئے آگاہ کرنے والا بن جائے۔ اسی اللہ کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی، اور وہ کوئی اولاد نہیں رکھتا، نہ اس کی سلطنت میں کوئی اس کا ساجھی ہے، اور ہر چیز کو اس نے پیدا کر کے ایک مناسب اندازہ ٹھہرا دیا ہے“

شرح ......

”تَبَارَکَ“ فعل ماضی ہے، اور ”البرکة“ سے ماخوذ ہے، البرکۃ ایسی بڑھوتی اور زیادتی کو کہتے ہیں جو ہمیشہ برقرار اور ثابت رہے۔ یہ لفظ (تبارک) صرف اللہ تعالیٰ کیلئے استعمال ہوتا ہے، اور صرف لفظ ماضی ہی استعمال ہوتا ہے۔ ”الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ“ فرقان سے مراد قرآن ہے، قرآن کو فرقان اس لیئے کہا گیا ہے کہ یہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ ”عَلٰی عَبْدِهٖ“ یہاں عبد سے مراد محمد ﷺ ہیں، اور عبد صفت مدح و ثناء ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عبد کی

اپنی طرف اضافت فرمائی ہے، اور یہ اضافت برائے تشریف وتکریم ہے، جو انزالِ قرآن کی مناسبت کے مقام میں ذکر ہوئی ہے۔ "لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا" "العالمین" سے مراد تمام انس وجن ہیں۔ اور تمام انس وجن کی طرف مبعوث ہونا صرف نبی ﷺ کی خصوصیت ہے۔

"نذیر" بمعنی "مُنذِر" یہ "الانذار" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے، اسبابِ خوف سے آگاہ کرنا۔ "لیکون" نبی ﷺ پر انزالِ قرآن کی علت بیان ہورہی ہے، تاکہ آپ ﷺ کو رسالتِ عامہ کے ساتھ مخصوص کردیا جائے۔ (یعنی آپ ﷺ پر قرآن کا نزول اس لئے ہوا کہ آپ ﷺ اس قرآن کے ذریعے تمام انس وجن کو ڈرائیں یہ رسالتِ عامہ کا منصب ہے جو آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہے)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کیلئے چار صفات بیان فرمائی ہیں۔

(۱) "الَّذِيْ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ" یعنی آسمانوں اور زمین کی بادشاہت صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے، کسی اور کیلئے نہیں، لہذا وہ اکیلا ہی متصرف ہے۔

(۲) "وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا" اس کی اولاد نہیں، جیسا کہ یہود ونصاریٰ کا زعم باطل ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو کمالِ غنی کی خوبی سے متصف ہے۔ (لہذا وہ اولاد سے مستغنی ہے) جبکہ پوری مخلوق محتاجِ محض ہے۔

(۳) "وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ" یعنی اس کی بادشاہت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس میں وثنیہ (بت پرست) ثنویہ (متعدد آلھۃ کے قائل) اور دیگر مشرکین کا رد ہے۔

(۴) "وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ" یعنی تمام مخلوقات کو پیدا کیا۔ **کل شیء** میں افعالِ عباد بھی داخل ہیں، افعالِ عباد، اللہ تعالیٰ کی مخلوق بھی ہیں اور بندے کا فعل بھی۔ "فَقَدَّرَهُ تَقْدِيْرًا" یعنی ہر چیز کی اجل، رزق اور سعادت وشقاوت کے اعتبار سے تقدیر مقرر فرمادی، اور ہر چیز کو اس کے مناسبِ حال بنادیا۔

امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے اولاد اور شریک سے اپنی تنزیہ اور پاکی بیان فرمائی، اور پھر یہ بھی بتایا کہ ہر چیز کو پیدا کرکے اس کی تقدیر بھی مقرر کردی ہے، گویا اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز مخلوق ومربوب ہے اور وہ ہر چیز کا خالق، مالک، رب اور الٰہ ہے، اور ہر چیز اس کے قہر، تدبیر، تسخیر، اور تقدیر کے تحت ہے۔"

۞ ۞ ۞

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ . عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ (المؤمنون ۹۱،۹۲)

ترجمہ "نہ تو اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا اور نہ اس کے ساتھ اور کوئی معبود ہے، ورنہ ہر معبود اپنی مخلوق کو لیئے لیئے پھرتا، اور ہر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا، جو اوصاف یہ لوگ بتلاتے ہیں، ان سے اللہ پاک (اور بے نیاز ہے)۔ وہ غیب وحاضر کو جاننے والا ہے اور جو شرک یہ کرتے ہیں اس سے بالاتر ہے"

...... شرح ......

"مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ اِلٰهٍ" اس آیت میں اللہ تعالیٰ اولاد، ملک، تصرف اور عبادت میں کسی بھی قسم کے شریک کی اپنی ذات سے تنزیہ وپاکی فرما رہا ہے۔ اور کلمۂ "من" دونوں مقام پر نفی کی تاکید کیلئے ہے۔ "اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ" آیت کے اول حصہ میں اللہ تعالیٰ سے اولاد اور شریک فی الالوھیۃ کی جو نفی ہوئی ہے اب اس کی دلیل بیان ہورہی ہے۔ یعنی اگر بالفرض تعددِ آلھۃ کو تسلیم کرلیا جائے، تو ہر الٰہ اپنی اپنی مخلوق لیکر دوسرے سے الگ ہوچکا ہوتا، اور اس تقسیم کی وجہ سے کائنات کا نظام کب سے درھم برھم ہوچکا ہوتا۔ جبکہ حقیقت اور مشاہدہ یہ ہے کہ پوری کائنات ایک بہترین اور مکمل نظام کے ساتھ چل رہی ہے، ہمیں کہیں بھی

تعدد والقسام نظر نہیں آتا۔ "وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور آلھۃ ہوتے تو ہر ایک دوسرے کی مخالفت کرتا اور اس پر غلبہ پانے کی کوشش کرتا، نتیجہ بعض، بعض پر غالب آجاتا جس طرح کہ دنیا کے بادشاہوں کا معاملہ ہے۔ ایسی صورت میں الٰہ مغلوب ضعیف ثابت ہوا اور ضعیف، الٰہ ہونے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ لہذا جب شریک کا بطلان ثابت ہوگیا تو یہ بات متعین ہوگئی کہ الٰہ صرف ایک ہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ" یعنی یہ لوگ شریک اور اولاد کی باتیں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور منزہ ہے۔ "عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ" یعنی صرف اللہ تعالیٰ ہی مختص ہے ہر اس چیز کے علم کے ساتھ جو لوگوں سے پوشیدہ ہے اور جو لوگوں کے مشاہدہ میں ہے، اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو بھی مخلوق ہے وہ اگرچہ کچھ مشاہد (حاضر) چیزوں کا ادراک کرلیتی ہے مگر غیب کا علم کوئی نہیں جانتا۔ "فَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ" یعنی اللہ تعالیٰ پاک اور منزہ ہے اس شرک سے جو لوگ اس کے ساتھ کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے ملک میں ہر شریک سے پاک اور منزہ ہے۔

❁ ❁ ❁

﴿ فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (النحل:۷۴)

ترجمہ "پس اللہ تعالیٰ کیلئے مثالیں مت بناؤ، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"

شرح

"فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ" یہاں اللہ تعالیٰ اپنے بارے میں مثالیں بیان کرنے سے منع فرمارہا ہے۔ مثال بیان کرنے سے مراد یہ ہے کہ کسی ایک حالت یا کیفیت کو دوسری حالت یا کیفیت کے مشابہ قرار دینا۔ مشرکین کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بلند ہے کہ ہم میں سے کوئی اس کی عبادت کرے، ہمارے اور اس کے درمیان واسطہ ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ

اللہ تعالیٰ کو ملوکِ دنیا کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے بتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ بناتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے روک دیا، کیونکہ جب اس کا کوئی مثل ہی نہیں تو اسے مخلوق میں سے کسی کے مثل یا مشابہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ "اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس کا کوئی مثل نہیں، جبکہ تمہیں صحیح علم نہیں ہے، لہذا تمہارا یہ عمل محض وہمِ فاسد اور خیالِ باطل ہے، نیز تمہیں عبادتِ اصنام کے سوءِ انجام کا بھی علم نہیں ہے۔

❁ ❁ ❁

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّىَ الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْىَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (الاعراف:۳۳)

ترجمہ "آپ فرمائیے کہ البتہ میرے رب نے صرف حرام کیا ہے ان تمام فحش باتوں کو جو اعلانیہ ہے اور جو پوشیدہ ہیں اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی، اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگادو جس کو تم جانتے نہیں"

شرح

"قُلْ" یہ نبی ﷺ سے خطاب ہے، اور آپ ﷺ سے خطاب میں قرآن کے کلام اللہ ہونے کی دلیل ہے، اور یہ کہ آپ ﷺ تو صرف اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔ "اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّىَ الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ" میرے پروردگار نے ہر قسم کی فواحش کو حرام قرار دے دیا ہے، خواہ وہ اعلانیہ ہوں یا خفیہ۔ فواحش "فاحشۃ" کی جمع ہے، "فاحشۃ" ہر وہ گناہ جو انتہائی قبیح ہو۔ "الاثم" ہر وہ معصیت جو انسان کو گناہگار بنادے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں الاثم سے مراد صرف خمر (شراب) ہے۔ "وَالْبَغْىَ بِغَيْرِ الْحَقِّ" یعنی اللہ تعالیٰ نے حد سے

بڑھا ہوا ظلم (سرکشی) اور لوگوں پر زیادتی کرنے کو حرام کر دیا ہے۔ ''وَاَنْ تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا '' یعنی یہ بھی حرام ہے کہ تم عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنالو جس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل وحجت نازل نہیں فرمائی۔ ''وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ '' اور یہ بات بھی حرام ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف بلاعلم کوئی بات منسوب کی جائے۔ بلاعلم جو بات منسوب کی جائے گی وہ کذب وافتراء ہوگی، جیسا کہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور جیسا کہ بہت سے لوگوں نے بلاعلمِ شرعی اللہ تعالیٰ کی طرف بہت سے حلال وحرام منسوب کیئے ہیں۔

ان آیات کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد

یہ آیات اللہ تعالیٰ سے ہر قسم کے شریک کی نفی پر مشتمل ہیں، نیز صرف اللہ تعالیٰ کیلئے کمالِ مطلق کا اثبات، اولاد کی نفی، ہم مثل ہمسر کی نفی پر بھی مشتمل ہیں۔ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کے نقص سے تنزیہ وتقدیس بیان کرتی ہے۔ یہ بات شرک کے باطل ہونے اور یہ کہ شرک محض جھل اور تخیل پر مبنی ہے اور یہ کہ اللہ رب العزت ہر شبیہ ومثل سے پاک ہے پر دلالت کرتی ہیں۔

(واللہ اعلم)

۱۸. اثبات استواء اللہ علی عرشه

اللہ تعالیٰ کے مستوی علی العرش ہونے کا اثبات

وقوله: ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾ في سبعة مواضع في سورة الأعراف (۵۴) قوله: ﴿ إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ وقال في سورة يونس (۳) عليه السلام: ﴿ إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ وقال في سورة الرعد (۲): ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ وقال في سورة طه (۵): ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾ وقال في سورة الم السجدة (۴): ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ وقال في سورة الحديد (۴): ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾

ان آیات کی تشریح

...... **شرح** ......

اللہ تعالیٰ کے اپنے عرش پر مستوی ہونے کے اثبات میں قرآن حکیم کی سات آیات وارد ہوئی ہیں، ان تمام آیات میں صفت ''استــــواء'' کا ایک ہی لفظ کے ساتھ اثبات وارد ہے، اور وہ ''استوىٰ على العرش '' کا صیغہ ہے، تو اس طرح اتنی بار ایک صیغے سے وارد ہونا ایک ایسی نص بن جاتا ہے جو اپنے حقیقی معنی پر قائم ہے، اور جس میں تاویلاً کسی دوسرے معنی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔

"استواء" اللہ تعالیٰ کی صفتِ فعلیہ ہے جو دیگر تمام صفات کی طرح اللہ تعالیٰ کیلئے اسطرح ثابت ہے جیسے اس کی عظمت وجلالت کے لائق ہے۔

کلمہ "استویٰ" کے لغتِ عرب میں چار معانی ہیں۔ "علا"، "ارتفع"، "صعد"، اور "استقر" استویٰ پر مشتمل تمام آیات کی تفسیر جو سلف صالحین سے منقول ہے وہ انہی معانی پر دائر اور قائم ہے۔

❁ ❁ ❁

﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (الأعراف:۵۴)

ترجمہ "بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا پھر عرش پر قائم ہوا۔

﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (یونس:۳)

ترجمہ: "بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کر دیا پھر عرش پر قائم ہوا۔

شرح

پہلی دو آیات میں قولہ تعالیٰ "إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ" سے مراد یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی تمہارا خالق ہے اور اپنی نعمتوں کے ساتھ تمہارا مربی ہے تو پھر ضروری ہے کہ تم صرف اسی خالق اور مربی کی عبادت کرو۔ "اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ" یعنی اللہ تعالیٰ تمام عالَم کا خالق ہے، آسمانوں، زمینوں اور ان کے مابین ہر چیز کا۔ "فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ" یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام عالَم کو چھ دن میں پیدا فرمایا، یہ چھ دن اتوار، پیر، منگل، بدھ، جمعرات اور جمعہ ہیں،

چھٹے دن (جمعہ) تمام خلق بن چکی تو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ "ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ" یعنی پھر اللہ تعالیٰ عرش پر چڑھا اور بلند ہوا، بالکل ایسے جیسے اس کی ذات کے لائق ہے، مؤلف رحمہ اللہ نے یہی بتانے کیلئے ان آیات کو پیش فرمایا۔ "العرش" لغت میں بادشاہ کے تخت کو کہتے ہیں یہاں عرش سے مراد (تمام نصوص کو جمع کر کے) یہ ہے ایک تخت جس کے پائے ہیں اور جس کو ملائکہ نے اٹھا رکھا ہے اور جو پوری دنیا پر قبے کی شکل میں احاطہ کیئے ہوئے ہے، گویا اللہ تعالیٰ کا عرش تمام مخلوقات کی چھت ہے۔

❁ ❁ ❁

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾

ترجمہ: "اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے بلند کر رکھا ہے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، پھر وہ عرش پر قرار پکڑے ہوئے ہے" (الرعد:۲)

شرح

آسمانوں کو بلند کرنے سے مراد یہ ہے کہ انہیں زمین سے اتنا اونچا بنایا کہ ان تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ "بِغَيْرِ عَمَدٍ" "عمد" "عماد" کی جمع ہے بمعنی ستون، یعنی آسمان کسی ستون کے بغیر اللہ رب العزت کی قدرت کے ساتھ قائم ہے۔ "تَرَوْنَهَا" نفی عمد کی تاکید ہے اس کی تفسیر میں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آسمانوں کے ستون تو ہیں لیکن ہم انہیں دیکھ نہیں پاتے، لیکن پہلی تفسیر درست ہے۔ "ثم استوی علی العرش" آیت کا یہ حصہ مؤلف رحمہ اللہ کا محلِ استدلال ہے، جو اللہ رب العزت کی صفتِ "استواء" ثابت کر رہا ہے، بقیہ آیات کی تفسیر بھی اس آیت کی طرح ہے۔

ان تمام آیات سے یہ عقیدہ حاصل ہو رہا ہے کہ اللہ رب العزت اپنے عرش پر جیسا کہ اس کی عظمت وجلالت کے لائق ہے مستوی ہے۔ یہ تمام آیات ان لوگوں پر رد ہیں جو "استواء" کی

''استیلاء'' قہر (غلبہ پانا) سے تاویل کرتے ہیں، جو ''عرش'' بمعنی ''مُلک'' لیتے ہیں، اور پھر جملہ ''استویٰ علی العرش'' کا معنی یوں بیان کرتے ہیں کہ اس نے اپنے ملک پر قہر وغلبہ پالیا۔

یہ معنی کئی وجوہ سے باطل ہے:

(۱) یہ تفسیر بدعت ہے اور سلف صالحین صحابہ کرام، تابعین اور اتباع تابعین کی تفسیر کے خلاف ہے۔ یہ معنی سب سے پہلے، جہمیہ اور معتزلہ نے کیا جو مردود اور باطل ہے۔

(۲) اگر ''استواء علی العرش'' کا معنی ملک پر غلبہ حاصل کرنا ہے تو پھر عرش پر مستوی ہونے یا ساتویں زمین ہو یا کوئی اور جملہ مخلوقات پر مستوی ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ اللہ رب العزت تمام مخلوقات کا مالک ہے اور تمام مخلوقات پر غالب ہے، تو پھر صرف عرش پر غلبہ پانے کو بیان کرنے کا کیا فائدہ؟

(۳) قرآن وحدیث کے تمام نصوص میں ''استویٰ علی العرش'' ہی مذکور ہے، کسی ایک مقام پر تو ''استولیٰ علی العرش'' ہوتا، کہ بقیہ نصوص کی اس کے ساتھ تفسیر کرلی جائے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے ''ثم استویٰ علی العرش'' فرمایا، اور ثم ترتیب ومہلت کے معنی کا فائدہ دیتا ہے اگر استواء کا معنی عرش پر غلبہ اور قدرت پانا ہے تو اسے آسمان وزمین کی خلق سے متاخر کیوں کیا (یعنی کیا اللہ تعالیٰ کو آسمان وزمین کی خلق سے قبل عرش پر غلبہ اور قدرت حاصل نہیں تھی؟) جبکہ عرش تو آسمان وزمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل ہی موجود تھا، تو پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو آسمان وزمین کی خلق سے قبل عرش پر قدرت وغلبہ حاصل نہیں تھا، بعد میں حاصل ہوا، یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر سب سے بڑا بہتان ہے۔ (واللہ اعلم)

[۱۹] اثبات علو اللہ علی مخلوقاتہ

اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوقات کے اوپر ہونے کا اثبات

وقولہ : ﴿ یَا عِیسَىٰ إِنِّی مُتَوَفِّیکَ وَرَافِعُکَ إِلَیَّ ﴾ (آل عمران:۵۵) ﴿ بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ إِلَیْهِ ﴾ (النساء:۱۵۸) ﴿ إِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهُ ﴾ (فاطر:۱۰) ﴿ یَا هَامَانُ ابْنِ لِی صَرْحًا لَعَلِّی أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ . أَسْبَابَ السَّمٰوَاتِ فَأَطَّلِعَ إِلَىٰ إِلٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّی لَأَظُنُّهُ کَاذِبًا ﴾ (غافر:۳۶) ﴿ أَأَمِنْتُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ أَنْ یَخْسِفَ بِکُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِیَ تَمُورُ . أَمْ أَمِنْتُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ أَنْ یُرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُونَ کَیْفَ نَذِیرٌ ﴾ (الملک:۱۶،۱۷)

ان آیات کی تشریح

﴿ یَا عِیسَىٰ إِنِّی مُتَوَفِّیکَ وَرَافِعُکَ إِلَیَّ ﴾ (آل عمران:۵۵)

ترجمہ: ''اے عیسیٰ میں تجھے پورا پورا لینے والا ہوں اور تجھے اپنی جانب اٹھانے والا ہوں'' (آل عمران:۵۵)

شرح

''یَا عِیسَىٰ'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو خطاب ہے۔ ''إِنِّی مُتَوَفِّیکَ'' اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ یہاں ''وفاۃ'' سے مراد النوم (نیند) ہے جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے ﴿ وَهُوَ الَّذِی یَتَوَفَّاکُمْ بِاللَّیْلِ ﴾ (الانعام:۶۰)

ترجمہ: ''اور وہ ایسا ہے کہ رات میں تمہیں وفات (نیند) دے دیتا ہے''

اور جیسا کہ فرمایا: ﴿ اللّٰهُ یَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِینَ مَوْتِهَا وَالَّتِی لَمْ تَمُتْ فِی مَنَامِهَا ﴾

ترجمہ: ''اور اللہ ہی روحوں کو ان کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی انہیں ان کی نیند کے وقت قبض کر لیتا ہے'' (الزمر:۴۲)

﴿ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ ﴾ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ اپنی طرف آسمانوں میں اٹھا لیا تھا، اور وہ آج بھی زندہ ہیں محلِ استدلال یہی مقام ہے کیوں کہ اٹھانا اوپر کی طرف ہوتا ہے۔

❁ ❁ ❁

﴿ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ ﴾ (النساء:۱۵۸)

ترجمہ: ''بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں (عیسیٰ علیہ السلام) اپنی طرف اٹھا لیا''

...... **شرح** ......

''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ'' یہ یہودیوں پر رد ہے کیوں کہ ان کا زعم تھا کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴾ (النساء:۱۵۷)

ترجمہ: ''نہ تو انہوں نے اسے قتل کیا نہ سولی پر چڑھایا بلکہ ان کیلئے وہی صورت بنادی گئی تھی، یقین جانو کہ عیسیٰ کے بارے میں اختلاف کرنے والے ان کے بارے میں شک میں ہیں، انہیں اس کا کوئی یقین نہیں بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے، اتنا یقینی ہے کہ انہوں نے اسے قتل نہیں کیا''

''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْه'' یعنی اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ اپنی طرف اٹھا لیا، اور قتل نہیں کیئے گئے۔ محلِ استدلال یہی جملہ ہے کیوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے اوپر اور بلند ہونے کا اثبات ہے اس لیئے کے ''اٹھانا'' بلندی اور اوپر کی طرف ہوتا ہے۔

❁ ❁ ❁

﴿ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ ﴾ (فاطر:۱۰)

ترجمہ: ''تمام تر ستھرے کلمات اسی کی طرف چڑھتے ہیں اور نیک عمل انکو بلند کرتا ہے''

...... **شرح** ......

''اِلَیْهِ یَصْعَدُ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتے اور اٹھتے ہیں کسی اور کی طرف نہیں۔ ''اَلْکَلِمُ الطَّیِّبُ'' یعنی ذکر، تلاوت اور دعائیں وغیرہ۔ ''وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ'' یعنی عملِ صالح، الکلم الطیب کو اوپر اٹھاتا ہے، اس لیئے کہ الکلم الطیب، عملِ صالح کے بغیر قبول نہیں ہوتے، لہذا جو شخص اپنے فرائض ادا نہیں کرتا اس کی دعائیں، تلاوت اور ذکر وغیرہ رد کر دیئے جاتے ہیں۔

ایاس بن معاویہ کا قول ہے: اگر اعمالِ صالحہ نہ ہوں تو کلام اوپر نہیں اٹھے گی۔

حسن وقتادۃ کا قول ہے: قول بلا عمل قبول نہیں ہوتا۔

اس آیت سے ''علو اللہ علی خلقه'' (اللہ کا اپنی مخلوق سے بلند اور اونچا ہونا) کا اثبات ہو رہا ہے کیوں کہ چڑھنا اور اٹھنا بلندی اور اوپر کی طرف ہوتا ہے۔

❁ ❁ ❁

﴿ یٰهَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤی اِلٰهِ مُوْسٰی وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ کَاذِبًا ﴾ (غافر:۳۶)

ترجمہ: ''فرعون نے کہا: اے ہامان! میرے لیئے ایک بالا خانہ بنا شاید کہ میں آسمان کے جو دروازے ہیں ان دروازوں تک پہنچ جاؤں اور موسیٰ کے معبود کو جھانک لوں اور بے شک میں سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے''

...... **شرح** ......

''یٰهَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا'' یہ فرعون کا مقولہ ہے جو اس نے اپنے وزیر ہامان سے کہا تھا کہ میرے لیئے بلند و بالا محل تیار کراؤ۔ ''لَعَلِّیْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ'' اسباب

بمعنی طرق وابواب کے ہے، یعنی میں آسمان کے راستوں اور دروازوں تک پہنچ جاؤں۔

''فَأَطَّلِعَ إِلَى إِلَهِ مُوسَى'' (تا کہ موسیٰ کے معبود کو جھانک لوں) فرعون کے اس مقولہ کا مقصد موسیٰ علیہ السلام کے دعویٰ کہ ''مجھے اللہ نے بھیجا ہے'' یا یہ کہ ''میرا معبود آسمانوں میں ہے'' کی تکذیب ہے، اس لیئے فرعون نے مزید یہ بھی کہا: ''وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا'' یعنی میں موسیٰ کو اس کے دعویٰ رسالت یا اس دعویٰ میں کہ اس کا الٰہ آسمانوں میں ہے، میں جھوٹا سمجھتا ہوں۔

اس آیت سے بھی اللہ تعالیٰ کے ''علو علی خلقه'' کا اثبات ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے متعلق یہی بتایا تھا اور فرعون نے اس بات کی تکذیب کی کوشش کی۔

۞ ۞ ۞

﴿ أَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ. أَمْ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ ﴾

(الملک: ۱۶،۱۷)

ترجمہ: ''کیا تم اس بات سے امن میں آگئے ہو کہ جو ذات آسمانوں میں ہے وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے اور اچانک زمین لرزنے لگے۔ کیا تم اس بات سے نڈر ہوگئے ہو کہ جو ذات آسمانوں میں ہے وہ تم پر پتھر برسائے، پھر تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ میرا ڈرانا کیسا تھا''

...... **شرح** ......

''أَأَمِنتُمْ'' (کیا تم امن میں آگئے ہو) امن، خوف کی ضد ہے، ''مَّن فِي السَّمَاءِ'' یعنی اس ذات کی سزا سے جو آسمانوں میں ہے۔ آسمانوں میں ہونے کا معنی آسمانوں کے اوپر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ ﴾ اور یہ معنی تب ہوگا اگر ''السماء'' سے مراد یہ بنے ہوئے آسمان مراد ہوں، اور اگر ''السماء'' سے مراد مطلقا بلندی ہو تو اس صورت میں فی ظرف کیلئے ہوگا معنی ہوگا فی العلو (بلندی میں)

''أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ'' یعنی تمہیں زمین میں دھنسا دے جیسا کہ قارون کے ساتھ ہوا۔ ''فَإِذَا هِيَ تَمُورُ'' یعنی زمین اضطراب اور حرکت کرنے لگ جائے۔

''أَمْ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا'' یعنی تم پر پتھر برسائے جس طرح کہ قوم لوط اور اصحاب الفیل پر پتھر برسائے تھے، ایک قول یہ ہے کہ ''حَاصِبًا'' سے مراد ایسے بادل جس میں پتھر ہوں، اور ایک قول ہے کہ ایسی ہوا جس میں پتھر ہوں۔ ''فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ'' یعنی عنقریب تم میرا یہ ڈرانا جان لوگے، جب تم عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لوگے لیکن اس وقت یہ جاننا تمہیں کوئی نفع نہیں دے گا۔

ان دونوں آیتوں میں بھی اللہ تعالیٰ کے ''علو علی الخلق'' (مخلوق کے اوپر ہونا) کا اثبات ہو رہا ہے کیوں کہ دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے فی السماء ہونے کی صراحت ہے۔

مؤلف رحمہ اللہ کی ذکر کردہ یہ تمام آیات اثبات ''علو'' پر دلالت کر رہی ہیں اور ان آیات سے پہلے ذکر کردہ آیات ''استواء علی العرش'' کے اثبات پر دلالت کر رہی تھیں۔

استواء اور العلو میں فرق

(۱) علو: اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ذاتیہ میں سے ہے، جبکہ استواء صفاتِ فعلیہ میں سے ہے، لہذا ''علو الله علی خلقه'' اللہ تعالیٰ کی ذات کا لازمی وصف ہے، جبکہ استواء اس کے افعال میں سے ایک فعل ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنی مشیت اور قدرت سے جب چاہے کرسکتا ہے، اسی لئے ''استواء'' صیغہ فعل (استویٰ) تراخی کے لفظ (ثم) کے ساتھ ذکر ہوا، جو کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے بعد ہوا۔

(۲) ''العلو'': اللہ تعالیٰ کی ان صفات میں سے ہے جو عقلاً اور نقلاً دونوں طرح سے ثابت ہے، جبکہ استواء نقلاً ثابت ہے عقلاً نہیں۔

۞ ۞ ۞

[۲۰] اثبات معیة الله لخلقه

اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوق کے ساتھ ہونے کا اثبات

وقولہ: ﴿ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ فِیْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ (الحدید:۴)

﴿ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ (المجادلۃ:۷)

وقولہ: ﴿ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ (التوبۃ:۴۰) ﴿ إِنَّنِيْ مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرٰى ﴾ (طٰہٰ:۴۶) ﴿ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِيْنَ هُمْ مُحْسِنُوْنَ ﴾ (النحل:۱۲۸) ﴿ وَاصْبِرُوْا إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ ﴾ (الانفال:۴۶) ﴿ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِيْنَ ﴾ (البقرۃ:۲۴۹)

۞ ۞ ۞

ان آیات کی تشریح

﴿ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ فِیْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ (الحدید:۴)

ترجمہ: ’’وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر مستوی ہوگیا وہ خوب جانتا ہے اُس چیز کو جو زمین میں جائے، اور جو اس سے نکلے، اور جو آسمان

سے نیچے آئے اور جو کچھ چڑھ کر اس میں جائے، اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے‘‘

...... **شرح** ......

’’هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ .... وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ‘‘اس عبارت کی تفسیر مسئلہ ’’استواء‘‘ اور ’’علو‘‘ میں گزر چکی ہے۔

’’وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ‘‘یعنی اللہ تعالیٰ اپنے علم کے ساتھ تمہارے ساتھ ہے، اور تم جہاں کہیں بھی ہو خشکی یا تری میں، رات یا دن میں، گھر میں یا جنگلات میں ہر حال میں اللہ تمہارا نگراں و محافظ ہے، تم جہاں اور جس حال میں بھی ہو اللہ تعالیٰ کا علم تمہارے بارے میں ایک جیسا ہے، تم اس کی سمع و بصر کے تحت ہو، وہ تمہاری باتوں کو سنتا ہے اور تمہارے ٹھکانوں کو جانتا ہے۔ آیت کا یہی مقام محلِ استدلال ہے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی معیت عامہ کا اثبات ہو رہا ہے۔

’’وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ‘‘یعنی تمہارے اعمال میں سے کوئی بھی چیز اس پر مخفی نہیں۔

۞ ۞ ۞

﴿ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ (المجادلۃ:۷)

ترجمہ: ’’تین آدمیوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ مگر ان کا چھٹا وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم کا اور نہ زیادہ کا مگر وہ ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں پھر قیامت کے دن انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا بے شک اللہ ہی ہر چیز کا علم رکھتا ہے‘‘

شرح

"مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلَاثَةٍ" النجوٰی: راز اور پوشیدہ بات کو کہتے ہیں، "اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ" یعنی اگر تین آدمی باہم سرگوشی کر رہے ہوں تو اللہ ان کے ساتھ چوتھا ہے، پانچ ہوں تو اللہ ان کے ساتھ چھٹا ہے، اسطرح کہ اللہ تعالیٰ ان کی سرگوشی سے مطلع اور باخبر ہونے میں ان کا شریک ہے۔

بالخصوص تین یا پانچ کا عدد اس لئے ذکر کیا کہ عموماً باہم سرگوشی کرنے والوں کی تعداد یہی ہوتی ہے، وگرنہ اللہ تعالیٰ کی یہ معیت تو قلیل وکثیر ہر عدد کے ساتھ ہے، اس لیئے تو اس کے بعد فرمایا: "وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَا اَکْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ" یعنی چاہے تعداد عددِ مذکور سے کم ہو یعنی ایک، اور دو یا زیادہ یعنی چھے، سات اور اس سے اوپر ہو۔ "اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ" یعنی اللہ اپنے علم کے ساتھ یہ جو سرگوشی کریں اسے جانتا ہے اور اس سرگوشی میں سے کوئی بھی بات اس پر مخفی نہیں رہ سکتی۔

مفسرین اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق کہتے ہیں: کہ منافقین اور یہود آپس میں سرگوشی کرتے اور مسلمانوں کو پریشان کرنے کیلیئے یہ تأثر دیتے کہ جیسے ان کے خلاف باتیں کر رہے ہیں، جب یہ معاملہ بڑھ گیا تو مسلمانوں نے نبی ﷺ سے اس صورتِ حال کی شکایت کی، چنانچہ آپ ﷺ نے حکم جاری کیا کہ مسلمانوں کے علاوہ کسی سے سرگوشی نہ کی جائے لیکن منافقین پھر بھی باز نہ آئے تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ "اَیْنَ مَا کَانُوْا" یعنی اللہ کا علم ان کی سرگوشی کو محیط ہے چاہے وہ جس جگہ پر بھی ہوں۔ "ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیَامَةِ" یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا اور پھر انہیں اس کی جزا دے گا، اس سے منافقین کی توبیخ وتہدید مقصود ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ" یعنی اللہ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

اس آیت کو یہاں اس لیئے ذکر کیا ہے کہ اس میں مخلوق کیلیئے اللہ تعالیٰ کی معیت (ساتھ ہونا) کا اثبات ہے۔ یہاں معیت سے معیتِ عامہ مراد ہے، جس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ مخلوق کے تمام

اعمال اللہ تعالیٰ کے احاطہ وعلم میں ہیں۔

امام احمد کا قول ہے: اس آیت کا آغاز بھی علم سے ہوا اور انتہاء بھی علم سے ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (التوبۃ: ۴۰)

ترجمہ: "غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے"

شرح

"لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" یہ بات نبی ﷺ نے ابوبکر کو تسلی دیتے ہوئے کہی جب آپ ﷺ اور ابوبکر ہجرت کے موقعہ پر غار میں چھپے ہوئے تھے اور مشرکین غار تک پہنچ گئے، ابوبکر یہ سوچ کر پریشان اور غمگین ہو گئے کہ اگر یہ لوگ ہم پر مطلع ہو گئے تو نبی ﷺ کو ایذاء اور تکلیف پہنچائیں گے، آپ ﷺ نے ابوبکر کی اس کیفیت کو بھانپ کر فرمایا: "لَا تَحْزَنْ" یعنی غم وحزن چھوڑ دو۔ "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مدد ونصرت اور تائید کے ساتھ ہمارے ساتھ ہے، اور جس کے ساتھ اللہ ہو وہ مغلوب نہیں ہو سکتا، اور جسے اپنے مغلوب نہ ہونے کا یقین ہو اسے غم وحزن نہیں کرنا چاہیئے۔

اس آیت کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد اہلِ ایمان کیلیئے اللہ تعالیٰ کی معیتِ خاصہ کا اثبات ہے، جس کا مقتضیٰ تائید ونصرت ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی﴾ (طٰہٰ: ۴۶)

ترجمہ: "میں تمہارے ساتھ ہوں اور سنتا دیکھتا رہوں گا"

شرح

موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی" یعنی

تم فرعون سے مت ڈرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ "اِنَّنِیْ مَعَکُمَا" نہی عن الخوف کی علت ہے،
یعنی اپنی نصرت کے ساتھ تمہارے ساتھ ہوں۔ "أَسْمَعُ" یعنی میں تمہاری اور اسکی کلام کو سنتا
ہوں۔ "وَأَرٰی" تمہارے اور اسکے ٹھکانے اور جگہ کو دیکھتا ہوں، تمہارے پورے معاملے کی کوئی
بھی بات مجھ پر مخفی نہیں ہے۔

آیت سے استدلال: اس آیت میں اولیاء اللہ کیلئے اللہ تعالیٰ کی معیتِ خاصہ کا اثبات ہے، جو
نصرت وتائید کی شکل میں انہیں حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح اس آیت میں اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ
سمع وبصر (سننا ودیکھنا) کا بھی اثبات ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِیْنَ ھُمْ مُحْسِنُوْنَ ﴾ (النحل:۱۲۸)

ترجمہ: "یقیناً اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں اور نیکوکاروں کے ساتھ ہے"

شرح

"اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا" متقین وہ لوگ ہیں جو حرام اور معصیت کے کاموں کو چاہے
جس نوع سے بھی تعلق رکھتے ہوں، ترک کردیں۔

"وَالَّذِیْنَ ھُمْ مُحْسِنُوْنَ" محسنین وہ لوگ ہیں جو اعمالِ طاعت ادا کرتے ہیں اور تمام
اوامر کو بجالاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ان لوگوں کے ساتھ معیت اپنی تائید، نصرت اور معونت کے
اعتبار سے ہے، اور یہ معیتِ خاصہ کہلاتی ہے، جو ان متقین ومحسنین کو حاصل ہے۔ آیت کا یہی پہلو
محلِ استشہاد ہے۔

﴿ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ ﴾ (الانفال:۴۶)

ترجمہ: "اور صبر کرو بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"

شرح

"وَاصْبِرُوْا" یہ صبر اختیار کرنے کا حکم ہے۔ صبر "حبس النفس" یعنی اپنے نفس کو روک دینے
کو کہتے ہیں۔ یہاں سے مراد مسلمانوں اور کفار کے مابین ہونیوالی جنگوں کی شدائد ومشکلات پر
صبر کرنا ہے۔ پھر اس حکمِ صبر کی علت بیان کرتے ہوئے فرمایا: "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ" یعنی
اللہ تعالیٰ قابلِ صبر معاملات میں صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے۔

محلِ استشہاد: اس آیت میں نیکی کے کاموں پر صبر کرنیوالوں اور مجاہدین فی سبیل اللہ کیلئے
اللہ تعالیٰ کی معیت کا اثبات ہے۔

امام شوکانی فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی معیت کتنی عظیم اور مبارک ہے کہ جسے یہ حاصل ہوجائے
وہ نہ تو مغلوب ہوسکتا ہے اور نہ ہی مسائل کی کثرت کی وجہ سے وہ ناکامی سے دوچار ہوسکتا ہے۔

﴿ کَمْ مِنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃً بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ مَعَ الصَّابِرِیْنَ ﴾

ترجمہ: "بسا اوقات چھوٹی اور تھوڑی سی جماعتیں بڑی اور بہت سی جماعتوں پر اللہ کے
حکم سے غلبہ پالیتی ہیں، اللہ تعالیٰ صبر والوں کے ساتھ ہے" (البقرۃ:۲۴۹)

شرح

"کَمْ مِنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃً" "الفئۃ" جماعت کو یا جماعت کے ایک حصے
کو کہتے ہیں۔ "بِاِذْنِ اللّٰہِ" یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادے، مشیت اور فیصلے سے۔ "وَاللّٰہُ مَعَ
الصَّابِرِیْنَ" آیت میں محلِ استشہاد یہی جملہ ہے، کیونکہ اس میں " صابرین علی الجهاد
فی سبیل اللہ " کیلئے اللہ تعالیٰ کی معیت کا اثبات ہے، یہ معیتِ خاصہ ہے جس کا مقتضیٰ
اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید ہے۔

مذکورہ تمام آیات میں اللہ تعالیٰ کیلئے معیت کا اثبات ہے۔ معیت دوطرح کی ہے:

النوع الاول: معیتِ عامہ، اس معیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا احاطہ کیئے ہوئے ہے، اور اللہ تعالیٰ مخلوق کے تمام اعمالِ خیر وشر کو جانتا ہے، اور اس پر ان کو جزا دیتا ہے، مذکورہ آیات میں سے ابتدائی دو آیات میں اسی معیت کا ذکر ہے۔

النوع الثانی: معیتِ خاصہ، وہ معیت جو مؤمنین بندوں کو حاصل ہے، جس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ مؤمن بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت، تائید اور نگرانی حاصل ہے۔ ابتدائی دو آیات کے علاوہ بقیہ پانچوں آیات میں اسی معیت کا ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی معیت اس کے "علو علی الخلق" اور "استواء علی العرش" کے منافی نہیں، کیونکہ مخلوق کے ساتھ اللہ کا قرب ومعیت اسطرح نہیں جس طرح مخلوق کا مخلوق کے ساتھ قرب ومعیت ہوتا ہے، اس لیئے کہ اللہ تعالیٰ کی شان ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ﴾ ہے، اور اس لیئے بھی کہ معیت مطلق مقارنت کو کہتے ہیں جو متصل ہونے اور برابر میں ہونے کو مقتضی نہیں ہے، عرب کہتے ہیں: "ما زلنا نمشی والقمر معنا" ہم مسلسل چلتے رہے اور چاند بھی ہمارے ساتھ تھا، حالانکہ چاند بہت اوپر ہوتا ہے، بندوں اور اسکے درمیان بہت دور کی مسافت ہوتی ہے، لہذا اللہ تعالیٰ کے "علو علی الخلق" اور "معیة للخلق" میں کوئی منافات نہیں۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت آگے آئے گی۔

۲۱. اثبات الکلام للہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کیلیئے صفتِ کلام کا اثبات

قوله: ﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللهِ حَدِيْثًا ﴾ (النساء:۸۷)

قوله: ﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللهِ قِيْلاً ﴾ (النساء:۱۲۲)

قوله: ﴿ وَاِذْ قَالَ اللهُ يَاعِيْسىٰ بْنَ مَرْيَمَ ﴾ (المائدة:۱۱۶)

قوله: ﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلاً ﴾ (الانعام:۱۱۵)

قوله: ﴿ وَكَلَّمَ اللهُ مُوْسىٰ تَكْلِيْمًا ﴾ (النساء:۱۶۴)

قوله: ﴿ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللهُ ﴾ (البقرة:۲۵۳)

قوله: ﴿ وَلَمَّا جَاءَ مُوْسىٰ لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ ﴾ (الاعراف:۱۴۳)

قوله: ﴿ وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ. وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا ﴾ (مريم:۵۲)

قوله: ﴿ وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسىٰ اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّالِمِيْنَ ﴾ (الشعراء:۱۰)

قوله: ﴿ وَنَادٰهُمَا رَبُّهُمَا اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ ﴾ (الاعراف:۲۲)

قوله: ﴿ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَا اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ (القصص:۶۵)

قوله: ﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللهِ ﴾ (التوبة:۶)

قوله: ﴿ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهُ مِنْ بَعْدِ مَاعَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ (البقرة:۷۵)

قوله: ﴿ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلَامَ اللهِ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللهُ مِنْ قَبْلُ ﴾ (الفتح:۱۵)

قوله: ﴿ وَاتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ لَامُبَدِّلَ لِکَلِمَاتِهٖ ﴾ (الکھف:۲۷)

قوله: ﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَقُصُّ عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اَکْثَرَ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴾ (النمل:۷۶)

۞ ۞ ۞

ان آیات کی تشریح

﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا ﴾ (النساء:۷۸)

ترجمہ:''اوراللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات کرنیوالا کون ہے''

......**شرح**......

''وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا '' یہ استفہامِ انکاری ہے جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات کہنے والا کوئی نہیں۔ بات سے مراد اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر خبر، امر، نہی، وعدہ وعیدوغیرہ ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلاً ﴾ (النساء:۱۲۲)

ترجمہ:''اورکون ہے جو اپنی بات میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا ہو''

......**شرح**......

''وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلاً''''القیل''''القول'' کی طرح''قال'' کا مصدر ہے۔یعنی قولاً اللہ تعالیٰ سے سچا کوئی نہیں۔ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کیلئے حدیث اور قول کا اثبات ہے۔جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ کلام ثابت اور برحق ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ﴾ (المائدۃ:۱۱۶)

ترجمہ''اوروہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے جب کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے عیسیٰ بن مریم''

......**شرح**......

''وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ''یعنی اس وقت کو یاد کریں۔''اذ قال الله ''جمہور مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ قول اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے روز ہوگا،اللہ تعالیٰ کا یہ قول ان عیسائیوں کیلئے بطور توبیخ ہے جنہوں نے عیسیٰ اوراس کی والدہ کی عبادت کی۔

سابقہ دوآیتوں کی طرح اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کیلئے''کــلام'' کا اثبات ہے۔اور یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے کلام فرمالیتا ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلاً ﴾ (الانعام:۱۱۵)

ترجمہ:''اورآپ کے رب کا کلام سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے''

......**شرح**......

''وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلاً ''یہاں الکلمۃ سے مراد کلام اللہ ہے ''صــدقــا ''یعنی اللہ تعالیٰ خبریں دینے میں سچا ہے''عـدلا ''یعنی اللہ تعالیٰ اپنے احکامات میں عادل ہے''صــدقــا وعــدلا ''تمیز واقع ہونے کی بناء پر منصوب ہیں۔اس آیت کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ کیلئے کلام کا اثبات ہے۔

﴿ وَکَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا ﴾ (النساء:۱۶۴)

ترجمہ:''اورموسیٰ (علیہ السلام) سے اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر کلام کیا''

شرح

"وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوسیٰ تَکْلِیمًا" یہ آیت موسیٰ علیہ السلام کے بہت بڑے شرف کی دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام فرمایا اور اپنا کلام انہیں سنایا، اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو الکلیم بھی کہا جاتا ہے۔ "تَکْلِیمًا" مصدر برائے تاکید ہے، جو اللہ تعالیٰ کے کلام کے مجازی ہونے کی تردید کررہا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کیلئے کلام کا اثبات ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمائی۔

۞ ۞ ۞

﴿ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ ﴾ (البقرۃ:۲۵۳)

ترجمہ: "ان (رسل) میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بات چیت کی ہے"

شرح

"مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ" یعنی بعض رسل سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمائی۔ "کَلَّمَ اللّٰہُ" سے مراد، انہیں بلاواسطہ اپنی کلام سنائی۔ یہاں موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کی طرف بھی جیسا کہ صحیح ابن حبان کی ایک حدیث سے ثابت ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام کا اثبات ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض رسولوں سے کلام فرمایا۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَلَمَّا جَاءَ مُوسىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ ﴾ (الاعراف:۱۴۳)

ترجمہ: "اور جب موسیٰ ہمارے وقت پر آئے اور ان کے رب نے ان سے کلام فرمائی"

شرح

"وَلَمَّا جَاءَ مُوسیٰ لِمِيقَاتِنَا" یعنی موسیٰ علیہ السلام اس وقت فی الواقع آگئے جس وقت آنے کا اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ لیا تھا۔ "وَکَلَّمَهُ رَبُّهُ" یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بلاواسطہ اپنی کلام سنائی۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ کلام کا اثبات ہے اور یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے کلام فرماتا ہے اور یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بلاواسطہ کلام فرمایا۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا ﴾ (مریم:۵۲)

ترجمہ: "ہم نے اسے طور کی دائیں جانب سے آواز دی اور راز گوئی کرتے ہوئے اسے قریب کرلیا"

شرح

"وَنَادَيْنَاهُ" "نداء" عربی لغت میں اونچی اور بلند آواز کو کہتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی موسیٰ علیہ السلام سے نداء مراد ہے۔ "مِنْ جَانِبِ الطُّورِ" "الطُّور" مصر اور مدین کے درمیان ایک پہاڑ ہے۔ "الأیمن" یعنی موسیٰ علیہ السلام کے دائیں جانب (سے نداء آئی)۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب موسیٰ علیہ السلام آگ کا انگارہ دیکھ کر آگ لینے کی نیت سے گئے تھے، یہاں دائیں جانب سے مراد پہاڑ کی دائیں جانب نہیں کیوں کہ پہاڑ کی دائیں یا بائیں جانب نہیں ہوتی۔

"وقربناہ" یعنی ہم نے اسے (موسیٰ) کو قریب کیا اور اس سے سرگوشی کے انداز میں کلام کی۔ مناجات، منادات کی ضد ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کیلئے کلام کا اثبات ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اونچی آواز اور آہستہ دونوں طرح کلام فرماتا ہے، کیونکہ منادات با آواز بلند ہوتی ہے اور مناجات با آواز پست۔

﴿ وَاِذْ نَادٰی رَبُّکَ مُوْسٰیٓ اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴾ (الشعراء:١٠)

ترجمہ: ''اور جب آپ کے رب نے موسیٰ کو آواز دی کہ ظالم قوم کے پاس جا''

شرح......

''وَاِذْ نَادٰی رَبُّکَ مُوْسٰی ''یعنی اس واقعہ کو تلاوت کریں یا ذکر کریں۔''اِذْ نَادٰی رَبُّکَ مُوْسٰی '' ''نداء بمعنی پکار کے ہے''ان ائت '' ''کلمہ''اَن'' کا یہاں پر مفسرہ اور مصدریہ ہونا دونوں درست ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نداء فرما کر ظالم قوم کی طرف جانے کا حکم دیا، یہ قوم فرعون ہے۔انہیں ظالم اس لئے کہا گیا: (١) انہوں نے کفر اختیار کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا

(٢) مختلف نافرمانیوں، جن میں بنی اسرائیل کو غلام بنانا اور ان کے بچوں کو ذبح کرنا شامل ہے کا ارتکاب کر کے دوسروں پر ظلم کیا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کیلئے کلام کا اثبات ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے نداء فرماتا ہے، اور جس سے چاہے کلام فرماتا ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَنَادٰهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ ﴾

ترجمہ ''اور ان کے رب نے ان کو پکارا کیا میں تم دونوں کو اس درخت سے ممانعت نہ کر چکا تھا'' (الاعراف:٢٢)

شرح......

''وَنَادٰهُمَا رَبُّهُمَا اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ ''یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم وحواء علیہما السلام کو یہ کہتے ہوئے آواز دی'' اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ ''یعنی کیا

میں نے تمہیں اس درخت کے کھانے سے روکا نہیں تھا؟ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان دونوں کیلئے عتاب وتوبیخ تھی کیونکہ جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں روکا تھا وہ اس سے نہیں رکے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کیلئے کلام کا اثبات ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آدم اور اس کی بیوی کو نداء دی۔

﴿ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ (القصص:٦٥)

ترجمہ ''اس دن انہیں بلا کر پوچھے گا کہ تم نے نبیوں کو کیا جواب دیا''

شرح......

''وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ ''یعنی اللہ تعالیٰ ان مشرکین کو قیامت کے دن نداء دے گا'' فَيَقُوْلُ '' یعنی کہے گا۔'' مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ''یعنی میرے رسولوں نے جب تمہیں میرا پیغام پہنچایا تو تم نے کیا جواب دیا تھا۔(یعنی ان کی اطاعت کی یا نہیں؟)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کیلئے کلام کا اثبات ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نداء دے گا۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ﴾

ترجمہ: ''اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دے دے، یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے'' (التوبۃ:٦)

شرح......

''وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ''یعنی وہ مشرکین جن سے آپ کو قتال کا حکم ہے'' اسْتَجَارَكَ ''یعنی اے محمد اگر ان میں سے کوئی آپ سے پناہ اور امان طلب کرے'' فَاَجِرْهُ '' یعنی آپ اسے پناہ وامان دے دیجئے'' حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ''یعنی تا کہ وہ آپ سے کلام اللہ کو سنے اور اس میں تدبر کرے، اور آپ کی دعوت کی حقیقت سے مطلع ہو جائے۔

یہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کیلئے کلام کے اثبات پر شاہد ہے،اور یہ کہ تلاوت ہونے والی چیز کلام اللہ ہے۔

❁ ❁ ❁

﴿ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴾ (البقرۃ:۷۶)

ترجمہ: ”حالانکہ ان میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو کلام اللہ کو سن کر، عقل و علم والے ہوتے ہوئے، پھر بھی بدل ڈالا کرتے ہیں“

شرح......

”وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ “ ”فریق“ اسم جمع ہے اس لفظ سے اس کا واحد نہیں ہے، مراد یہود ہیں ”يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللهِ “ یہاں کلام اللہ سے مراد توراۃ ہے۔”ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ “ یعنی اس کی باطل تاویلیں کرتے ہیں۔”مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ “ یعنی فہم کے باوجود توارۃ کی مخالفت کرتے ہیں۔”وَهُمْ يَعْلَمُونَ “ یعنی انہیں معلوم ہے کہ اس باطل تاویل وتحریف کے ذریعے وہ خطاً کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کیلئے کلام کا اثبات ہے اور یہ کہ توراۃ منجملہ کلام اللہ ہے، اور یہ کہ یہودیوں نے توراۃ میں تحریف وتبدیل کا ارتکاب کیا۔

❁ ❁ ❁

﴿ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللهِ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللهُ مِنْ قَبْلُ ﴾

ترجمہ: ”وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو بدل دیں آپ کہہ دیجئے! کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی فرما چکا ہے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چلو گے“ (الفتح:۱۵)

شرح......

”يُرِيدُونَ “ یہاں ان اعراب کا ذکر ہو رہا ہے جنہوں نے حدیبیہ کے سفر میں رسول اللہ ﷺ

کے ساتھ جانے کے بجائے اپنے اہل ومال میں رکنے کو ترجیح دی۔ان کی چاہت ہوگی ”أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللهِ “ یعنی کلام اللہ کے اس حصہ کو بدل دیں جس میں اہل حدیبیہ سے خصوصی طور پر خیبر کے مالِ غنیمت کا وعدہ کیا گیا۔

”قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا “ نفی بمعنی نہی ہے یعنی تم ہمارے ساتھ نہ چلو۔”كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللهُ مِنْ قَبْلُ “ یعنی اللہ تعالیٰ اہل حدیبیہ سے وعدہ کر چکا ہے کہ خیبر کا مالِ غنیمت خاص تمہارے لئے ہے۔

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کیلئے کلام اور قول کا اثبات ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے کلام وقول فرماتا ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کلام کو تبدیل کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اس پر عمل اور اسکی اتباع واجب ہے۔

❁ ❁ ❁

﴿ وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ﴾ (الکھف:۲۷)

ترجمہ: ”تیری جانب جو تیرے رب کی کتاب وحی کی گئی ہے اسے پڑھتا رہ، اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں“

شرح......

”وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ “ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے نبی (ﷺ) کو وحی شدہ کتاب کی مواظبت کے ساتھ تلاوت کرنے کا حکم دیا ہے۔وحی، جلدی اور مخفی طریقہ سے خبر دینے کو کہتے ہیں۔وحی کی متعدد کیفیات ہیں اور کتب اصولِ تفسیر میں مذکور ہیں ”مِنْ رَبِّكَ “ یہ نبی ﷺ کی طرف کی جانے والی وحی کا بیان ہے ”لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ “ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمات کو نہ کوئی تبدیل کر سکتا ہے نہ کوئی اس میں تحریف کر سکتا ہے اور نہ کوئی اسے زائل کر سکتا ہے۔

یہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کیلئے کلمات کے اثبات پر شاہد ہے۔

﴿ إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴾

ترجمہ: ''یقیناً یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے ان اکثر چیزوں کا بیان کر رہا ہے جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں'' (النمل:۷۶)

شرح......

'' بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ '' بنی اسرائیل جو کہ حاملین توراۃ وانجیل ہیں'' اَکْثَرَ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ '' جیسا کہ یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق باہم اختلاف رکھتے ہیں، یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر افتراء باندھا ہے اور نصاریٰ ان کے حق میں غلو کا شکار ہیں، جبکہ قرآن نے قولِ وسط جو کہ برحق ہے کو بیان کیا ہے، کہ عیسیٰ اللہ کا بندہ، اس کا رسول اور اس کا وہ کلمہ ہے جس کا اس نے مریم پر القاء فرمایا اور اس کی پھونک ہے۔

اس آیت سے شاہد یہ ہے کہ قرآن کلام اللہ ہے کیونکہ قرآن کتب سابقہ کو متضمن ہے اور اہل کتاب کے باہمی اختلاف میں حق کے ساتھ حکم لگاتا ہے اور یہ دونوں باتیں من عند اللہ ہی ہو سکتی ہیں۔

مؤلف رحمہ اللہ کی ذکر کردہ ان آیات کے مجموعے سے اللہ تعالیٰ کیلئے کلام کا اثبات ہو رہا ہے اور اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف بالکلام ہے، کتاب وسنت بھی اس پر دال ہیں۔ کلام، اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ذاتیہ میں سے ہے کیوں کہ صفتِ کلام اللہ کے ساتھ قائم ہے اور اللہ تعالیٰ صفتِ کلام کے ساتھ متصف ہے۔ نیز کلام، اللہ تعالیٰ کی صفاتِ فعلیہ میں سے بھی ہے جو اس کی مشیت اور قدرت کے ساتھ واقع ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے کلام فرماتا ہے۔

وہ ازل سے متکلم ہے اور ابد تک متکلم رہے گا، کیوں کہ وہ ازل سے کامل ہے اور ابد تک کامل رہیگا اور کلام صفات کمال میں سے ہے۔ اور اس لئے بھی کہ اللہ نے خود اپنی ذات کو صفتِ کلام سے متصف کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اللہ تعالیٰ کو اس صفت کے ساتھ متصف کیا ہے آگے جا کر اس مسئلہ میں مخالفین کے مذہب اور اس پر رد کا ذکر آئے گا (ان شاء اللہ)

۞ ۞ ۞

۲۲۔اثبات تنزیل القرآن من اللہ تعالیٰ

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا اثبات

قولہ: ﴿ وَهٰذَا كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ ﴾ (الانعام:۱۵۵)

قولہ: ﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ (الحشر:۲۱)

قولہ: ﴿ وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْا اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ. قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ. وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ (النحل:۱۰۱تا۱۰۳)

۞ ۞ ۞

ان آیات کی تشریح

﴿ وَهٰذَا كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ ﴾ (الانعام:۱۵۵)

ترجمہ ''اور یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے بھیجا بڑی خیر وبرکت والی''

...... **شرح**......

اللہ تعالیٰ کیلئے کلام کے اثبات، اور قرآن کے اللہ تعالیٰ کی کلام میں سے ہونے پر دلالت کرنیوالی آیات کے ذکر کے بعد اب مؤلف رحمہ اللہ نے ان آیات کو ذکر کرنا شروع کیا ہے جو قرآن کے منزل من عند اللہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ) ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ''وَهٰذَا'' یہ اشارہ قرآن کریم کی طرف ہے، اسم اشارہ ترکیب میں مبتداء ہے اور اس کی خبر'' كِتَابٌ '' ہے، جبکہ'' اَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ '' یہ دونوں'' كِتَابٌ '' کی

صفت ہیں، صفت ''انـــــزال'' کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کفار اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کا انکار کرتے تھے۔ ''الـمُبارک'' کا معنی کثیر البرکۃ ہے، کیوں کہ قرآن دینی اور دنیاوی دونوں طرح کے منافع پر مشتمل ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ ﴾

ترجمہ ''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو، تو دیکھتا کہ خوفِ الٰہی سے وہ پست ہوکر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا'' (الحشر:۲۱)

شرح

''وَلَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ'' یہ قرآن کی عظمت کا بیان ہے اور یہ کہ قرآن اس لائق ہے کہ قلوب اس کے آگے عاجز ہو جائیں، خشیت اور عاجزی کا اظہار کریں اس لئے کہ اگر اسے کسی پہاڑ پر نازل کیا جاتا اور اسے اس کی فہم حاصل ہوتی تو وہ پہاڑ اپنی انتہائی قوۃ اور صلابت کے باوجود اللہ کے خوف اور اس کی سزا کے ڈر سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔

تو اے انسان! تجھے یہ کیسے لائق ہے کہ تیرا دل نرم نہیں پڑتا اور ڈر محسوس نہیں کرتا، حالانکہ تم قرآن میں تدبر کے اللہ تعالیٰ کے فرامین کی سمجھ حاصل کر چکے ہو۔

۞ ۞ ۞

﴿ وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ وَّاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْا اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ اَکْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ. قُلْ نَزَّلَہٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّکَ بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ. وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُہٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْہِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴾ (النحل:۱۰۱تا۱۰۳)

ترجمہ: ''اور جب ہم کسی آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اسے وہ خوب جانتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ تو بہتان باز ہے، یہ بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں، کہہ دیجئے کہ اسے آپ کے رب کی طرف سے جبرائیل حق کے ساتھ لے کر آئے ہیں تا کہ ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے اور مسلمانوں کی راہنمائی اور بشارت ہو جائے ہمیں بخوبی علم ہے کہ یہ کافر کہتے ہیں کہ اسے تو ایک آدمی سکھاتا ہے اس کی زبان جس کی طرف یہ نسبت کر رہے ہیں عجمی ہے اور یہ قرآن تو صاف عربی زبان میں ہے''

شرح

''وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ'' یہاں سے اللہ تعالیٰ قرآن کے متعلق ایک کفریہ شبہ ذکر کر کے اس پر رد فرما رہا ہے۔ ''بَـدَّلْـنَا'' تبدیل کا معنی ہے ایک چیز اٹھا کر اس کی جگہ کوئی دوسری چیز رکھنا، اور تبدیل الآیۃ کا مطلب ہے ایک آیت کی جگہ دوسری آیت لانا یعنی ایک آیت کو دوسری آیت سے منسوخ کرنا ''قَالُوْا'' یعنی کفار قریش جو کہ حکمت نسخ سے جاہل تھے ''اِنَّمَا اَنْتَ'' یعنی اے محمد تو ''مُفْتَرٍ'' یعنی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ گھڑنے والا ہے، کیونکہ پہلے تو ایک بات کو اللہ تعالیٰ کا حکم قرار دیتا ہے لیکن کچھ عرصے بعد اس کے برخلاف بات کو اللہ کا حکم قرار دیتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کیا جس سے ان کی جہالت ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ''بَلْ اَکْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ'' یعنی انہیں سرے سے کسی بات کا علم ہی نہیں ہے، یا یہ کہ یہ لوگ نسخ میں پوشیدہ حکمت سے لاعلم ہیں، حالانکہ نسخ مبنی بر مصالح ہے جنہیں اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک مشروع چیز میں ایک خاص وقت تک کیلئے کوئی مصلحت ہوتی ہے پھر اس وقت کے گزرنے کے بعد مصلحت اس کے سوا دوسری چیز میں ہوتی ہے، جسے شریعت مشروع قرار دے دیتی ہے۔ حکمتِ نسخ پر پڑا ہوا پردہ اگر ہٹ جائے تو یہ کفار جان لیں گے کہ یہ بات مبنی بر صواب اور منہج عدل و رفق ہے۔

اس کے بعد ان کے اس زعم باطل کہ یہ تبدیلی محمد (ﷺ) کی طرف سے ہے، اور یہ کہ محمد (ﷺ) نے اس تبدیلی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر کے اللہ پر افتراء باندھا ہے، کا رد کرتے ہوئے فرمایا: ''قُلْ نَزَّلَهُ ''یعنی اس قرآن کو نازل کیا ہے۔''رُوحُ الْقُدُسِ ''یعنی جبرئیل۔ القدس بمعنی'' الطهر ''یعنی پاک ہے۔آیت کا معنی یوں ہوگا کہ پاک روح نے اس قرآن کو اُتارا۔یہ عبارت موصوف کی صفت کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے۔(یعنی''روح القدس'' بظاہر ترکیبِ اضافی ہے لیکن حقیقت میں ترکیبِ توصیفی ہے۔)''مِنْ رَّبِّکَ ''یعنی قرآن کی تنزیل کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی ہے۔'' بِالْحَقِّ ''یہ حال ہونے کی بناء پر محلاً منصوب ہے، یعنی یہ تنزیل متصف بالحق ہے۔

''لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا ''یعنی نزولِ قرآن اور پھر قرآن میں نسخ کے وجود کی حکمت یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو ایمان پر مزید پختہ کر دیا جائے، چنانچہ وہ نسخ کے وقت یہ کہتے ہیں: کہ ہر ناسخ و منسوخ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ پھر جب نسخ میں موجود مصلحتوں اور حکمتوں کا انہیں مزید علم ہوتا ہے تو وہ ایمان پر مزید ثابت قدمی اختیار کر لیتے ہیں۔

''وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ ''یہ دونوں''لِيُثَبِّتَ'' کے محل پر معطوف ہیں، معنی ہوگا کہ قرآن مؤمنوں کی تثبیت، ہدایت اور تبشیر کیلئے نازل ہوا ہے۔

کفار کے ایک شبہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:'' وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ''یعنی: ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ یہ کفار کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کو قرآن سکھانے والا کوئی فرشتہ نہیں ہے بلکہ بنی آدم میں سے کوئی بشر ہے، اور اس بشر نے توراۃ، انجیل اور دیگر عجمی کتب پڑھی ہوئی ہیں، کیونکہ محمد (ﷺ) تو ان پڑھ ہونے کی وجہ سے قرآن میں ذکر شدہ قرونِ اولیٰ کی اخبار کو تورات، انجیل اور دیگر عجمی کتب سے نقل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا:'' لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ ''یعنی جس بشر کے متعلق ان کا

زعم ہے کہ وہ محمد (ﷺ) کو قرآن سکھاتا ہے وہ تو اعجمی ہے (یعنی غیر عربی ہے) اور عربی کلام نہیں کر سکتا'' وَهَذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ''جب کہ یہ قرآن تو انتہائی بلیغ عربی اور واضح بیان پر مشتمل ہے۔ تو اے کافر! تم یہ کیسے زعم رکھتے ہو کہ کوئی عجمی بشر محمد (ﷺ) کو قرآن سکھاتا ہے۔ حالانکہ تم اہلِ لسان اور فصاحت و بلاغت کے شہسوار ہونے کے باوجود قرآن کے مثل یا کسی ایک سورت کے مثل کلام پیش کرنے سے عاجز ہو؟

ان آیاتِ کریمہ سے یہ امور مستفاد ہو رہے ہیں:

(۱) قرآن کے منزل من عند اللہ ہونے کا اثبات۔

(۲) اور یہ کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے کسی فرشتے یا بشر کا نہیں۔

(۳) قرآن کو مخلوق کہنے والوں کی تردید۔

نیز ان آیات میں اللہ تعالیٰ کیلئے علو (بلندی میں ہونا) کا اثبات بھی ہو رہا ہے کیونکہ انزال (اتارنا) بلندی سے ہی ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

۲۳۔اثبات رؤية المؤمنين لربهم يوم القيامة

قیامت کے دن اہل ایمان کا اپنے رب کو دیکھنے کا اثبات

قوله: ﴿ وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ . إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ (القیامۃ:۲۲،۲۳)

قوله: ﴿ عَلَى الْاَرَائِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴾ (المطففین:۳۵)

قوله: ﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ﴾ (یونس:۲۶)

قوله: ﴿ لَهُمْ مَايَشَاءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَامَزِيْدٌ ﴾ (ق:۳۵)

۞ ۞ ۞

ان آیات کی تشریح

﴿ وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ . إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾

ترجمہ: (اس روز بہت سے چہرے تروتازہ اور بارونق ہوں گے۔اپنے رب کی طرف دیکھتے ہونگے) (القیامۃ:۲۲،۲۳)

شرح

"وُجُوهٌ" یعنی وجوہ المؤمنین۔"يَّوْمَئِذٍ" یعنی قیامت کے دن۔"نَاضِرَةٌ" یہ کلمہ ضاد کے ساتھ ہے اور" اَلنَّضَارَة " سے مشتق ہے جس کا معنی خوبصورتی ورونق ہے۔یعنی اہل ایمان کے چہرے تروتازہ،خوبصورت اور چمکتے دمکتے ہوں گے۔" إِلٰى رَبِّهَا "یعنی: اپنے خالق کی طرف"نَاظِرَةٌ"یعنی اپنی آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھیں گے،جیسا کہ احادیثِ صحیحہ میں اس کی تفصیل موجود ہے،اور یہ احادیث درجہ تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں،صحابہ کرام،تابعین اور سلف صالحین کا اس مسئلہ میں اجماع ہے،اور ائمہ اسلام نے بھی اس مسئلہ میں اتفاق کیا ہے اس آیتِ کریمہ کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد،اہل ایمان کا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا اثبات ہے۔

﴿ عَلَى الْاَرَائِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴾ (المطففین:۳۵)

ترجمہ:"مسہریوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے"

شرح

"عَلَى الْاَرَائِكِ" "ارائک" " أريكة " کی جمع ہے یعنی تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔"يَنْظُرُوْنَ"یعنی اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔اس سے ماقبل آیت میں کفار کے متعلق فرمایا: ﴿ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوْبُوْنَ ﴾ یعنی یہ کفار قیامت کے دن اپنے رب سے اوٹ میں رکھے جائیں گے۔اس آیت کو بھی ذکر کرنے کا مقصد اہل ایمان کا اپنے رب کو دیکھنے کا اثبات ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ﴾ (یونس:۲۶)

ترجمہ:"جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے واسطے خوبی ہے اور مزید برآں بھی"

شرح

"لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا"یعنی جنہوں نے اعمالِ واجبات ادا کیئے اور معاصی سے اجتناب کیا۔"اَلْحُسْنٰى"یعنی ان کیلئے اچھی جزا ہے۔"اَلْحُسْنٰى" کا معنی جنت بھی کیا گیا ہے۔"وَزِيَادَةٌ" اس سے مراد اللہ رب العزت کے چہرہ کو دیکھنا ہے۔"زِيَادَةٌ" کی یہ تفسیر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے (صحیح مسلم وغیرہ) سلف صالحین نے بھی اس کی یہی تفسیر کی ہے۔

اسی تفسیر کے پیشِ نظر اس آیت کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد،اہل ایمان کا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا اثبات ہے۔

۞ ۞ ۞

﴿ لَهُمْ مَايَشَاءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَامَزِيْدٌ ﴾ (ق:۳۵)

ترجمہ:"وہاں جو چاہیں انہی کا ہے (بلکہ) ہمارے پاس اور بھی زیادہ ہے"

شرح

"لَهُم مَایَشَاءُ وْنَ فِیهَا" یعنی مؤمنین کیلئے جنت میں وہ تمام نعمتیں ہیں جن کا ان کا جی چاہے گا اور جن سے ان کی آنکھیں لذت محسوس کریں گی۔ "وَلَدَیْنَامَزِیْدٌ" یعنی ان نعمتوں کے علاوہ ایک اور مزید نعمت بھی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے چہرے کو دیکھنا ہے۔اس آیت سے شاہد بھی یہی ہے یعنی جنت میں اللہ تعالیٰ کے چہرے کو دیکھنے کا اثبات۔

مذکورہ آیات سے مستفاد امور:

(۱) اہل ایمان کا قیامت کے دن اپنے پروردگار کو دیکھنے کا اثبات۔

(۲) اہلِ جنت کو ملنے والی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کے چہرے کی زیارت ہے۔

صحابہ، تابعین اور ائمۃ المسلمین کا یہی موقف ہے، البتہ روافض، جہمیہ اور معتزلہ اس رؤیت کی نفی کرتے ہیں، ان کا یہ نظریہ کتاب وسنت، اجماع سلف اور اجماع ائمۃ المسلمین کے خلاف ہے، یہ لوگ انتہائی کمزور شبہات اور باطل تعلیلات پر اعتماد کرتے ہیں، جن میں چند ہم ذیل کی سطور میں پیش کررہے ہیں۔

(۱) کہتے ہیں: اثبات رؤیت سے اللہ تعالیٰ کا جہت میں ہونا لازم آتا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کیلئے جہت میں ہونا مان لیا جائے تو اس سے اس کا جسم ہونا لازم آتا ہے (جب کہ اللہ تعالیٰ جسم سے منزہ ہے)

الجواب: اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ لفظِ جہت مجمل ہے، اگر جہت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق میں سے کسی میں حلول کرچکا ہے، تو یہ باطل اور مردود ہے اور قطعی ادلہ اس کا رد کرتی ہیں۔اور اگر جہت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کے اوپر ہے تو یہ معنی تو اللہ تعالیٰ کیلئے ادلہ سے ثابت ہے، اور اس کی نفی کرنا باطل ہے، نیز اس کا جہتِ علو میں ہونا رؤیت

کے منافی بھی نہیں ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا فرمان: "لَنْ تَرَانِیْ" سے عدمِ رؤیت پر استدلال۔(یعنی جہمیہ وغیرہ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: "لَنْ تَرَانِیْ" سے بھی استدلال کیا ہے، یہ بات اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی کہ "تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔"

الجواب: اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ آیت میں رؤیة فی الدنیا کی نفی ہے، رؤیة فی الآخرة کی نفی نہیں، کیونکہ رؤیة فی الآخرة تو ادلہ سے ثابت ہے، نیز آخرت کا معاملہ دنیا کے معاملہ سے مختلف ہے (اس لئے ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا)

(۳) اللہ تعالیٰ کا فرمان: "لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ" (آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں) سے عدمِ رؤیت پر استدلال۔

الجواب: اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ آیت میں ادراک کی نفی ہے، رؤیت کی نفی نہیں، ادراک کا معنی احاطہ کرنا ہے، تو آیت کا صحیح معنی یہ ہے کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے مگر اس کا احاطہ نہ کرسکیں گے، اس معنی کی روشنی میں ادراک کی نفی سے وجودِ رؤیت لازم آرہا ہے۔(کیونکہ رؤیت ہے تبھی تو احاطہ کی نفی ہے، اگر رؤیت ہی نہیں تو احاطہ کی نفی چہ معنی دارد) گویا آیتِ کریمہ تو اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے اثبات کے دلائل میں سے ہے۔(واللہ اعلم)

مؤلف رحمہ اللہ آخر میں فرماتے ہیں "وهذا الباب فی کتاب الله کثیر ،ومن تدبر القرآن طالبا للهدی تبین له طریق الحق"

یعنی اثبات اسماء وصفات کا موضوع قرآن میں کثرت سے بیان ہوا ہے، البتہ ہم نے بقدرِ ضرورت چند مقامات کا ذکر کردیا ہے، جو ان آیات پر طلبِ ہدایت کی نیت سے غور وفکر کرے گا، حق اس پر واضح ہوجائے گا (ان شاء اللہ)

اور حقیقت بھی یہی ہے تلاوتِ قرآن سے اصل مقصود ومطلوب تدبر وتفکر (غور وفکر) ہے جیسا

کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ کِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ إِلَیْکَ مُبَارَکٌ لِیَدَّبَّرُوا آیَاتِهٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾

ترجمہ: ''یہ بابرکت کتاب جسے ہم نے آپ کی طرف اس لئے نازل فرمایا ہے کہ لوگ اس کی آیتوں پر غوروفکر کریں اور عقلمند اس سے نصیحت حاصل کریں'' (ص:۲۹)

نیز فرمایا: ﴿ أَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴾ (محمد:۲۴)

ترجمہ: ''قرآن میں غوروفکر نہیں کرتے؟ یا ان کے دلوں پر ان کے تالے لگ چکے ہیں''

نیز فرمایا: ﴿ أَفَلَمْ یَدَّبَّرُو االْقَوْلَ ﴾ (المؤمنون:۲۸)

ترجمہ: ''کیا انہوں نے اس بات پر غوروفکر نہیں کیا''

الاستدلال علی اثبات أسماء اللّٰه وصفاته من السنة

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے اثبات پر احادیث سے استدلال

فصل

ثم فی سنة رسول الله ﷺ. فالسنة تفسر القرآن وتبینه وتدل علیه وتعبر عنه.

ترجمہ: پھر وہ اسماء وصفات بھی اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہیں جو سنت میں وارد ہیں، کیونکہ سنت، قرآن کی تفسیر وتبیین ہے، قرآن پر دلالت کرتی ہے اور اس کی تعبیر ہے۔

۞ ۞ ۞

شرح

شیخ رحمہ اللہ قرآن مجید سے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے اثبات پر استدلال کرنے کے بعد سنتِ صحیحہ سے استدلال کر رہے ہیں، چنانچہ ''ثم فی سنة رسول الله ﷺ'' کا عطف ''وقد دخل فی هذه الجملة ما وصف الله به نفسه ......'' پر ہے۔ سنت سے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ سنت اصلِ ثانی ہے، کتاب اللہ کے بعد سنت کی طرف رجوع ایک امرِ واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ﴾ (النساء:۵۹)

ترجمہ: ''پس اگر تم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ''

اختلافی امور کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹانے کا معنی اللہ کی کتاب یعنی قرآن مجید کی طرف لوٹانا ہے، اور نبی ﷺ کی طرف لوٹانے کا معنی آپ کی سنت کی طرف لوٹانا ہے۔

سنت کا لغوی معنی ''طریقہ'' ہے جبکہ شرعی اصطلاح میں ہر وہ قول وفعل اور تقریر جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہو۔

مقامِ سنت:

سنت قرآن کی تفسیر ہے یعنی سنت قرآن مجید کے معانی اور مقاصد کو واضح کرتی ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿ وَاَنزَلْنَااِلَیکَ الذِّکْرَلِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیھِمْ ﴾ (النحل:۴۴)

ترجمہ: ''اور ہم نے آپ (ﷺ) کی طرف ذکر نازل کیا تا کہ آپ (ﷺ) لوگوں کیلئے اس چیز کی وضاحت کریں جو انکی طرف اتاری گئی''

سنت قرآن کی تبیین بھی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ سنت قرآن مجید کے مجمل احکام کی توضیح کرتی ہے، مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ، کیونکہ کہ قرآن مجید کے یہ اور اکثر احکام مجمل ہیں اور سنت ہی سے ان کی توضیح ہوتی ہے۔

نیز سنت انہی معانی و مطالب پر دلالت کرتی ہے جن پر قرآن دلالت کرتا ہے اور انہی معانی و مطالب کی تعبیر ہے جن کی قرآن تعبیر ہے چنانچہ سنت قرآن کی موافقت کرتی ہے، لہذا کتاب وسنت کے دلائل سے ہی حکم ماٗخوذ ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مسئلہ ہے۔

❁ ❁ ❁

وما وصف الرسول به ربه عزوجل من الاحاديث الصحاح التى تلقاها اهل المعرفة بالقبول وجب الايمان بها كذلك .

احادیثِ صحیحہ جنہیں اہل علم نے قبول کیا ہے، میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان فرمائیں، پر ایمان لانا اس طرح واجب ہے جس طرح ان صفات پر ایمان لانا واجب ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی ذات کیلئے بیان فرمایا ہے

...... شرح ......

رسول اللہ ﷺ نے اپنی احادیث میں اللہ تعالیٰ کیلئے جن صفات کا اثبات فرمایا ہے ان پر ایمان لانا واجب ہے جس طرح ان صفات پر ایمان لانا واجب ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کیلئے قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان درحقیقت وحی الٰہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ﴾ (النجم:۳،۴)

ترجمہ ''آپ اپنی خواہش سے گفتگو نہیں فرماتے، آپ (ﷺ) کی گفتگو محض وحی ہوتی ہے''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ ﴾

ترجمہ ''اور اللہ نے آپ (ﷺ) پر کتاب وحکمت کو نازل فرمایا''

اس آیت کریمہ میں کتاب سے مراد قرآن، اور حکمت سے مراد سنت ہے، لہذا قرآن کی طرح سنت میں وارد احکامات کو ماننا بھی واجب ہے، خاصکر اعتقادی مسائل (کیونکہ یہ تو اصل دین ہیں) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَاآتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَانَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ﴾ (الحشر:۷)

ترجمہ: ''اور جو کچھ تمہیں رسول نے دیا اس کو لے لو اور جس سے انہوں نے روک دیا اس سے رک جاؤ''

البتہ قبولِ حدیث کیلئے ضروری ہے کہ وہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو، اس لئے شیخ رحمہ اللہ نے الاحادیث الصحاح (یعنی صحیح احادیث) کا لفظ استعمال کیا ہے۔

محدثین کے نزدیک حدیثِ صحیح وہ ہے جس میں درج ذیل پانچ شروط جمع ہوں:

(۱) تمام راوی عادل ہوں۔

(۲) تمام راوی ضابط ہوں۔

(۳) سند متصل ہو۔

(۴) کوئی علتِ قادحہ بھی نہ ہو۔

(۵) حدیث شاذ بھی نہ ہو۔

شیخ رحمہ اللہ نے احادیث کیلئے شرط لگائی ہے کہ انہیں اہل المعرفۃ نے قبول کیا ہو، اہل المعرفۃ سے مراد حدیث کا علم رکھنے والے ہیں، کیونکہ حدیث کے متعلق انہیں کے حکم کا اعتبار کیا جائے گا دیگر لوگوں کا نہیں۔

آگے شیخ رحمہ اللہ سنت میں وارد بعض صفات کا ذکر کررہے ہیں۔

۱.ثبوت النزول الالٰھی إلی سماء الدنیا علی مایلیق بجلال اللہ

اللہ تعالیٰ کے آسمان کی طرف نزول، جیسا کہ اس کی شان جلال کے مطابق ہے، کا اثبات

فمن ذلک مثل قوله ﷺ: [ینزل ربنا الی سماء الدنیا کل لیلة حین یبقی ثلث اللیل الآخر فیقول من یدعونی فاستجیب له من یسألنی فأعطیه من یستغفرنی فأغفر له] (متفق علیہ)

❁ ❁ ❁

حدیث کی تشریح

[ینزل ربنا الی سماء الدنیا کل لیلة حین یبقی ثلث اللیل الآخر فیقول من یدعونی فاستجیب له من یسألنی فأعطیه من یستغفرنی فأغفر له]

[جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو ہمارا پروردگار آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے، اور آواز دیتا ہے: کوئی ہے جو مجھے پکارے تاکہ میں اس کی پکار قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے بخشش طلب کرے تاکہ میں اسے بخش دوں؟]

......**شرح**......

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے نزول سے مراد، ایسا نزول ہے جو اس کی عظمت وجلال کے لائق ہے، ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس نزول کو مخلوق کے نزول جیسا قرار نہیں دیتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (اس جیسی کوئی چیز نہیں)

اللہ تعالیٰ کے اس نزول کا وقت بھی متعین ہے اور وہ جب رات کی آخری تہائی باقی رہ جائے۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ نزول کا اثبات ہے۔ نزول، اللہ تعالیٰ کی صفاتِ افعال میں سے ہے، نیز اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ علو (بلندی میں ہونا) کا اثبات بھی ہے، کیونکہ نزول علو یعنی بلندی کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔

اس حدیث میں ان لوگوں پر رد بھی ہو رہا ہے جو اس حدیث کی تاویل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزول سے اس کی رحمت یا امر کا نزول مراد ہے۔ کیونکہ اصل یہ ہے کہ کلام کو حقیقت پر محمول کیا جائے اور کلام میں حذف نہ مانا جائے، پھر آپ ﷺ کے یہ الفاظ بھی قابلِ غور ہیں "من یدعونی فاستجیب لہ" [کون ہے جو مجھے پکارے تاکہ میں اس کی پکار کو قبول کروں] کیونکہ یہ بات خلافِ عقل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت یا اس کا امر یہ کلام کرے۔

اس حدیث سے اللہ تعالیٰ کی صفت "الکلام" کا بھی اثبات ہو رہا ہے، لفظ "فیقول......" پس وہ فرماتا ہے...... قابلِ غور ہے۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کیلئے صفات "اعطاء" (دینا) "الاجابۃ" (قبول فرمانا) اور "المغفرۃ" (معاف کرنا) کا بھی اثبات ہے، اور یہ تمام صفاتِ افعال ہیں۔

۲. اثبات ان اللہ یفرح ویضحک

اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ فرح (خوش ہونا) اور صفتِ ضحک (ہنسنا) کا اثبات

وقولہ ﷺ : للہ اشد فرحا بتوبۃ عبدہ من احدکم براحلتہ]

وقولہ ﷺ :یضحک اللہ إلی رجلین یقتل أحدھما الآخر، کلاھما یدخل الجنۃ] (متفق علیہ)

احادیث کی تشریح

[للہ اشد فرحا بتوبۃ عبدہ من احدکم براحلتہ]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: [اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی توبہ سے اس شخص کی بنسبت زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنی سواری پر تھا...... الحدیث] (متفق علیہ)

...... شرح ......

"الفرح" کا لغوی معنی سرور اور لذتِ قلب ہے۔ "التوبۃ" سے مراد گناہ سے کنارہ کشی اختیار کر کے عملِ اطاعت کی طرف رجوع کر لینا۔ "الراحلۃ" اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جو سواری کے قابل ہو۔

مصنف رحمہ اللہ نے پوری حدیث نقل نہیں کی صرف اس حصہ کو نقل کرنے پر اقتصار کیا ہے جو صفت "الفرح" پر شاہد ہے۔

صفت "الفرح" اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہے، جیسا کہ اس کی عظمت وجلالت کے لائق ہے، یہ صفت، صفتِ کمال ہے، مخلوقات میں سے کسی کی صفت اللہ تعالیٰ کی خوشی کے مشابہ نہیں ہوسکتی بلکہ تمام صفات کی طرح صفتِ "الفرح" بھی تشبیہ مخلوقات سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوش ہونا،

احسان، حسنِ سلوک اور لطف وکرم کی متقاضی ہے، نیز اللہ تعالیٰ کا خوش ہونا بندے کی توبہ کے ساتھ مخصوص ومحتاج نہیں ہے، کہ بندہ کے توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہونے کا انتفاع کرلے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ اطاعت کرنے والوں کی اطاعت سے اس کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا جیسا کہ معصیت کرنے والوں کی معصیت سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

❁ ❁ ❁

[یضحک الله إلى رجلين يقتل أحدهما الآخر، كلاهما يدخل الجنة]

نبی ﷺ کا فرمان ہے:[اللہ تعالیٰ ان دو آدمیوں کی طرف (دیکھ کر) ہنستا ہے جن میں سے ایک دوسرے کو قتل کرتا ہے، پھر دونوں ہی جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔](متفق علیہ)

شرح

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی صفت، صفتِ ''ضحک'' (ہنسنا) کا اثبات ہے، جس کے آخر میں نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ضحک کی علت بیان فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ مقتول اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتے لڑتے شہید ہو جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ قاتل کو توبہ کی توفیق نصیب فرماتا ہے چنانچہ وہ اسلام قبول کر لیتا ہے، اور پھر اللہ کی راہ میں لڑتے لڑتے وہ بھی شہید ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کمالِ احسان اور وسعتِ رحمت کا یہ عظیم مظہر ہے کہ ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتا ہے اور کوئی کافر اسے قتل کر دیتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ اس مسلمان کو شہادت کی سعادت عطا فرما دیتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کافر قاتل پر احسان فرماتا ہے اور اسے اسلام کی ہدایت عطا فرما دیتا ہے نتیجۃً دونوں (قاتل ومقتول) اکٹھے جنت میں داخل ہو جاتے ہیں، اس طرح قاتل ومقتول دونوں کا جنت میں داخل ہونا ایک عجیب سی بات ہے اور ان امور سے ہنسی آ جاتی ہے جو تعجب خیز ہوں اور عام معمول سے ہٹ کر ہوں۔

حدیث سے شاہد: اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کیلئے صفت ''الضحک'' (ہنسنا) کا اثبات ہو رہا

ہے، ''الضحک'' اللہ تعالیٰ کی صفاتِ فعلیہ میں سے ہے، ہم اسے اللہ تعالیٰ کیلئے اس طرح ثابت کرتے ہیں جیسا اس کی عظمت وجلالت کے لائق ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ صفت مخلوق کی صفت کے مشابہ نہیں۔

۳. اثبات ان اللہ یعجب ویضحک

اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ تعجب وضحک کا اثبات

وقولہ :[عجب ربنا من قنوط عباده وقرب غِيَرِه ينظر إليكم أَزِلِينَ قَنِطِينَ فيظل يضحك يعلم أن فرجكم قريب](حديث حسن)

حدیث کی تشریح

[عجب ربنا من قنوط عباده وقرب غِيَرِه ينظر إليكم أَزِلِينَ قَنِطِينَ فيظل يضحك يعلم أن فرجكم قريب]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:[ہمارا رب اپنے بندوں کے مایوس ہونے اور اپنی طرف سے ان کی فراخی کے قریب ہونے پر تعجب فرماتا ہے، وہ بندوں کی طرف دیکھتا ہے کہ وہ تنگی و مایوسی کا شکار ہیں تو اللہ رب العزت ہنستا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تمہاری فراخی (کے دن) قریب آچکے ہیں]

(احمد: (۴/۱۱) ابن ماجہ (۱۸۱) الطیالسی (۱۰۹۲) سند ضعیف ہے لیکن حدیث کا شاہد موجود ہے جس بناء پر مصنف نے اسے حسن کہا ہے دیکھیئے سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ (۲۸۱۰)

......**شرح**......

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات ''الضحک'' (ہنسنا) اور ''العجب'' (تعجب کرنا) کا اثبات ہے۔ تعجب کا معنی بیان کرتے ہوئے ''المصباح'' کے مؤلف فرماتے ہیں: کہ تعجب دو طرح سے مستعمل ہیں (۱) قابلِ تعریف فعل پر تعجب۔ اس صورت میں تعجب کرنے سے مراد اس کام کو پسند کرنا اور کام کرنے والے سے اپنی رضا کی خبر دینا ہے۔ (۲) ناپسندیدہ کام پر تعجب۔

اس صورت میں تعجب سے مراد اس کام کا انکار و مذمت ہے۔

حدیث میں بندوں کی جس مایوسی کا ذکر ہے اس سے مراد بارش سے اور مسلسل قحط سالی سے مایوسی ہے۔

یہ دونوں صفات، صفاتِ فعلیہ ہیں، اللہ تعالیٰ کیلئے جس طرح اس کے لائقِ شان ہے، ثابت ہیں، مخلوق کی صفات کے مشابہ نہیں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا تعجب فرمانا مخلوق کے تعجب جیسا نہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ہنسنا مخلوق کے ہنسنے جیسا نہیں۔ (کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت میں کوئی مخلوق کسی بھی طرح کی مشابہت نہیں رکھتی۔)

حدیث میں اللہ تعالیٰ کیلئے صفت ''النظر'' (دیکھنا) کا بھی اثبات ہو رہا ہے۔ یہ صفت بھی صفاتِ فعلیہ میں سے ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی طرف دیکھتا ہے، اس پر زمین و آسمان کی کوئی چیز مخفی نہیں۔

۴.اثبات الرِجل والقدم للہ سبحانہ

اللہ تعالیٰ کیلئے صفت ''اَلرِّجل'' اور ''القدم'' کا اثبات

وقولہ ﷺ: [لاتزال جهنم يلقى فيها وهي تقول :هل من مزيد حتى يضع رب العزة فيها رجله .وفي رواية عليها قدمه فينزوى بعضها إلى بعض فتقول قط قط](متفق عليه)

حدیث کی تشریح

[لاتزال جهنم يلقى فيها وهي تقول :هل من مزيد حتى يضع رب العزة فيها رجله .وفي رواية عليها قدمه فينزوى بعضها إلى بعض فتقول قط قط]

ترجمہ: نبی ﷺ کا فرمان ہے:[جہنم میں جہنمیوں کو مسلسل ڈالا جاتا رہے گا اور وہ کہے گی کیا مزید ہے؟ یہاں تک کہ اللہ رب العزت اس میں اپنا پاؤں اور بعض روایت میں ہے کہ اپنا قدم رکھے گا جس سے جہنم سکڑنے لگے گی اور کہے گی: بس بس۔] (بخاری ومسلم)

شرح......

جہنم، قیامت کی آگ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، بہت زیادہ گہرا ہونے کی وجہ سے اس کا نام جہنم رکھا گیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تاریک ہونے کی وجہ سے اسے جہنم کہا گیا ہے، کیونکہ اس صورت میں ''الجہومۃ'' سے مأخوذ ہے، جس کا معنی ظلمت اور تاریکی ہے۔

جہنم کا یہ مطالبہ کہ مزید لوگ ڈالے جائیں، اس کی وسعت اور گہرائی پر دلالت کرتا ہے، اور کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے بھرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قدم کا جہنم میں رکھنے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم سے وعدہ کیا کہ وہ اسے بھرے گا لیکن اس کی وسعت اور گہرائی کی وجہ سے وہ بھرے گی نہیں اور مسلسل مزید کا تقاضا کرے گی، کیوں کہ اللہ تعالیٰ عدل والا ہے بغیر جرم کے کسی کو جہنم میں ڈالنا اس کے عدل کے خلاف ہے چنانچہ اپنا عہد پورا کرتے ہوئے اپنے قدم مبارک کو اس میں رکھے گا۔

اللہ تعالیٰ کے قدم رکھنے سے جہنم کے کنارے سکڑ کر آپس میں ملنے لگے گے اور جہنم میں صرف وہی لوگ رہیں گے جو اس کے مستحق ہیں۔حتی کہ جہنم خود ہی کہنے لگے گی: بس کردیا جائے، اتنے ہی لوگ کافی ہیں۔

حدیث سے شاہد: اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کیلئے قدم کا اثبات ہے، قدم اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہے جیسا کہ اس کے لائقِ شان ہے۔اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ ذاتیہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا چہرہ اور ہاتھ۔

معطلہ اس حدیث کی تفسیر میں بھی الحاد کا شکار ہوگئے، چنانچہ انہوں نے ''قدم'' کا معنی ایک طرح کی مخلوق کیا ہے اور ''رِجْل'' سے مراد لوگوں کی جماعت لیتے ہیں۔

معطلہ کی یہ تفسیر سراسر غلط اور باطل ہے کیونکہ نبی ﷺ نے قدم رکھنے کا ذکر کیا ہے قدم ڈالنے کا نہیں، جس طرح کہ حدیث کے شروع میں جہنمیوں کے جہنم میں ڈالنے ذکر کیا ہے۔

پھر لفظ ''القدم'' کی تفسیر ''القوم'' (لوگوں کی جماعت) سے کرنا درست نہیں ہے کیونکہ ''القدم'' کا معنی ''القوم'' نہ حقیقی معنی ہے اور نہ ہی مجازی معنی۔

٥. اثبات النداء والصوت والکلام للہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کیلئے صفات: ''النداء'' (پکارنا)

''الصوت'' (آواز) اور ''الکلام'' کا اثبات

وقولہ ﷺ : یقول اللہ تعالیٰ :یا آدم، فیقول :لبیک وسعدیک، فینادی بصوت إن اللہ یأمرک أن تخرج من ذریتک بعثاً إلی النار] (متفق علیہ)

وقولہ:[مامنکم من أحد إلا سیکلمه ربه ولیس بینه وبینه ترجمان]

❁ ❁ ❁

احادیث کی تشریح

[یقول اللہ تعالیٰ :یا آدم، فیقول :لبیک وسعدیک، فینادی بصوت إن اللہ یأمرک أن تخرج من ذریتک بعثاً إلی النار]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:[اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے آدم! آدم علیہ السلام کہیں گے: لبیک وسعدیک۔ اللہ تعالیٰ آواز کے ساتھ نداء فرمائے گا: اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ اپنی ذریت میں سے بعث النار (جہنمی گروہ) الگ کرلیں]

......شرح......

''لبیک'' کا معنی ہے کہ میں تیری اطاعت وفرمانبرداری پر قائم ہوں ''سعدیک'' لبیک کی تاکید ہے، اس کا معنی ہے کہ میں تیری اطاعت پر بار بار مستعد وکمربستہ ہوں۔

''ینادی بصوت'' (اللہ تعالیٰ آواز کے ساتھ نداء دے گا) اس جملہ میں صوت ''ینادی'' کی تاکید ہے، کیونکہ نداء آواز کے ساتھ ہی ہوتی ہے، جس طرح کہ ''کلم اللہ موسی تکلیما'' (کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمائی) اس آیت میں ''تکلیما'' ''کلم'' کی تاکید

ہے معنی یہ کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے فرمائے گا کہ جہنمیوں کو جنتیوں سے الگ کرلے۔

حدیث سے شاہد: یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کیلئے کلام کرنے اور آواز کے ساتھ نداء فرمانے کا اثبات ہے۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے جس کلام اور نداء کا ذکر ہے یہ قیامت کے دن ہوگا، جس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے کلام فرماتا ہے اور نداء دیتا ہے۔

❁ ❁ ❁

[مامنکم من أحد إلا سیکلمه ربه ولیس بینه وبینه ترجمان]

......شرح......

اس حدیث کے مخاطب اگرچہ صحابہ کرام تھے، لیکن مراد جملہ مؤمنین ہیں۔

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہر مؤمن سے بلاواسطہ بغیر کسی ترجمان کے کلام فرمائے گا۔ ترجمان اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ایک لغت سے دوسری لغت کی طرف کلام کو منتقل کرے۔

حدیث سے شاہد: یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا بندوں سے کلام کرنے کا اثبات ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے کلام فرماتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا کلام فرمانا، اللہ تعالیٰ کی صفاتِ فعلیہ میں سے ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہر مؤمن سے خطاب فرمائے گا۔

٦. اثبات علو الله على خلقه واستوائه على عرشه

اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوق کے اوپر ہونے

اور عرش پر مستوی ہونے کا اثبات

وقوله فی رقية المريض: [ربنا الله الذی فی السماء ،تقدس اسمک،أمرک فی السماء والارض كما رحمتک فی السماء. اجعل رحمتک فی الارض .اغفرلنا حوبنا وخطايانا .أنت رب الطيبين أنزل رحمة من رحمتک وشفاء من شفا ئک على هذا الوجع فيبرأ]

(حدیث حسن رواہ ابوداؤد وغیرہ)

وقوله :[ألا تأمنونی وأنا أمين من فی السماء] (بخاری ومسلم)

وقوله: [والعرش فوق ذلک ،والله فوق العرش وهو يعلم ما أنتم عليه]

وقوله :للجارية [أين الله؟ قالت: فی السماء ،قال :من أنا؟قالت :انت رسول الله .قال :اعتقها فإنها مؤمنة]

احادیث کی تشریح

[ربنا الله الذی فی السماء ،تقدس اسمک،أمرک فی السماء والارض كما رحمتک فی السماء اجعل رحمتک فی الارض .اغفرلنا حوبنا وخطايانا .أنت رب الطيبين أنزل رحمة من رحمتک وشفاء من شفا ئک على هذا الوجع فيبرأ]

ترجمہ: آپ ﷺ نے مریض کیلئے یہ دم سکھلایا ’’اے ہمارے رب جو کہ آسمان میں ہے، تیرا نام پاک ہے، آسمان وزمین میں تیرا امر ہے جس طرح آسمان میں تیری رحمت ہے اسی طرح زمین میں اپنی رحمت نازل فرما، ہمارے بڑے اور چھوٹے سب گناہ معاف فرمادے ،تو نیک لوگوں کا رب ہے، اس تکلیف پر اپنی رحمت وشفاء کا کچھ حصہ نازل فرما، اس دم سے مریض شفایاب ہوجائے گا‘‘

(ابوداؤد(٣٨٩٢) عمل اليوم والليلة للنسائی (١٠٣٧) حاکم (٣٤٤/١))

شرح

اس حدیث سے مریض پر دم کرنے کی مشروعیت ثابت ہورہی ہے بشرطیکہ وہ دم قرآن اور جائز ادعیہ پر مشتمل ہو، لیکن اگر وہ دم شرکیہ اعمال والفاظ پر مشتمل ہوتو پھر ممنوع ہے۔

اللہ تعالیٰ کے آسمان میں ہونے کا معنی آسمان کے اوپر ہونا ہے ’’فی‘‘ ’’بمعنیٰ‘‘علی‘‘ ہے۔

جیسا کہ آیت کریمہ ﴿ فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ ﴾ (التوبۃ:٢٠)

ترجمہ: ’’تم زمین پر چلو پھرو‘‘

میں ’’فی‘‘ ’’بمعنیٰ‘‘علی‘‘ ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ ’’فی‘‘ اپنے اصل معنی یعنی ظرف کیلئے ہو اس صورت میں ’’السماء‘‘ مطلق علو کے معنی میں ہوگا (پھر ترجمہ یوں ہوگا: ہمارا رب جو بلندی میں ہے)

’’تقدس اسمک‘‘: اللہ تعالیٰ کے ناموں کے پاک ہونے کا مطلب ہے اس کے نام ہر قسم کے نقص سے پاک ہیں۔لفظ’’اسم‘‘ مفرد ہے اور ضمیر مخاطب کی طرف مضاف ہے، اس طرح اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے تمام نام ہونگے۔آسمان وزمین میں اللہ تعالیٰ کے ’’امر‘‘ سے مراد امرِ کونی وقدری اور امرِ شرعی ہے۔امرِ کونی وقدری سے ہی جمیع مخلوقات وحوادث معرضِ وجود میں آتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا درج ذیل فرمان اسی قبیل سے ہے:

﴿ اِنَّمَا اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ (یٰس:۸۲)

ترجمہ: ''اور جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے اتنا فرما دینا (کافی ہے) کہ ہوجا، وہ اسی وقت ہو جاتی ہے''

جبکہ امرِ شرعی سے مراد وہ امر ہے جو ان شرائع کو متضمن ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے مقرر فرمایا ہے۔

''کما رحمتک فی السماء اجعل رحمتک فی الارض'' ''جس طرح آسمان میں تیری رحمت ہے زمین میں بھی رحمت نازل فرما'' ان الفاظ میں رحمتِ الٰہی کو اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ بنایا گیا ہے، یعنی جس طرح تیری رحمت جمیع اہل السموات کو شامل ہے اسی طرح اہل الارض کو بھی اپنی رحمت کا کچھ حصہ عطا فرما

''اغفرلنا حوبنا و خطایانا'' اللہ تعالیٰ سے مغفرت (بخشش) طلب ہو رہی ہے۔ طلبِ مغفرت سے مراد، اللہ تعالیٰ سے گناہوں کو چھپا دینے اور مزید گناہوں سے بچانے کی استدعاء کرنا ہے۔ اسی سے لفظ ''المغفر'' ہے جو ''خود'' کے معنی میں ہے۔ (لوہے کا خود جو مجاہد دورانِ جنگ اپنے سر پر رکھتا ہے تاکہ سر پردے میں ہو کر چھپ جائے اور دشمن کی ضرب سے محفوظ رہے۔)

''انت رب الطیبین'' ''طیبین'' ''طیب'' کی جمع ہے یعنی انبیاءِ کرام اور ان کے پیروکار ''رب'' کی اضافت تشریف و تکریم کیلئے ہے، وگرنہ اللہ تعالیٰ تو ہر شئی کا رب و مالک ہے، اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کو وسیلہ بنایا گیا ہے۔

''انزل رحمۃ من رحمتک'' اس جملہ میں رحمت جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے کی طلب مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت دو قسم کی ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی وہ رحمت جو اس کی صفات میں سے ایک صفت ہے، جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مذکور ہے۔

﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ (اعراف:۱۵۶)

ترجمہ ''اور میری رحمت تمام اشیاء پر محیط ہے''

(۲) اللہ تعالیٰ کی وہ رحمت جو اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح منسوب کی جاتی ہے جیسے مخلوق کی خالق کی طرف۔

اس اعتبار سے اس حدیث میں رحمت کی دوسری قسم یعنی رحمتِ مخلوقہ مراد ہے، صحیح مسلم کی حدیث ''خلق اللہ مائۃ رحمۃ'' (یعنی اللہ تعالیٰ نے سو رحمتیں پیدا فرمائیں) میں رحمتِ مخلوقہ ہی مراد ہے۔ اس دعا میں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے مریض پر رحمت مخلوقہ کے انزال کی استدعا کی ہے تاکہ اس رحمت کے ذریعے مریض شفایاب ہو جائے۔

شاہد حدیث: اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کیلئے علو کا اثبات ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں پر ہے۔ اور علو، اللہ تعالیٰ کی صفتِ ذاتیہ ہے۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت الوہیت قدسیت، اس کے علو، امر اور رحمت کو وسیلہ بنایا گیا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور شفاء طلب کی گئی ہے۔

❁ ❁ ❁

[ألا تأمنوني وأنا أمين من في السماء]

ترجمہ: [کیا تم مجھے امین نہیں سمجھتے حالانکہ میں تو اس ذات کی طرف سے امین ہوں جو آسمانوں پر ہے] (بخاری ومسلم)

شرح......

مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقعہ پر کسی نے آپ ﷺ کی تقسیم پر اعتراض کیا تو اس موقعہ پر آپ نے فرمایا: ألا تأمنوني ....

"من فی السماء" سے اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے۔"امین" اللہ تعالیٰ نے جسے اپنی وحی، رسالت اور اپنی شریعت کی تبلیغ پر امین بنایا ہے، اور یہ ذمہ داری گویا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کی امانت اور صداقت کی گواہی ہے،" و کفی باللہ شھیدا" اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔

شاہد حدیث: اس حدیث میں لفظ "من فی السماء" سے اللہ تعالیٰ کیلئے علو کا اثبات ہو رہا ہے۔

۞ ۞ ۞

[والعرش فوق ذلک ،واللہ فوق العرش وھو یعلم ما أنتم علیه]

ترجمہ: [اور اس کے اوپر عرش ہے (یعنی ساتوں آسمانوں کے اوپر) اور اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے اور وہ تمہارے حالات کو بخوبی جانتا ہے]

(یہ روایت حسن ہے اسے ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے)

شرح

یہ حدیث کا آخری حصہ ہے، ابتداءِ حدیث میں آسمان اور زمین کے درمیان، اور ساتوں آسمانوں کے ایک دوسرے کے درمیان کتنا فاصلہ ہے، کا ذکر کیا گیا ہے، اس طرح ہر آسمان کی کثافت، سمندر جو کہ ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے، کی کثافت کا ذکر کیا گیا ہے، سمندر کے اوپر جو آٹھ عظیم اوعال ہیں کا ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد حدیث کے الفاظ ہیں "والعرش فوق ذلک" یعنی مذکورہ تمام مخلوقات کے اوپر عرش ہے، اور اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر مستوی ہے ایسا استواء جو اس کے لائقِ شان ہے۔

"واللہ یعلم ماانتم علیه" کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر شئی کو محیط ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں، اس لیئے ساری مخلوقات کے اوپر عرش پر مستوی ہونے کے باوجود انسانوں کے احوال سے پوری طرح آگاہ اور باخبر ہے۔

شاہد حدیث: اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کیلئے علو کا اثبات ہے۔ (کیونکہ اللہ تعالیٰ عرش پر

مستوی ہے اور عرش تمام مخلوقات کے اوپر ہے) اور اس حدیث میں اس بات کا بھی اثبات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کا بایں طور احاطہ کئے ہوئے ہے کہ اس پر ان کے اعمال میں سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

۞ ۞ ۞

[أین اللہ؟ قالت: فی السماء ،قال :من أنا؟قالت :انت رسول اللہ .قال: اعتقھا فإنھا مؤمنة]

ترجمہ: [آپ ﷺ نے ایک لونڈی سے فرمایا: اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا: آسمان میں، آپ ﷺ نے پوچھا: میں کون ہوں؟ اس نے کہا: آپ اللہ کے رسول ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: اسے آزاد کردو کیونکہ یہ مؤمنہ ہے] (مسلم)

شرح

پوری حدیث اس طرح ہے کہ معاویہ بن الحکم نے اپنی کسی لونڈی کو کسی بات ناراض ہوکر طمانچہ ماردیا، پھر نادم ہوکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ کی خبر دی اور ساتھ ہی کہا کہ کیا میں اسے آزاد کردوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے، پہلے اسے میرے پاس لے آؤ، چنانچہ وہ (معاویہ بن الحکم) لونڈی کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آئے تو آپ ﷺ نے لونڈی سے دریافت فرمایا: "أین اللہ؟" اللہ کہاں ہے؟ لونڈی نے جواب دیا "فی السماء": یعنی اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے۔ پھر آپ ﷺ نے لونڈی سے اپنے متعلق سوال کیا کہ میں کون ہوں؟ لونڈی نے آپ ﷺ کے رسول ہونے کی شہادت دی تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے آزاد کردو یہ مؤمنہ ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق سوال کرنا کہ "وہ کہاں ہے" جائز ہے۔ اس حدیث میں اس بات کی بھی دلیل موجود ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے علو میں ہونے اور جناب محمد ﷺ

کے رسول ہونے کی گواہی دے وہ مؤمن ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہورہا ہے کہ لونڈی یا غلام کو آزاد کرنے کیلئے ان کا مؤمن ہونا شرط ہے۔

شاہد حدیث: یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوقات کے اوپر ہونے کی دلیل ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جہت علو میں حسی اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

۷۔اثبات معية الله تعالىٰ لخلقه وانها لا تنافي علوه فوق عرشه

مخلوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معیت (ساتھ ہونا) کا اثبات اور یہ کہ مخلوق کے ساتھ معیت اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کے منافی نہیں ہے

وقوله ﷺ: [افضل الايمان ان تعلم ان الله معک اينما كنت] (حدیث حسن اخرجه الطبرانی من حدیث عبادة بن الصامت)

وقوله ﷺ: اذا قام احدكم الى الصلاة فلا يبصق قبل وجهه فان الله قبل وجهه، ولا عن يمينه ولكن عن يساره أو تحت قدمه] (متفق علیہ)

وقوله ﷺ: اللهم رب السموات السبع ورب العرش العظيم ، ربنا ورب كل شئ فالق الحب والنوى منزل التوراة الإنجيل والقرآن ،أعوذ بک من شر نفسي ومن شر كل دابة أنت آخذ بناصيتها .انت الأول فليس قبلک شئ وأنت الآخر فليس بعدک شئ ، وانت الظاهر فليس فوقک شئ وانت الباطن فليس دونک شئ ،اقض عنى الدين وأغنى من الفقر] (رواہ مسلم)

وقوله ﷺ: [لما رفع الصحابة اصواتهم بالذكر :[ايها الناس اربعوا على انفسكم فانكم لاتدعون اصم ولاغائبا ، انما تدعون سميعا بصيراً ،قريبا ان الذى تدعونه اقرب إلى احدكم من عنق راحلته] (متفق علیہ)

احادیث کی تشریح

[افضل الایمان ان تعلم ان اللہ معک اینما کنت]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: [افضل الایمان یہ ہے کہ تجھے معلوم ہو کہ تو جہاں کہیں بھی ہو اللہ تعالیٰ تیرے ساتھ ہے]

(یہ حدیث حسن ہے، اسے امام طبرانی نے اپنی اوسط اور کبیر میں روایت کیا ہے)

شرح

اس حدیث میں افضل الایمان سے مراد افضل خصال الایمان ہے، یعنی ایمان کی سب سے افضل خصلت کیا ہے؟ یہ جملہ ایمان کے متفاضل ہونے پر دلالت کر رہا ہے، یعنی بعض خصائلِ ایمان بعض سے افضل ہیں۔

حدیث میں معیت (اللہ تعالیٰ کا بندے کے ساتھ ہونا) سے مراد معیتِ علم واطلاع ہے، یعنی ہر بندہ کو یقین کامل ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کو میرے متعلق مکمل علم اور اطلاع ہے۔ اس عقیدے کا فائدہ یہ ہے کہ بندہ کی ظاہری اور باطنی زندگی ایک جیسی ہو جائے گی اور بندہ ہر جگہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے گا۔ (اس روایت کو امام طبرانی نے اپنی معجم الکبیر میں روایت کیا ہے امام طبرانی کا نام ابوالقاسم سلیمان اللخمی ہے، امام طبرانی اونچے درجے کے حفاظِ حدیث میں سے ہیں)

یہ حدیث اللہ تعالیٰ کی صفت "معیت مع الخلق" پر دلالت کرتی ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے اعمال کو جاننے اور احاطہ کرنے کے اعتبار سے بندوں کے ساتھ ہے، لہذا بندے کو چاہیئے کہ وہ اس بات کو ہر وقت یاد رکھے تا کہ اس کے اعمال میں اصلاح اور بہتری پیدا ہو۔

❁ ❁ ❁

[اذا قام احدکم الی الصلاۃ فلا یبصق قبل وجهه فان الله قبل وجهه، ولا عن یمینه ولکن عن یساره أو تحت قدمه] (متفق علیہ)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں ہو تو اپنے سامنے کی طرف نہ تھوکے، کیونکہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ ہے، اور اپنی دائیں جانب بھی نہ تھوکے، البتہ اپنی بائیں جانب یا قدم کے نیچے تھوک لے]

شرح

اس حدیث میں نماز کی حالت میں سامنے کی طرف تھوکنے سے منع کیا گیا ہے، اور اس کی علت یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے چہرے کے سامنے اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نمازی کے سامنے ہونا اس طرح ہے جس طرح اس کی شان کے لائق ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ساتھ مختلط ہے، بلکہ وہ تو آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے، البتہ علم واحاطہ کے اعتبار سے اپنی مخلوق کے قریب ہے۔

اس حدیث میں دائیں طرف تھوکنے سے منع کی علت، دائیں طرف کی تکریم وتشریف ہے اور یہ کہ دونوں فرشتے دائیں طرف ہوتے ہیں۔

شاہدِ حدیث: اس حدیث میں اس بات کا اثبات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے بحالتِ نماز قریب ہوتا ہے اور اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، البتہ اپنی ذات کے اعتبار سے بندے کے اوپر عرش پر ہے۔

❁ ❁ ❁

[اللهم رب السموات السبع ورب العرش العظیم ، ربنا ورب کل شئ فالق الحب والنوی منزل التوراۃ الإنجیل والقرآن ،أعوذ بک من شر نفسی ومن شر کل دابة أنت آخذ بناصیتها .انت الأول فلیس قبلک شئ وأنت الآخر فلیس بعدک شئ ، وانت الظاهر فلیس فوقک شئ وانت

الباطن فلیس دونک شیٔ ،اقض عنی الدین و أغنی من الفقر] (رواہ مسلم)

ترجمہ:اے اللہ!رب ساتوں آسمانوں کے!اور رب عرشِ عظیم کے!۔اے ہمارے اور ہر چیز کے رب!اے دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والے! اور اے نازل کرنے والے توراۃ وانجیل اور فرقان (قرآن) کے!میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ذریعے سے ہر اس چیز کے شر سے کہ تو پکڑے ہوئے ہے پیشانی اس کی۔اے اللہ!تو ہی اول ہے،پس نہیں تجھ سے پہلے کوئی چیز،اور تو ہی آخر ہے،پس نہیں تیرے بعد کوئی چیز،اور تو ہی غالب ہے،پس نہیں تیرے اوپر کوئی چیز،اور تو ہی باطن ہے،پس نہیں ہے تجھ سے پوشیدہ تر کوئی چیز۔ادا کردے ہم سے (ہمارا) قرض،اور ہمیں غنی بنادے فقر سے نکال کر۔

شرح

اس حدیث میں یہ بات مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں کا رب ہے،رب سے مراد، خالق اور مالک ہے۔نیز اس حدیث میں عرش عظیم کا ذکر ہے،یہ عظیم بمعنی کبیر ہے،یعنی بہت بڑا عرش،عرش کی بڑائی کا اندازہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے،عرش اللہ تعالیٰ کی جمیع مخلوقات میں سے سب سے بڑا ہے،عرش کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

"رب"بمعنی خالق اور مالک ہے،"ربنا و ربنا کل شیٔ" کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا خالق اور رازق ہے،نیز وہ ہر شیٔ کا خالق اور رازق ہے۔اس جملہ میں اس بات کا اثبات ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا رب ہے۔

"خالق الحب والنوی"یعنی اللہ تعالیٰ ہی اناج کے دانوں اور کھجوروں کی گٹھلیوں کو پھاڑتا ہے تاکہ اس سے گندم وغیرہ اور کھجور کے پودے اگائے۔

"منزل التوراۃ والانجیل والقرآن" تورات موسیٰ علیہ السلام پر،انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر جبکہ قرآن جنابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔یہ بات ان کتب کے منزل من اللہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کتب کی دیگر آسمانی کتب پر افضلیت کی بھی دلیل ہے۔

"اعوذ بک من شر کل دابۃ انت آخذ بناصیتھا"یعنی:اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں ہر دابۃ کے شر سے کہ تو ہی اس کی پیشانی کو پکڑے ہوئے ہے۔

"دابۃ"زمین پر رینگنے اور چلنے والے ہر جانور اور کیڑے مکوڑے کو کہا جاتا ہے۔پیشانی سے پکڑنے کا مطلب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غلبہ اور بادشاہت کے تحت ہیں۔(چونکہ وہ تیرے غلبہ اور بادشاہت کے تحت ہیں لہٰذا مجھ سے ان کا شر دور فرمادے)

"الأول،الآخر،الظاھر اور الباطن"یہ چاروں تعالیٰ کے نام ہیں،پہلے دونوں نام "الأول، الآخر"اللہ تعالیٰ کی ازلیت وابدیت کیلئے ہیں اور دوسرے دونوں نام"الظاھر، الباطن"اللہ تعالیٰ کے علو وقرب کیلئے ہیں۔

آخری دونوں نام"الظاھر،الباطن"ہی حدیث میں محلِ شاہد ہیں،کیونکہ ان دونوں ناموں میں اللہ تعالیٰ کے علو اور قرب کا بیان ہے،ان دونوں ناموں میں کوئی منافاۃ اور تناقض نہیں ہے،اللہ تعالیٰ اپنے علو کے باوجود قریب بھی ہے،اور قریب ہونے کے باوجود بلند بھی ہے۔

"اقض عنی الدین"یعنی"میرا قرض ادا کردے""الدَین"سے مراد حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ہیں۔

اس جملہ میں اپنی ذات سے ہر قسم کے "حول و قوۃ"،یعنی تصرف کی نفی کرکے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔

"واغننی من الفقر"یعنی"اے اللہ!مجھے فقر سے بے پروا کردے""الفقر"حاجت کو کہتے ہیں،اور"الفقیر"اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو،یا اتنا ہو جو ضروریات کیلئے ناکافی ہو۔

یہ حدیث مشاکل ومصائب کے حل اور قبولیتِ دعا کیلئے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے توسل کی مشروعیت پر دلالت کررہی ہے۔

وقوله ﷺ [لما رفع الصحابة اصواتهم بالذكر :[ايها الناس اربعوا على انفسكم فانكم لاتدعون اصم ولاغائبا ، انما تدعون سميعا بصيراً ،قريبا ان الذى تدعونه اقرب إلى احدكم من عنق راحلته] (متفق علیہ)

ترجمہ:ایک موقعہ پر صحابہ کرام بلند آواز سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کررہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا:اے لوگو اپنی جانوں پر نرمی کرو،تم بہرے اور غائب کو نہیں پکاررہے، بلکہ تم ایسی ذات کو پکاررہے ہو جو سمیع بصیر اور قریب ہے،جس ذات کو تم پکاررہے ہو وہ تم سے تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔ (بخاری ومسلم)

شرح

''اربعوا فانكم لاتدعون اصم ولاغائبا ''یعنی''اپنی جانوں پر نرمی کرو کیونکہ تم بہری اور غائب ذات کو نہیں پکاررہے'' آپ ﷺ نے اس حدیث میں صحابہ کو آہستہ آواز سے اللہ تعالیٰ کو پکارنے کا حکم دیا، پھر اس کی علت بیان کرتے ہوئے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بہری اور غائب نہیں ہے کہ تمہاری دعاؤں کو نہ سن سکے اور تمہیں نہ دیکھ سکے، بلکہ وہ تو سمیع ،بصیر اور قریب ہے،لہذا آوازوں کو بلند کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بھلا جو ذات تمہاری سواریوں کی گردنوں سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے،کیا وہ اپنے پکارنے اور ذکر کرنے والے کے قریب نہیں ہوگی۔

اور جو قریب ہو اسے پکارنے کیلئے آواز کو بلند کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے قریب ہے وہ پست اور بلند ہر آواز کو یکساں طور پر سنتا ہے۔

شاہدِ حدیث: اس حدیث میں اس بات کا اثبات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے داعی کے قریب ہے، وہ جس طرح جہری اصوات کو سنتا ہے اسی طرح سری اصوات کو بھی سنتا ہے۔

باب میں مذکور تمام احادیث سے اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ معیت ،ان کے قریب ہونے ،ان کی اصوات کو سننے اور ان کی حرکات وسکنات کو دیکھنے کا اثبات ہو رہا ہے،اور یہ تمام

امور،(معیت ،قرب سمع اور رویت) اللہ تعالیٰ کے علو اور استواء علی العرش کے منافی نہیں ہیں۔ واضح ہو کہ معیت اور اس کے انواع ،قرآن کریمہ سے اس کے شواہد اور ان کی تفسیر ان جمیع امور پر کلام گذشتہ اوراق میں گزرچکی ہے۔

٨. اثبات رؤية المؤمنين لربهم يوم القيامة

قیامت کے دن اہل ایمان کا اپنے پروردگار کو دیکھنے کا اثبات

وقوله: [إنكم سترون ربكم كما ترون القمر ليلة البدر لاتضامون فى رؤيته، فان استطعتم أن لا تغلبوا على صلاة قبل طلوع الشمس وصلاة قبل غروبها فافعلوا] (بخاری ومسلم)

حدیث کی تشریح

[إنكم سترون ربكم كما ترون القمر ليلة البدر لاتضامون فى رؤيته، فان استطعتم أن لا تغلبوا على صلاة قبل طلوع الشمس وصلاة قبل غروبها فافعلوا] (بخاری ومسلم)

ترجمہ:[یقیناً تم لوگ اپنے پروردگار کو دیکھوگے ،جس طرح تم چودھویں کے چاند کو دیکھتے ہو،تم اللہ تعالیٰ کو دیکھنے میں کسی قسم کا اژدھام محسوس نہیں کروگے ،لہٰذا اگر تم اس بات کی استطاعت رکھو کہ طلوعِ شمس سے پہلے کی نماز (یعنی نماز فجر) اور غروبِ شمس سے قبل کی نماز (یعنی عصر) کے معاملے میں مغلوب نہ کیئے جاؤ تو ضرور ایسا کرو]

شرح

حدیث میں خطاب مؤمنین سے ہے،اور "سترون" میں "س" تاکید کیلئے ہے اور "رؤیة" سے مراد آنکھوں کا دیکھنا ہے،قیامت کے دن مؤمنین کا اپنے پروردگار کو دیکھنا احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے۔

"لیلة البدر" سے مراد چاند کی مکمل ہونے کی رات ہے،اور وہ ہر مہینہ کی چودھویں رات ہے

کیونکہ اس رات چاند مکمل ہوتا ہے اور نور سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی رؤیت کو چودھویں کے چاند کی رؤیت سے تشبیہ دینے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رؤیت میں تاکید اور پختگی پیدا کرنا ہے، نیز رؤیت کے کسی بھی مجازی معنی کی نفی کرنا ہے (یعنی حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی رؤیت (دیدار) حاصل ہوگی)۔یہاں تشبیہ رؤیت کی رؤیت کے ساتھ ہے،مرئی (دیکھی جانیوالی چیز) کی مرئی کے ساتھ نہیں ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی چاند کے ساتھ تشبیہ مقصود نہیں ہے) کیونکہ اللہ تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں ہے "ليس كمثله شئ"

"لاتضامون فى رؤيته" اس عبارت میں "لاتضامون" کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے:

(۱) تاء کے ضمہ اور میم کی تخفیف (یعنی بغیر تشدید) کے ساتھ۔اس صورت میں معنی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے معاملے میں کسی پر ظلم نہیں ہوگا کہ بعض کو رؤیت نصیب ہو اور بعض کو نہ ہو سکے۔(بلکہ تمام اہل جنت کو رؤیت نصیب ہوگی)

(۲) تاء کے فتحہ اور میم کی تشدید کے ساتھ۔اس صورت میں معنی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت کی خاطر تمہیں ایک جگہ جمع نہیں ہونا پڑے گا کہ اس سے تم رش اور اژدھام کا شکار ہو جاؤ۔

بہرحال دونوں روایتوں کی صورت میں معنی حدیث یہ ہے کہ تمہیں اپنے پروردگار کی واقعتاً وحقیقتاً رؤیت حاصل ہوگی اور وہ بھی اس طرح کہ ہر شخص اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اس دیدار سے محظوظ ہو جائے گا۔

فجر اور عصر کی نماز میں مغلوب نہ ہونے کا معنی ہے کہ ان دونوں نمازوں کی حفاظت کریں،اس طرح کہ باجماعت اور وقت پر ادا کریں،ان دو نمازوں کا خصوصی طور پہ ذکر اس لیئے کیا کہ دن اور رات کے فرشتے ان دونوں نمازوں میں جمع ہوتے ہیں،کیونکہ یہ دو نمازیں افضل الصلوات ہیں اس لیئے ان کی حفاظت کرنیوالوں کو افضل ترین عطیہ دیا جائے گا،جوکہ اللہ تعالیٰ کے چہرہ انور واقدس کی زیارت کی صورت میں ہوگا۔

شاہدِ حدیث: اس حدیث میں اہل ایمان کیلئے اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا اثبات ہے اور یہ رؤیت قیامت کے دن عیاناً (یعنی چہرے کی آنکھوں سے حقیقتاً) حاصل ہوگی۔

بعض گمراہ لوگوں نے اس مسئلہ میں اہل السنۃ کی مخالفت کی ہے، گذشتہ اوراق میں جہاں ان آیات کی تفسیر کی گئی ہے جن سے رؤیت باری تعالیٰ کا اثبات ہو رہا ہے، میں ان لوگوں کا رد کیا گیا ہے۔

موقف اهل السنة

من هذه الأحاديث التى فيها إثبات الصفات الربانية

احادیثِ صفات کے متعلق اہل السنۃ کا موقف

الى أمثال هذه الأحاديث التى يخبر فيها رسول الله ﷺ عن ربه بمايخبر به. فإن الفرقة الناجية أهل ا لسنة والجماعة يؤمنون بذلك كما يؤمنون بماأخبر الله به فى كتابه من غير تحريف ولاتعطيل .ومن غير تكييف ولاتمثيل.

ترجمہ: اس قسم کی دیگر بہت سے احادیث ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے پروردگار کی صفات بیان فرمائی ہیں۔فرقہ ناجیۃ ،اہل السنۃ والجماعۃ ان تمام صفات پر ایمان لاتے ہیں جس طرح کہ ان صفات جن کی خبر خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دی ہے پر ایمان لاتے ہیں بغیر تحریف اور تعطیل کے اور بغیر تکییف اور تمثیل کے۔

......شرح......

مندرجہ بالا عبارت میں احادیثِ صفات کے متعلق اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف بیان کیا گیا ہے کہ اہل السنۃ کا احادیثِ صفات کے متعلق وہی موقف ہے جو آیاتِ صفات کے متعلق ان کا موقف ہے،اور وہ موقف یہ ہے کہ ان صفات پر ایمان لایا جائے اور ان کے حقیقی معنی پر دلالت کرنے کا اعتقاد رکھا جائے۔اہل السنۃ نہ تو کسی باطل تاویل کا سہارا لیکر ان صفات کو ان معنیٔ ظاہر سے پھیرتے ہیں اور نہ ہی صفات کے مدلول کی نفی کر کے تعطیل کی روش اپناتے ہیں اور نہ ہی خالق کی ان صفات کی مخلوق کیساتھ تشبیہ کے قائل ہوئے ہیں، کیونکہ ”لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ“ ”اللہ تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔“

اہل السنۃ کا یہ موقف جہمیہ، معتزلہ، اشاعرہ جیسے مبتدعین کے موقف کے خلاف ہے، کیونکہ صفات کے متعلق ان مبتدعین کا موقف درحقیقت ان صفات کے انکار پر یا پھر صفات کے معانی کی باطل تاویل پر منتج ہوتا ہے، اہل السنۃ کا یہ موقف مشبہ کے موقف کے بھی خلاف ہے کیونکہ مشبہ اثباتِ صفات میں غلو کا شکار ہو کر اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ کے مرتکب ہوئے ہیں (تعالیٰ اللہ عما یقولون علوا کبیرا)

مكانة أهل السنة والجماعة بين فرق الأمة

اس امت کے مختلف فرقوں میں اہل السنۃ والجماعۃ کا مرتبہ ومقام

بل هم الوسط في فرق الأمة، كما أن الأمة هي الوسط في الأمم، فهم وسط في باب صفات الله سبحانه وتعالیٰ بين أهل التعطيل الجهمية وأهل التمثيل المشبهة وهم وسط في باب أفعال الله بين الجبرية والقدرية وغيرهم وفي باب وعيد الله بين المرجئة والوعيدية من القدرية وغيرهم، وفي باب أسماء الايمان والدين بين الحرورية والمعتزلة وبين المرجئة والجهمية، وفي باب أصحاب رسول الله ﷺ بين الرافضة والخوارج.

ترجمہ:

اہل السنۃ والجماعۃ امت کے تمام فرقوں میں وسطیت اور اعتدال پر قائم ہیں، جس طرح کہ یہ امت باقی امتوں کے درمیان وسطیت اور اعتدال پر قائم ہے۔ چنانچہ اہل السنۃ والجماعۃ اللہ تعالیٰ کی صفات کے باب میں اہلِ تعطیل جہمیہ اور اہلِ تمثیل مشبہ کے مقابلہ میں اعتدال پر قائم ہیں، اللہ تعالیٰ کی وعیدوں کے باب میں مرجئہ اور وعیدیہ (قدریہ کا ایک گروہ) کے مقابلے میں اعتدال پر قائم ہیں، ایمان ودین کے ناموں سے موسوم کرنے کے باب میں خوارج ومعتزلہ اور مرجئہ وجہمیہ کے مقابلہ میں اعتدال پر قائم ہیں، اور اسی طرح اصحابِ رسول کے باب میں روافض (شیعہ) اور خوارج کے مقابلہ میں اعتدال پر قائم ہیں۔

عبارت کی تشریح

...... شرح ......

صفاتِ باری تعالیٰ کے اثبات پر مبنی کتاب وسنت کے نصوص کے متعلق اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف کو بیان کرنے کے بعد اب شیخ رحمہ اللہ اس امت کے فرقوں میں اہل السنۃ والجماعۃ کے مرتبہ ومقام کو بیان کرنا چاہتے ہیں، تا کہ امت کے گمراہ فرقوں سے مقارنہ اور تقابل کے ذریعے ان کی فضیلت اور قدر ومنزلت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے جیسا کہ کہا جاتا ہے:

فان الضد يظهر حسنه الضد وبضدها تتبين الأشياء

کسی چیز کی ضد ہی اس چیز کے حسن کو ظاہر کرتی ہے، کیونکہ ضد سے ہی اشیاء کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

''بل هم الوسط في فرق الأمة ''یعنی اہل السنۃ امت کے فرقوں میں وسطیت پر قائم ہیں۔ صاحبِ'' المصباح المنير '' فرماتے ہیں:''الوسط ''(سین کے فتح کے ساتھ) کا معنی ہے ''المعتدل ''(اعتدال ومیانہ روی اختیار کرنے والا) لیکن یہاں سے مراد ''العدل الخیار'' ہے۔(یعنی انصاف پر قائم رہنے والا اور دوسرے کے مقابلہ میں بہترین) اس کی دلیل یہ آیت ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِتَكُوْنُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ (البقرة:۱۴۳)

ترجمہ:''ہم نے اسی طرح تمہیں عادل امت بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ''

لہذا اہل السنۃ کے وسط ہونے کا معنی ہے کہ یہ ''عدول اور خیار'' ہیں اور یہ کہ افراط وتفریط کا شکار فرقوں میں اعتدال پر قائم ہیں۔ چنانچہ اسلام میں جتنے بھی فرقے ہیں ان کے درمیان اہل السنۃ منہجِ اعتدال پر قائم ہیں جس طرح کہ امت مسلمہ باقی امتوں کے درمیان اعتدال پر قائم ہے، سابقہ امتوں میں کوئی تو غلو وافراط کا شکار رہی ہے اور کوئی تفریط وتساھل کا شکار، جبکہ امتِ مسلمہ

ان کے مقابلہ میں اعتدال پر قائم ہے، اسی طرح اس امت کے تمام بدعتی فرقے جو کہ صراطِ مستقیم سے منحرف ہو چکے ہیں ان میں سے بعض تو غلو کا شکار ہو کر اپنی الگ راہ اختیار کر چکے ہیں اور بعض تساہل اختیار کر کے راہِ حق سے انحراف کر چکے ہیں۔

اس اجمال کے بعد شیخ رحمہ اللہ تفصیل بیان کرنا چاہتے ہیں: چنانچہ فرماتے ہیں:

''فهم وسط في باب صفات الله سبحانه وتعالىٰ بين اهل التعطيل الجهمية، واهل التمثيل المشبهة''

یعنی ''اولاً اہل السنہ والجماعۃ اللہ تعالیٰ کی صفات کے باب میں اہل التعطیل جہمیہ اور اہل التمثیل مشبہ کے مقابلہ میں اعتدال پر قائم ہیں''

فرقۂ جہمیہ کی نسبت جہم بن صفوان الترمذی کی طرف ہے، یہ لوگ باب تنزیہ (اللہ تعالیٰ کو عیوب ونقائص سے منزہ ومبرا قرار دینا) میں غلو وافراط کا شکار ہو گئے، یہاں تک کہ اپنے زعمِ باطل میں تشبیہ کے محذور سے بچتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا ہی انکار کر بیٹھے، اسی لیئے انہیں معطلہ بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو اس کے اسماء وصفات سے معطل کر دیا ہے۔

اور اہل التمثیل کو مشبہ اس لیئے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی صفات کے اثبات میں غلو وافراط کا شکار ہو گئے، یہاں تک اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق کے مشابہ قرار دے ڈالا اور اس کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مثل قرار دے دیا۔ (تعالى الله عما يقولون)

جبکہ اہل السنۃ نے ان کے مقابلہ میں اعتدال کی راہ اختیار کی، چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کیلئے صفات بغیر تشبیہ وتمثیل کے جیسے اس کے شایانِ شان ہیں، ثابت کیا، نہ تو تنزیہ میں اور نہ اثبات میں غلو کا شکار ہوئے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے نقائص اور عیوب کی اس طرح نفی اور تنزیہ کی کہ اللہ تعالیٰ کی تعطیل (انکار) لازم نہ آئے اور اسماء وصفات کمال کو اس طرح ثابت کیا کہ مخلوق سے

تشبیہ وتمثیل لازم نہ آئے (جبکہ جہمیہ اور مشبہ کا منہج سراسر الحاد پر قائم ہے، جہمیہ تنزیہ کے باب میں اس قدر بہک گئے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا انکار کر بیٹھے۔ اس کے برعکس مشبہ اثبات صفات میں اس قدر غلو کا شکار ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوقات کی صفات سے تشبیہ دے بیٹھے۔

(والعیاذ باللہ)

ثانیاً: ''وهم وسط فی باب أفعال الله بين الجبرية والقدرية ''یعنی (اہل السنۃ اللہ تعالیٰ کے افعال میں جبریہ اور قدریہ وغیرھم کے مقابلہ میں اعتدال پر قائم ہیں)

فرقۂ جبریہ کی نسبت جبر (زبردستی کرنا) کی طرف ہے، کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ بندہ اپنے فعل پر مجبور محض ہے، چنانچہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کیلئے افعال کے اثبات میں غلو کا شکار ہو گئے، یہاں تک کہ افعالِ عباد کی نفی کر دی، ان کا زعمِ باطل ہے کہ بندے تو کچھ بھی نہیں کرتے فاعل اصلی تو اللہ تعالیٰ ہے، بندہ تو اپنے فعل میں مجبور ہے، بندے کے افعال وحرکات سب کے سب اضطراری ہیں، جس طرح مرتعش (رعشہ کے مریض) کی حرکات اضطراری ہوتی ہیں، جہاں تک افعال کی نسبت بندے کی طرف کرنے کی بات ہے تو یہ نسبت مجازی ہے۔

فرقۂ قدریہ کی نسبت قدر (تقدیر) کی طرف ہے، یہ جبریہ کے برعکس افعالِ عباد کے اثبات میں غلو کا شکار ہو گئے، ان کا کہنا ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، اللہ تعالیٰ کی ارادے ومشیت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں، اور یہ کہ افعالِ عباد اللہ تعالیٰ کے ارادے ومشیت کے تحت نہیں ہیں، چنانچہ ان کا زعمِ باطل ہے کہ افعالِ عباد اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور ارادے سے نہیں ہیں، بلکہ بندے خود ہی مستقلاً اپنے افعال کے فاعل وخالق ہیں۔

ان دونوں فرقوں کے مقابلہ میں اہل السنۃ وسطیت اور اعتدال پر قائم ہیں، ان کا کہنا ہے کہ بندے کو اپنے افعال کے صدور میں ایک حد تک مشیت واختیار حاصل ہے، اور اس کی یہ مشیت واختیار اللہ تعالیٰ کے ارادہ، مشیت اور تقدیر کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاللهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ (الصافات:۹۶)

اس آیت کریمہ میں عمل کے صدور کی نسبت بندے کی طرف کی گئی ہے لیکن اسے اللہ تعالیٰ کی خلق اور تقدیر قرار دیا گیا ہے۔

نیز فرمایا: ﴿ وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ﴾ (التکویر:۲۹)

ترجمہ: ''اور تم بغیر پروردگارِ عالم کے چاہے کچھ بھی نہیں چاہ سکتے''

اس آیتِ کریمہ میں بندوں کیلئے مشیت کو ثابت کیا گیا ہے، لیکن یہ مشیت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بعد ہے، اس مسئلہ کی مزید وضاحت بحثِ تقدیر میں آئیگی، ان شاء اللہ

ثالثاً: '' وأهل السنة والجماعة وسط (فی باب وعيد الله) بين المرجئة والوعيدية من القدرية وغيرهم '' یعنی (اھل السنۃ والجماعۃ اللہ تعالیٰ کی وعیدوں کے باب میں مرجئہ اور وعیدیہ وغیرہ کے درمیان وسطیت واعتدال پر قائم ہیں)

وعید: کا معنی ڈرانا اور دھمکانا ہے، البتہ یہاں سے مراد وہ قرآنی نصوص ہیں جس میں نافرمانوں اور گناہ گاروں کو عذاب وسزا سے ڈرایا اور دھمکایا گیا ہے۔

مرجئہ کی نسبت ارجاء کی طرف ہے، ارجاء کا معنی تاخیر ہے، مرجئہ کو مرجئہ اس لیئے کہا جاتا ہے کہ یہ اعمال کو ایمان سے خارج سمجھتے ہیں، ان کا زعمِ باطل ہے کہ مرتکبِ کبیرہ فاسق نہیں ہے، ان کا کہنا ہے کہ ایمان کی موجودگی میں گناہ نقصان نہیں دیتا، جس طرح کہ کفر کی موجودگی میں نیکی نفع نہیں دیتی، ان کے نزدیک مرتکبِ کبیرہ کامل الایمان ہے، لہذا یہ کسی قسم کی وعید کا نشانہ نہیں ہے، یہ لوگ عاصی پر حکم لگانے میں متساہل ہیں اور اس تساہل میں افراط کا شکار ہو کر اس زعم میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ معاصی ایمان میں کسی قسم کا نقص پیدا نہیں کرتے، اور نہ ہی مرتکبِ کبیرہ پر فاسق ہونے کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔

مرجئہ کے مقابلے میں الوعیدیۃ ہیں، یہ وعیدوں کو نافرمان پر نافذ کرتے ہیں، اور اس سلسلہ

میں انتہائی متشدد ہیں، یہاں تک کہ ان کا کہنا ہے کہ اگر مرتکب کبیرہ بغیر توبہ کیئے مرجائے تو ہمیشہ کا جہنمی ہے، کیونکہ مرتکبِ کبیرہ ان کے نزدیک ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔

جبکہ ان دونوں فرقوں کے مقابلے میں اہل السنۃ والجماعۃ، وسطیت اور اعتدال پر قائم ہیں، ان کا کہنا ہے کہ مرتکبِ کبیرہ گناہگار ہے، وعیدوں کا نشانہ ہے، ناقص الایمان ہے، اور اس پر فاسق ہونے کا حکم لگایا جائے گا، لیکن وہ ایمان سے خارج نہیں، اور اگر جہنم میں داخل ہوا تو ہمیشہ جہنم میں نہ رہیگا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہوگا اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے معاف فرمادے اور اگر چاہے تو اس کی معصیت کے بقدر اسے عذاب میں مبتلا کردے پھر اسے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کردیا جائے گا۔

مرجئہ نے نصوص وعد کو پکڑا ہوا ہے، اور وعیدیہ نے نصوصِ وعید کو پکڑا ہوا ہے، جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ دونوں نصوص کو قبول کرتے ہوئے، تطبیق وجمع کی راہ اختیار کیئے ہوئے ہیں۔

رابعاً: "واھل السنة والجماعة وسط فی باب اسماء الایمان والدین بین الحروية والمعتزلة وبين المرجئة والجهمية" یعنی (انسانوں پر کفر، اسلام اور فسق کا حکم لگانے اور نافرمانوں کی دنیا وآخرت میں جزاء وسزا کے متعلق اہل السنۃ والجماعۃ، حروریۃ ومعتزلہ اور مرجئہ وجہمیۃ کے مقابلہ میں وسطیت واعتدال پر قائم ہیں۔

الحروریۃ: حروریہ سے مراد خوارج ہیں، کیونکہ یہ لوگ علی ؓ پر خروج کرکے قریہ "حروری" جو کہ سرزمینِ عراق میں واقع ہے، کی طرف چلے گئے تھے اور اس کو اپنا مسکن بنالیا تھا، اس لیئے ان کی نسبت اس بستی کی طرف کرتے ہوئے انہیں حروریہ کہا جاتا ہے۔

المعتزلۃ: معتزلہ، واصل بن عطاء کے متبعین کو کہا جاتا ہے، واصل بن عطاء جنابِ حسن بصری رحمہ اللہ کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا، مرتکبِ کبیرہ کے حکم کے مسئلہ میں حسن بصری رحمہ اللہ سے اختلاف کرکے علیحدگی اختیار کرلی، اس مسئلہ میں جو اس کے ہمنوا تھے وہ بھی اس کے ساتھ چلے

گئے، اس موقع پر حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: "انہ اعتزلنا" یعنی واصل بن عطاء نے ہم سے اعتزال (علیحدگی) اختیار کرلی ہے، اس بنا پر ان کا نام معتزلہ پڑ گیا۔

مرتکبِ کبیرہ کے متعلق خوارج، معتزلہ کا مسلک انتہائی متشددانہ ہے یہ مرتکبِ کبیرہ کو اسلام سے خارج سمجھتے ہیں، البتہ معتزلہ اسے کافر نہیں کہتے بلکہ کہتے ہیں کہ مرتکبِ کبیرہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک تیسرے منزلہ پر ہے، جبکہ خوارج اسے کافر کہتے ہیں، خوارج اور معتزلہ اس بات پر متفق ہیں کہ مرتکبِ کبیرہ اگر اسی حالت پر مرگیا تو ہمیشہ جہنم میں رہیگا۔

معتزلہ اور خوارج کے تشدد کے مقابلہ میں مرجئہ اور جہمیۃ نے مرتکبِ کبیرہ کے حکم کے متعلق انتہائی تساہل اختیار کیا ہوا ہے، ان کا کہنا ہے کہ "لایضر مع الایمان معصیة" ایمان کی موجودگی میں معصیت نقصان دہ نہیں ہے، کیوں کہ ان کا نظریہ ہے کہ ایمان صرف تصدیق القلب کا نام ہے، البتہ ان میں بعض تصدیق القلب کے ساتھ ساتھ اقرار باللسان کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں، لہذا اطاعت سے ایمان میں اضافہ نہیں ہوتا اور معصیت سے ایمان میں نقص پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ معاصی سے ایمان میں نقص پیدا نہیں ہوتا، لہذا مرتکبِ کبیرہ اگر گناہ کو حلال نہ سمجھتا ہو تو جہنم میں داخل نہ ہوگا۔

اہل السنۃ والجماعۃ اس مسئلہ میں وسطیت اور اعتدال پر قائم ہیں، ان کا کہنا ہے کہ نافرمان محض ارتکابِ معصیت سے ایمان سے خارج نہیں ہوجاتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہے، اگر اللہ چاہے تو اسے معاف فرمادے، اور اگر اللہ چاہے تو عذاب میں مبتلا کردے، لیکن ہمیشہ عذاب میں نہیں رہیگا، جیسا کہ خوارج اور معتزلہ کا باطل عقیدہ ہے۔

اہل السنۃ کا موقف ہے کہ معاصی ایمان میں نقص پیدا کرتے ہیں اور یہ کہ نافرمان جہنم کا مستحق ہے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادے، اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ موقف ہے کہ مرتکبِ کبیرہ فاسق اور ناقص الایمان ہے نہ کہ کامل الایمان جیسا کہ مرجئہ کا نظریۂ ہے۔ (واللہ اعلم)

خامساً: "وأهل السنة والجماعة وسط في حق اصحاب رسول الله ﷺ بين الرافضة والخوارج" اصحابِ رسول اللہ ﷺ کے متعلق اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف روافض وخوارج کے مقابلہ میں وسطیت واعتدال پر قائم ہے۔

الصحابی: صحابی اسے کہتے ہیں، جس نے بحالتِ ایمان نبی ﷺ سے ملاقات کی ہو، اور بحالتِ ایمان وفات پائی ہو۔

الرافضۃ: الرافضہ رفض سے ماخوذ ہے، اور رفض بمعنی ترک (چھوڑ دینا) ہے، روافض کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے زید بن علی بن الحسین سے کہا کہ آپ ابوبکر وعمر سے اعلانِ برات کریں، زید بن علی بن الحسین نے معاذ اللہ کہہ کر انکار کر دیا، تو انہوں نے زید بن علی بن الحسین کو چھوڑ دیا۔ اسی بناء پر یہ رافضہ قرار پائے۔

صحابہ کرام ؓ کے متعلق ان کا موقف یہ ہے کہ یہ لوگ علی ؓ اور دیگر اہلِ بیت کے متعلق غلو کا شکار ہیں، اور انہیں دیگر تمام صحابہ پر فضیلت وفوقیت دیتے ہیں، جبکہ باقی تمام صحابہ کرام ؓ خصوصاً خلفاءِ ثلاثہ ابوبکر، عمر، عثمان ؓ کے متعلق عداوت وبغض رکھتے ہیں، بلکہ بسا اوقات سب کو یا بعض کو کافر تک قرار دیتے ہیں۔

روافض کے مقابلہ میں خوارج ہیں، جنہوں نے سیدنا علی ؓ اور دیگر بہت سے صحابہ کو کافر کہا، انہیں حلال الدم والمال سمجھتے ہوئے ان سے قتال کیا۔

روافض وخوارج کے برعکس اہل السنۃ والجماعۃ اصحابِ رسول اللہ ﷺ سے محبت رکھتے ہیں اور کسی کے معاملے میں غلو کا شکار نہیں ہیں، تمام صحابہ کی فضیلت کا اعتراف کرتے ہیں، ان کا نظریہ ہے کہ اصحابِ رسول اللہ ﷺ اس امت کا افضل ترین طبقہ ہیں، اس مسئلہ کی مزید وضاحت آگے آئیگی۔

وجوب الايمان باستواء الله على عرشه وعلوه على خلقه ومعيته لخلقه وأنه لاتنافي بينهما

اللہ تعالیٰ کی صفات، استواء علی العرش، علو علی الخلق اور معیۃ للخلق پر ایمان لانا واجب ہے، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کے علو علی الخلق اور معیۃ للخلق کے مابین کوئی منافات نہیں ہے

فصل

قال رحمه الله: وقد دخل فيما ذكرناه من الايمان بالله الايمان بما أخبر الله به في كتابه وتواتر عن رسوله وأجمع عليه سلف الأمة من أنه سبحانه فوق سماواته على عرشه عليٌّ على خلقه، وهو سبحانه معهم أينما كانوا يعلم ماهم عاملون. كما جمع بين ذلك في قوله: ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ (الحديد:٤)

وليس معنى قوله: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ﴾ أنه مختلط بالخلق فان هذا لاتوجبه اللغة. وهو خلاف ما أجمع عليه سلف الأمة. وخلاف مافطر الله عليه الخلق، بل القمر آية من آيات الله من أصغر مخلوقاته وهو موضوع في السماء وهو مع المسافر وغير المسافر أينما كان، وهو سبحانه فوق عرشه رقيب على خلقه مهيمن عليهم مطلع عليهم الى غير ذلك من معاني ربوبيته.

ترجمہ: ایمان باللہ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آسمانوں کے اوپر ہونے اور تمام مخلوقات سے بلند پر ہونے پر ایمان لایا جائے، اللہ تعالیٰ کی یہ صفت کتاب اللہ، سنتِ متواترہ اور اجماعِ سلفِ صالحین سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ ہر حال میں بندوں کے ساتھ ہے، بندے جو کچھ عمل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جانتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان دونوں صفات (علو اور معیت) کو جمع کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَايَلِجُ فِى الْاَرْضِ وَمَايَخْرُجُ مِنْهَا وَمَايَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَايَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَاكُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ (الحدید:۴)

ترجمہ: "وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر مستوی ہو گیا وہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں جائے، اور جو اس سے نکلے، اور جو آسمان سے نیچے آئے اور جو کچھ چڑھ کر اس میں جائے، اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے"

﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ ﴾ "اللہ تمہارے ساتھ ہے" کا یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے ساتھ مختلط ہے، لغتِ عرب بھی اس معنی کو ضروری قرار نہیں دیتی، نیز یہ معنی اس فطرتِ سلیمہ کے بھی خلاف ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا فرمایا ہے۔

دیکھیئے چاند جو کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور ایک چھوٹی سی مخلوق ہے، یہ ہے تو آسمان میں لیکن سفر وحضر میں سب کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ عرش پر بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مخلوق کا نگراں ومحافظ اور مخلوق کے اعمال پر مطلع بھی ہے۔

عبارت کی تشریح

شرح

مصنف رحمہ اللہ نے یہاں پر دو مسئلوں کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے۔ ایک استواء علی العرش اور دوسرا معیۃ اللہ للخلق، مصنف رحمہ اللہ کا مقصود اس اشکال کو رفع کرنا ہے کہ بعض لوگوں کا وہم وظن ہے کہ ان دونوں صفات میں منافات ہے، اور بعض کو وہم وظن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفات مخلوق کی صفات کی طرح ہیں، اور یہ کہ جب اللہ تعالیٰ مخلوق کے ساتھ مختلط ہے تو مخلوق کے اوپر مستوی علی العرش کیسے ہے؟ اور یہ کہ مخالطت کے بغیر مخلوق کے ساتھ قرب ومعیت کیسی؟

شیخ رحمہ اللہ نے مختلف وجوہ سے اس شبہ کے جواب دیئے ہیں:

الوجہ الاول: قرآن لغتِ عرب پر اترا ہے، اور لغتِ عرب معیت بمعنی مخالطت کو ضروری قرار نہیں دیتی، اس لئے کہ کلمہ "مع" لغت میں مطلقاً مصاحبت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس سے اختلاط، امتزاج، مجاورت اور مماست (چھونا) کا مفہوم قطعی لازم نہیں آتا، مثلاً:

آپ کہتے ہیں: "زوجتی معی" یعنی میری بیوی میرے ساتھ ہے حالانکہ اس لمحہ وہ اور جگہ ہوتی ہے اور آپ دوسری جگہ ہوتے ہیں۔

اسی طرح آپ کہتے ہیں: "مازلنا نسیر والقمر معنا" (جب تک ہم چلتے رہے چاند بھی ہمارے ساتھ رہا) حالانکہ چاند تو آسمان میں ہے، اور چاند مسافر وغیر مسافر دونوں کے ساتھ ہوتا ہے چاہے وہ کہیں بھی ہوں۔ جب یہ بات اللہ تعالیٰ کی ایک چھوٹی سی مخلوق چاند کے متعلق کہی جا سکتی ہے تو اللہ تعالیٰ جو کہ ہر چیز کا خالق ہے اور سب سے بڑا ہے کے متعلق کیوں نہیں کہی جا سکتی ہے۔

الوجہ الثانی: دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت کا بمعنی اختلاط ہونا ایک ایسا قول ہے جو سلفِ صالحین صحابہ، تابعین اور تبعِ تابعین جن کے زمانہ کو سب سے بہتر زمانہ قرار دیا گیا

ہے کے اجماعی قول کے منافی ہے، جبکہ یہ سلفِ صالحین تو اپنے بعد آنیوالوں کیلئے قدوہ (رہنما) کی حیثیت رکھتے ہیں، سلفِ صالحین کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ مستوی علی العرش، اپنی مخلوق سے بلند اور ان سے جدا ہے اور سلفِ صالحین کا اس پر بھی اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے اعتبار سے اپنی مخلوق کے ساتھ ہے۔ آیت ''وَهُوَ مَعَكُمْ'' کی یہی تفسیر سلف سے منقول ہے۔

الوجہ الثالث : تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ بات فطرتِ انسانی کے بھی خلاف ہے، کیوں کہ تمام انسان فطری طور پر اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے بلند ہے، کیونکہ تمام انسان سختیوں اور مصیبتوں میں جب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو بلندی (اوپر) کی طرف رُخ کرتے ہیں، دائیں بائیں نہیں، کسی نے انہیں اس بات کی تعلیم نہیں دی ہوتی، بلکہ یہ اس فطرت کا تقاضا ہوتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا فرمایا ہے۔

الوجہ الرابع : چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ بات کتاب اللہ اور سنتِ متواترہ کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن وسنتِ متواترہ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے بلند اپنے عرش پر ہے اور اپنی مخلوق کے ساتھ بھی ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔

متواتر اس حدیث کو کہتے ہیں جسے بیان کرنیوالی ابتداء سے انتہاء تک ایسی بڑی جماعت ہو کہ عرف عام میں ان کا جھوٹ پر مجتمع ومتفق ہونا محال ہو۔ صفتِ علو کے اثبات میں بہت سی آیات واحادیث ہیں، مصنف رحمہ اللہ نے ان میں سے فقط ایک آیت ذکر کی ہے۔

مصنف رحمہ اللہ اپنے قول'' وهو سبحانه فوق عرشه رقيب على خلقه مهيمن عليهم مطلع عليهم '' میں اللہ تعالیٰ کی صفت علو علی العرش اور معیت للخلق کی مزید تاکید کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے دو ناموں ''المھیمن، الرقیب'' سے استدلال کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ﴾ (النساء:۱)

''الرقیب'' (نگران) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے احوال کا نگران ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ نام مخلوق کے ساتھ اس کے قرب پر دلالت کرتا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ ﴾ (الحشر:۲۳)

"اَلْمُهَيْمِنُ" کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر شاہد ہے، ان کے اعمال پر مطلع ہے اور ان کا نگران ہے۔

'' الی غیر ذلک من معانی ربوبیة ''یعنی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ اپنی مخلوق سے بلندی پر ہو، ان کے اعمال سے مطلع ہو اور اپنے علم واحاطہ کے ساتھ ان کے قریب بھی ہو، تاکہ ان میں تصرف کر سکے ان کے اعمال محفوظ کر سکے اور پھر ان اعمال کی انہیں جزا دے۔

ما يجب اعتقاده في علوه ومعيته سبحانه ومعنى كونه سبحانه: (في السماء) وأدلة ذلك

اللہ تعالیٰ کی صفت علو اور معیت کے متعلق کیا عقیدہ رکھنا واجب ہے، اور اللہ تعالیٰ کے آسمانوں میں ہونے کا صحیح معنی اور اس کے ادلہ کا بیان

وكل هذا الكلام الذي ذكره الله من أنه فوق العرش وأنه معنا حق على حقيقته لايحتاج الى تحريف، ولكن يصان عن الظنون الكاذبة مثل أن يظن أن ظاهر قوله: ﴿فِي السَّمَاءِ﴾ أن السماء تقله أو تظله وهذا باطل باجماع أهل العلم والايمان فان الله قد ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ (البقرة:۲۵۵) وهو الذي ﴿يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُوْلَا﴾ (فاطر:۴۱) ﴿وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهِ﴾ (الحج:۶۵) ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُوْمَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ﴾ (الروم:۲۵)

❁ ❁ ❁

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش پر ہونے اور مخلوق کے ساتھ ہونے کے بارہ میں جو کچھ بیان کیا ہے، یہ مبنی برحقیقت ہے، کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے، البتہ جھوٹے ظن وتخمین سے احتراز کرنا چاہیئے، مثلاً: یہ گمان کرنا کہ ”في السماء“ (یعنی اللہ آسمان میں ہے) کا مطلب ہے کہ آسمان نے اللہ تعالیٰ کو اٹھایا ہوا ہے یا ڈھانپا ہوا ہے، یہ معنی اہلِ العلم والایمان کے اجماع سے باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شان تو یہ ہے:

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ (البقرة:۲۵۵)

ترجمہ: ”اس کی کرسی کی وسعت نے زمین وآسمان کو گھیر رکھا ہے“

نیز فرمایا: ﴿يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُوْلَا﴾ (فاطر:۴۱)

ترجمہ: ”(اللہ تعالیٰ) آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں“

نیز فرمایا: ﴿وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهِ﴾ (الحج:۶۵)

ترجمہ: ”وہی آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ زمین پر اسکی اجازت کے بغیر گر نہ پڑے“

نیز فرمایا: ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُوْمَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ﴾ (الروم:۲۵)

ترجمہ: ”اس کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ آسمان وزمین اسی کے حکم سے قائم ہیں“

عبارت کی تشریح

...... شرح ......

شیخ رحمہ اللہ بیان فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے متعلق خبر دی ہے کہ وہ عرش پر ہے اور ہمارے ساتھ بھی ہے، تو اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو خبر دی ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے، اس کی تاویل کرنا اور ظاہری معنی نہ لینا جائز نہیں۔ جس طرح کہ جہمیہ اور معتزلہ کرتے ہیں، ان کا زعم باطل ہے کہ استواء اور معیۃ حقیقتاً نہیں ہے بلکہ مجازاً ہے، اور ”استواء على العرش“ کی تاویل ”استیلاء على الملك“ یعنی ملک پر غلبہ سے کرتے ہیں۔ اور ”وعلو الله على خلقه“ میں اللہ تعالیٰ کے جس علو یعنی سب سے بلند ہونے کا ذکر ہے اس کی تاویل علوِ مرتبہ اور غلبہ سے کرتے ہیں۔

یہ سب تاویلاتِ باطلہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف کو موجب ہیں۔ اور کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت سے مراد یہ لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ میں حلول کیئے ہوئے ہے، یہ حلولیة الجهمية کا عقیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس عقیدہ باطلہ سے بلند وبالا وپاک ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول: ” ولكن يصان عن الظنون الكاذبة مثل أن يظن ظاهر قوله: ﴿في السَّمَاءِ﴾ أن السماء تقله أو تظله“ یعنی بعض لوگ ﴿في السَّمَاءِ﴾

یعنی ''اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے'' کا معنی یہ کرتے ہیں کہ آسمان نے اللہ تعالیٰ کو اٹھایا ہوا ہے یا آسمان نے اللہ تعالیٰ کو ڈھانپا ہوا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے آسمان میں ہونے کا یہ معنی قطعاً نہیں ہے، اس معنی کے باطل ہونے کی دو وجہیں ہیں۔

الأمر الاول: یہ معنی اہل العلم والایمان کے اجماع کے خلاف ہے، کیونکہ اہل العلم کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر ہے، مخلوق سے جدا ہے، نہ تو مخلوق میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کی ذات میں حلول کئے ہوئے ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ مخلوق میں سے کسی میں حلول کئے ہوئے ہے۔

اس مسئلہ کی مزید تفصیل آیت ﴿ أَأَمِنتُم مَنْ فِي السَّمَاءِ ﴾ کے تحت گزر چکی ہے۔

بہر حال اگر آیت ﴿ فِي السَّمَاءِ ﴾ میں آسمان بعینہ مراد ہے تو ''فی'' بمعنی ''علی'' ہے، اس صورت میں معنی ہوگا ''اللہ علی السماء'' یعنی اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر ہے۔ ''فی'' بمعنی ''علی'' کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے ﴿ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ ﴾ (طہ:۷۱) ای علی جذوع النخل یعنی ''تم سب کو کھجور کے تنوں پر سولی پر لٹکوادوں گا'' اور اگر ''السماء'' سے مراد علو (بلندی) ہے تو ﴿ فی السماء ﴾ کا معنی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بلندی میں ہے۔ (واللہ اعلم)

الأمر الثانی: یہ معنی قرآن مجید کے ان ادلہ جو اللہ تعالیٰ کی عظمت، مخلوق سے غنی ہونے، اور مخلوق کے اللہ تعالیٰ کی طرف محتاج ہونے پر دلالت کرتے ہیں سے متصادم و مخالف ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: '' وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ '' کرسی اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم مخلوق ہے جو کہ عرش کے سامنے ہے، اور آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے، جبکہ عرش تو کرسی سے بھی بڑا ہے، لہذا جب آسمان و زمین کرسی سے چھوٹے ہیں اور کرسی عرش سے چھوٹی ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بڑا ہے تو آسمان اللہ تعالیٰ کو کیسے گھیرے ہوئے یا اٹھائے ہوئے یا ڈھانپے ہوئے ہو سکتا ہے؟!!! اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

نیز فرمایا: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ﴾ (فاطر:۴۱)

ترجمہ: ''(اللہ تعالیٰ) آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں''

نیز فرمایا: ﴿ وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ ﴾ (الحج:۶۵)

ترجمہ: ''وہی آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ زمین پر اسکی اجازت کے بغیر گر نہ پڑے''

نیز فرمایا: ﴿ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ ﴾ (الروم:۲۵)

ترجمہ: ''اس کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ آسمان و زمین اسی کے حکم سے قائم ہیں''

یہ سب آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آسمان و زمین اللہ تعالیٰ کی طرف محتاج ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہی انہیں گرنے اور اپنی جگہ سے زائل ہونے سے روکا ہوا ہے، ان کا اپنی اپنی جگہ پر ٹھہرنا صرف اللہ تعالیٰ کے اذن وامر سے ہے، اس کے بعد عقل اس بات کو کیسے قبول کر سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا محتاج ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اٹھائے یا گھیرے رکھیں؟

اللہ تعالیٰ ایسے ظنون باطل سے پاک اور بہت بلند ہے۔

وجوب الایمان بقربه من خلقه
وأن ذلک لاینا فی علوه وفوقیته

اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوق کے قریب ہونے پر ایمان لانا واجب ہے،
اور یہ قرب اللہ تعالیٰ کے علو وفوقیت کے منافی نہیں ہے۔

فصل

قال رحمه الله: وقد دخل فی ذلک الایمان بأنه قریب مجیب، کما جمع بین ذلک فی قوله: ﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾ (البقرة:۱۸۶)

وقوله ﷺ: [ان الذی تدعونه أقرب الی أحدکم من عنق راحلته]

وما ذکر فی الکتاب والسنة من قربه ومعیته لاینا فی ماذکر من علوه وفوقیته فانه سبحانه لیس کمثله شیء فی جمیع نعوته. وهو علی فی دنوه قریب فی علوه.

۞ ۞ ۞

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی صفات علو اور استواء علی العرش پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ قریب ومجیب ہے (بندوں کے قریب اور ان کی دعائیں قبول کرنیوالا) ان دونوں صفات کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں جمع کردیا ہے:

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾

ترجمہ: "جب میرے بندے میرے بارے میں آپ (ﷺ) سے سوال کریں تو

آپ (ﷺ) کہہ دیں کہ میں بہت قریب ہوں ہر پکارنے والے کی پکار کو جب بھی وہ مجھے پکارے، قبول کرتا ہوں" (البقرة:۱۸۶)

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: [ان الذی تدعونه أقرب الی أحد کم من عنق راحلته]

ترجمہ: [جس ذات کو تم پکارتے ہو وہ تو تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے]

کتاب وسنت میں اللہ تعالیٰ کے قرب ومعیت کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے علو وفوقیت کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ جمیع صفات میں اللہ تعالیٰ کا مثل کوئی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ مخلوق کے قریب ہونے کے باوجود مخلوق سے بلند ہے، اور مخلوق سے بلند ہونے کے باوجود مخلوق کے قریب بھی ہے۔

عبارت کی تشریح

...... **شرح** ......

مصنف رحمہ اللہ، اللہ تعالیٰ کی صفات علو واستواء علی العرش پر ایمان لانے کے وجوب کو ثابت کرچکنے کے بعد اس فصل میں اس بات پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات قریب (مخلوق کے قریب ہونا) اور مجیب (مخلوق کی دعائیں قبول کرنا) پر ایمان لانا بھی واجب ہے، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں صفات "قریب، مجیب" کو ایک ہی آیت میں جمع کردیا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾

ترجمہ: "جب میرے بندے میرے بارے میں آپ (ﷺ) سے سوال کریں تو آپ (ﷺ) کہہ دیں کہ میں بہت قریب ہوں ہر پکارنے والے کی پکار کو جب بھی وہ مجھے پکارے، قبول کرتا ہوں" (البقرة:۱۸۶)

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم آہستہ سے اسے پکاریں، یا بعید ہے کہ اونچی آواز سے پکاریں؟ آپ ﷺ خاموش ہوگئے تو آیت: ﴿ وا ذا سألک عبا دی...... ﴾ نازل ہوئی۔

اس آیتِ کریمہ میں دعا میں بغیر آواز کے مناجات کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے: [ان الـذی تدعونه أقرب الی أحد کم من عنق راحلتـه] ترجمہ: [جس ذات کو تم پکارتے ہو وہ تو تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے]

یہ آیت اور حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ دعا کرنیوالے سے قریب ہوتا ہے اور اس کی دعا قبول فرماتا ہے، البتہ یہ قرب اس کے علو (بلندی) کے منافی نہیں ہے، کیونکہ دونوں باتیں ثابت اور برحق ہیں، اور حق میں تناقض نہیں ہوتا، اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ کی جمیع صفات میں کوئی بھی اس کا مثل نہیں ہے۔

لہذا یہ سوال کرنا غلط ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے اوپر ہے تو ان کے ساتھ کیسے ہوسکتا ہے؟ کیونکہ یہ سوال دراصل ایک غلط تصور کی بناء پر ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق پر قیاس کرنا ہے اور یہ قیاس بالکل باطل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ﴾

اللہ تعالیٰ کی عظمت، کبریائی، احاطہ اور یہ کہ ساتوں آسمان اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ایسے ہیں جیسے کسی بندے کے ہاتھ میں رائی کا دانہ ہو، کے پیشِ نظر قرب اور علو اس کے حق میں جمع ہوسکتے ہیں، بھلا جس ذات کی یہ عظمت ہو اس کے حق میں یہ بات کیسے محال ہوسکتی ہے کہ وہ عرش پر ہونے کے باوجود، جس طرح وہ چاہے مخلوق کے ساتھ بھی ہو۔

نصوصِ کتاب وسنت اور اجماعِ علماءِ ملت اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ساتھ قرب کی حالت میں بھی اپنی مخلوق سے بلند ہے، اور عرش پر ہونے کی حالت میں بھی اپنی مخلوق کے قریب ہے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوبی ہے۔

وجوب الایمان بأن القرآن کلام الله حقیقة

اس بات پر ایمان لانا واجب ہے کہ قرآن حقیقتاً کلام اللہ ہے

فصل

قـال رحـمه الله : ومن الایمان بالله وکتبه الایمان بأن القرآن کلام الله منـزل غیر مـخلوق منه بدأ والیه یعود وأن الله تکلم به حقیقة. وأن هذا القرآن الذی أنزله علی محمد ﷺ هو کلام الله حقیقة لا کلام غیره.

ولا یجوز اطلاق القول بأنه حکایة عن کلام الله أو عبارة. بل اذا قرأه النـاس أو کتبوه فی المصاحف لم یخرج بذلک عن أن یکون کلام الله تعالیٰ حقیقة. فان الکلام انما یضاف حقیقة الی من قاله مبتدئا لا الی من قاله مبلغا مؤدیا. وهو کلام الله حروفه ومعانیه. لیس کلام الله الحروف دون المعانی، ولا المعانی دون الحروف.

ترجمہ: ایمان باللہ اور ایمان بالکتب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ یہ ایمان رکھا جائے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے، مخلوق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے اور اسی کی طرف لوٹ جائے گا، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حقیقتاً اس قرآن کے ساتھ کلام فرمایا ہے، اور یہ کہ یہ قرآن جسے اللہ تعالیٰ نے جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا ہے حقیقتاً اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، کسی اور کا کلام نہیں۔

قرآن کے متعلق یہ کہنا کہ یہ تو کلام اللہ کی حکایت یا تعبیر ہے، جائز نہیں ہے، بلکہ جب لوگ قرآن کی تلاوت کر رہے ہوں یا اسے صحائف میں لکھ رہے ہوں، تب بھی قرآن حقیقتاً

کلام اللہ ہونے سے خارج نہیں، کیونکہ کلام کی حقیقی اضافت اس کی طرف ہوتی ہے جس نے ابتداءً کلام کیا ہو نہ کہ اس کی طرف جس نے کلام آگے منتقل کیا ہو، قرآن حروف ومعانی سمیت کلام اللہ ہے، کلام اللہ نہ تو ایسے حروف ہیں جن کے کوئی معانی نہ ہوں اور نہ ایسے معانی ہیں جن کے حروف نہ ہوں، (بلکہ حروف اور معانی دونوں ملکر کلام اللہ ہیں۔)

عبارت کی تشریح

...... **شرح** ......

اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی کتابوں پر ایمان اصولِ ایمان میں سے ہے، کما تقدم۔

قرآن کے کلام اللہ ہونے پر ایمان بھی، ایمان کے مذکورہ دو اصل میں داخل ہے، کیونکہ ایمان باللہ ایمان بالصفات کو متضمن ہے، اور اللہ کا کلام اس کی صفات میں سے ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفت ہے کہ وہ جب چاہتا ہے، جو چاہتا ہے کلام فرماتا ہے، اور وہ ہمیشہ سے متکلم ہے اور ہمیشہ متکلم رہے گا، اس کا کلام کبھی ختم نہیں ہوگا۔

کلام باعتبارِ نوع اللہ تعالیٰ کے حق میں ازلی وابدی ہے البتہ مفرداتِ کلام، اللہ تعالیٰ کی منشاء وحکمت کے مطابق آہستہ آہستہ صادر ہوتے رہیں گے۔

قرآن، اللہ تعالیٰ کا کلام میں سے ہے اور یہ اس کی سب سے عظیم کتاب ہے، ایمان بالکتب میں قرآن بھی داخل ہے، بلکہ اسے تو اولیت حاصل ہے، یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کے ساتھ کلام فرمایا ہے اور اسے اپنے رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا ہے، یہ قرآن منزل (نازل کیا ہوا) ہے مخلوق نہیں ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کی اضافت اپنی طرف فرمائی ہے اور یہ اضافت "اضافة الصفة الی موصوفها" کی قبیل سے ہے، اور یہ بات مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مخلوق نہیں ہیں، لہذا اس کا کلام بھی مخلوق نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں کچھ گروپوں نے اہل السنۃ والجماعۃ کی مخالفت کی ہے، ان کے نام مع ان کے نظریات ذیل میں دیئے جا رہے ہیں۔

(۱) **الجہمیۃ**: ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کلام نہیں فرماتا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے کلام کو اپنے غیر میں پیدا فرمایا ہے، اور اسے کلام اللہ سے تعبیر فرمایا ہے، ان کا کہنا ہے کہ کلام کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف مجازاً ہے حقیقتاً نہیں کیوں کہ خالقِ کلام وہی ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے کا معنی خالق الکلام فی غیرہ (کلام کو دوسروں میں پیدا کرنے والا) سے کرتے ہیں۔

جہمیہ کا یہ نظریہ بالکل باطل ہے عقلی اور نقلی دلائل کے بالکل خلاف ہے، سلفِ صالحین اور ائمۃ المسلمین کے قول کے خلاف ہے، کیونکہ عقلاً متکلم اس کو کہا جاتا ہے جس نے حقیقتاً کلام کی ہو۔

یوں کہنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے" اور قائل کوئی دوسرا ہو، نیز یہ بات کیسے درست ہوسکتی ہے کہ کہا تو کلام اللہ جائے لیکن وہ کلام کسی دوسرے کا ہو۔

مصنف رحمہ اللہ اپنے قول: "منه بدأ واليه يعود وأن الله تكلم به حقيقة. وأن هذا القرآن الذى أنزله على محمد ﷺ هو كلام الله حقيقة لا كلام غيره" سے جہمیہ کا رد فرما رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ قرآن کا ظہور اللہ کی طرف سے نہیں ہوا، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حقیقتاً کلام نہیں فرمایا، کلام کی نسبت اللہ کی طرف مجازی ہے، قرآن درحقیقت اللہ کے غیر کا کلام ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت اس لئے ہے کہ اس کا خالق اللہ ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کے قول "منه بدأ واليه يعود" میں من ابتداء الغایۃ کیلئے ہے مطلب یہ ہے کہ قرآن کا ظہور اور صدور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہی اسے کلام فرمایا ہے، اور اس قرآن نے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ جانا ہے، کیونکہ آخری زمانہ میں قرآن کو اٹھا لیا جائے گا، لوگوں کے سینوں اور صحائف میں کچھ بھی باقی نہیں رہے گا، قربِ قیامت قرآن کا اٹھایا جانا علاماتِ قیامت میں سے ایک علامت ہے۔

"الیہ یعود" کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آخری زمانہ میں قرآن کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے گی، کسی اور کی طرف نہیں۔

(۲) **الکلابیۃ**: یہ عبداللہ بن سعید بن کلاب کے اتباع ہیں، قرآن کے متعلق ان کا نظریہ ہے کہ قرآن کلام اللہ نہیں ہے بلکہ کلام اللہ سے حکایت ہے، کیونکہ ان کے نزدیک کلام اللہ کی تعریف یہ ہے کہ "ھو المعنی القائم فی نفسہ لازم لہ کلزوم الحیاۃ والعلم لایتعلق بمشیئتہ وارادتہ" (یعنی کلام اللہ اس معنی کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات میں قائم ہے اور اس کی ذات کیلئے ایسے لازم ہے جس طرح حیات اور علم اس کی ذات کو لازم ہیں کلام کا اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ سے کوئی تعلق نہیں)

ان کا کہنا ہے کہ یہ معنی جو اس کی ذات میں قائم ہے، غیر مخلوق ہے، البتہ یہ الفاظ جو کہ حروف واصوات پر مشتمل ہیں، مخلوق ہیں، یہ الفاظ کلام اللہ نہیں ہیں بلکہ کلام اللہ سے حکایت ہیں۔

(۳) **الاشاعرۃ**: یہ ابوالحسن الأشعری کے اتباع ہیں: ان کا کہنا ہے کہ قرآن کلام اللہ کی تعبیر ہے، کیونکہ یہ کلام اللہ کی تعریف "معنی قائم بنفسہ" (وہ معنی جو اللہ کی ذات میں قائم ہے) سے کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ معنی غیر مخلوق ہے، البتہ یہ الفاظ جو پڑھے جاتے ہیں یہ اس معنی قائم بنفسہ کی تعبیر ہیں، اور یہ الفاظ مخلوق ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ان الفاظ کو اس معنی قائم بنفسہ سے حکایت کہنا درست نہیں۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ اشاعرہ اور کلابیہ کا یہ اختلاف محض لفظی ہے، کیونکہ ان دونوں گروہوں کا کہنا ہے کہ قرآن کی دو نوع ہیں: الفاظ اور معانی۔ الفاظ مخلوق ہیں اور یہ وہی الفاظ ہیں جو قرآن پاک میں موجود ہیں۔ اور معانی قدیم ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہیں، جو درحقیقت ایک ہی معنی ہیں، جن میں ابعاض اور تعدد نہیں ہے۔ بہر حال یہ دونوں قول اگر ایک نہیں تو قریب قریب ضرور ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ نے ان دونوں اقوال کو باطل قرار دیا ہے، چنانچہ "ولا یجوز اطلاق القول بانہ حکایۃ عن کلام اللہ" میں کلابیہ کا رد ہے۔ "أو عبارۃ عنہ" میں اشاعرہ کا رد ہے۔

پھر قرآن کے متعلق صحیح موقف بیان کرتے ہوئے فرمایا: "بل اذا قرأہ الناس أو کتبوہ فی المصاحف لم یخرج بذلک عن أن یکون کلام اللہ حقیقۃ" یعنی (قرآن مجید کے الفاظ ومعانی دونوں کلام اللہ ہیں چاہے یہ الفاظ ومعانی سینوں میں محفوظ ہوں یا زبان پر متلو ہوں یا مصاحف میں مکتوب ہوں، ہر حال میں حقیقتاً کلام اللہ ہیں، کسی بھی حالت میں کلام اللہ سے خارج نہیں۔

پھر شیخ رحمہ اللہ نے اس کی دلیل دیتے ہوئے فرمایا: "فان الکلام انما یضاف حقیقۃ الی من قالہ مبتدئا لا الی من قالہ مبلغا مؤدیا" (ترجمہ گزر چکا ہے) یعنی مبلغ ومؤدی کی طرف نسبت حقیقی نہیں ہوتی بلکہ وہ تو فقط واسطہ ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ﴾

ترجمہ: "اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ طلب کرے تو، تو اسے پناہ دے دے یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے" (التوبہ:۶)

اس آیت میں سماع بواسطہ مبلغ کے ہے البتہ مسموع (قرآن) کو کلام اللہ کہا گیا ہے، یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ کلام کی اضافت اس کی طرف ہوتی ہے جس نے ابتداءً کلام کیا ہو۔

(۴) **معتزلہ**: ان کا کہنا ہے کہ کلام اللہ صرف حروف ہوتے ہیں معانی نہیں۔ ان کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ قول یا کلام عند الاطلاق صرف لفظ کا نام ہوتے ہیں، جبکہ معنی اس لفظ کا جزء نہیں بلکہ مدلول ہوتا ہے۔ معتزلہ کے مقابل اشاعرہ اور کلابیہ ہیں جن کا نظریہ ہے کہ کلام اللہ معانی ہے حروف نہیں۔

أھل السنۃ والجماعۃ کا مذہب اس مسئلہ میں یہ ہے کہ قرآن کے حروف ومعانی دونوں کلام اللہ ہیں اور یہی مذہب حق ہے کیونکہ کتاب وسنت کے نصوص اس مذہب پر دلالت کر رہے ہیں۔

وجوب الایمان برؤیۃ المؤمنین ربھم
یوم القیامۃ ومواضع الرؤیۃ

قیامت کے دن مؤمنوں کے اپنے رب کو دیکھنے پر ایمان لانے کے وجوب کا بیان اور رؤیتِ باری تعالیٰ کے مقامات کا بیان

فصل

قال رحمه الله: وقد دخل أيضا فيما ذكرناه من الايمان به وبكتبه وملائكته وبرسله الايمان بأن المؤمنين يرونه يوم القيامة عيانا بأبصارهم، كما يرون الشمس صحوا ليس دونها سحاب، وكمايرون القمر ليلة البدر لايضامون في رؤيته. يرونه سبحانه وهم في عرصات القيامة. ثم يرونه بعد دخول الجنة كما يشاء الله.

ترجمہ: ایمان باللہ، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکۃ اور ایمان بالرسل میں اس بات پر ایمان لانا بھی داخل ہے کہ اہل ایمان قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو واضح طور حقیقتاً اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، جس طرح لوگ بے ابر دن میں سورج کو دیکھتے ہیں، اور جس طرح لوگ چودھویں رات کے چاند کو بغیر کسی مشقت وتکلیف کے دیکھتے ہیں، یہ دیکھنا اولاً قیامت کے میدانوں میں اور پھر دخولِ جنت کے بعد ہوگا، یہ دیکھنا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہوگا۔

عبارت کی تشریح

شرح

اللہ تعالیٰ کو دیکھنے پر ایمان لانا ایمان باللہ، ایمان بالکتب اور ایمان بالرسل میں اس لیئے داخل ہے کہ اس رؤیت کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں دی ہے، اور اس رؤیت کی خبر اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے دی ہے، لہذا جو اس رؤیت پر ایمان نہیں لاتا اس نے اللہ کی، اسکے رسولوں کی اور اس کی کتابوں کی تکذیب کی ہے، اس لئے کہ اللہ، اس کے رسولوں اور اسکی کتابوں پر ایمان لانے میں یہ بات داخل ہے کہ اللہ، اسکے رسولوں اور اسکی کتابوں نے جو خبر دی ہے اس پر بھی ایمان لایا جائے۔ رؤیتِ باری تعالیٰ حقیقت ہے مجازاً نہیں جیسا کہ معطلہ کا عقیدہ ہے۔

رؤیتِ باری تعالیٰ حقیقتاً ہوگی، اس رؤیت میں کسی قسم کی مشقت نہیں ہوگی۔

مصنف رحمہ اللہ اپنے قول: ''یرونه سبحانه وهم في عرصات القيامة ثم يرونه بعد دخول الجنة'' میں ان مقامات کا بیان فرما رہے ہیں جن میں اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ کی رؤیت نصیب ہوگی۔

چنانچہ مصنف رحمہ اللہ نے دو مقامات کا ذکر فرمایا ہے:

(۱) **عرصات القیامۃ**: العرصات، عرصۃ کی جمع ہے، ''عرصۃ'' وسیع میدان جس میں کوئی عمارت وغیرہ نہ ہو کو کہا جاتا ہے، یہاں مراد حساب وکتاب کے مختلف مواقف ہیں۔

عرصات القیامۃ میں رؤیت باری تعالیٰ کیا صرف اہلِ ایمان کے ساتھ خاص ہوگی؟ اس مسئلہ میں اہلِ علم کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول: وہاں اہلِ ایمان، کفار اور منافقین وغیرہ سب کو رؤیت حاصل ہوگی۔

دوسرا قول: یہ رؤیت صرف اہلِ ایمان اور منافقین کو حاصل ہوگی اور کفار محروم رہیں گے۔

تیسرا قول: یہ رؤیت بھی صرف اہلِ ایمان کو نصیب ہوگی۔ (واللہ اعلم)

(۲) بعد دخول الجنۃ: یعنی اہلِ ایمان دخولِ جنت کے بعد اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔

کتاب وسنت میں اس بات پر دلائل موجود ہیں، بعض ادلہ بمع شرح ذکر ہو چکے ہیں، نیز گزشتہ صفحات میں رؤیتِ باری تعالیٰ کی نفی کرنیوالوں کے شبہات اور ان شبہات پر رد کا بیان گزر چکا ہے۔

الجنۃ لغت میں باغ کو کہتے ہیں، شریعت میں اس سے مراد وہ رہائش گاہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کیلئے تیار کر رکھی ہے، اور یہ رہائش ہر اعتبار سے کامل ومکمل نعمتوں والی ہے۔

شیخ رحمہ اللہ کے قول: '' کما یشاء اللہ '' کا مطلب ہے کہ رؤیتِ باری تعالیٰ بغیر احاطہ کے ہے، اور اس رؤیت کی کوئی کیفیت بھی بیان نہیں کی جا سکتی، بلکہ جیسے وہ چاہے گا اور جیسے اس کے شایانِ شان ہوگی۔

ما یدخل فی الایمان بالیوم الآخر

روزِ آخرت سے متعلق امور کا بیان

فصل

(۱) احوالِ قبر

قال رحمه الله: ومن الايمان باليوم الآخر الايمان بكل ما أخبر به النبي ﷺ مما يكون بعد الموت، فيؤمنون بفتنة القبر وبعذاب القبر ونعيمه. فأما الفتنة فان الناس يفتنون في قبورهم فيقال للرجل: من ربك؟ وما دينك؟ ومن نبيك؟ فيثبت الله الذين آمنوا بالقول الثابت في الحياة الدنيا وفي الآخرة. فيقول المؤمن: ربي الله والاسلام ديني ومحمد ﷺ نبيي. وأما المرتاب فيقول: هاه هاه، لاادري، سمعت الناس يقولون شيئا فقلته. فيضرب بمرزبة من حديد، فيصيح صيحة يسمعها كل شيء الا الانسان، ولو سمعها الانسان لصعق ثم بعد هذه الفتنة اما نعيم واما عذاب.

۞ ۞ ۞

ترجمہ: موت کے بعد پیش آمدہ احوال وواقعات جن کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی ہے پر ایمان لانا بھی ایمان بالیوم الآخر میں داخل ہے، لہٰذا اہلِ ایمان فتنہ عذابِ قبر اور نعیمِ قبر سب پر ایمان لاتے ہیں۔

فتنہ القبر: فتنۃ القبر سے مراد قبر میں کیئے جانے والے سوالات ہیں، چنانچہ تمام لوگوں سے یہ سوال کیئے جائیں گے، من ربک؟ ''تمہارا رب کون ہے'' ما دینک؟

"تمہارا دین کیا ہے" من نبیک ؟ "تمہارا نبی کون ہے"

اہلِ ایمان کو تو اللہ کلمۂ شہادت (لا الہ الا اللہ) کے ذریعے دنیا وآخرت میں ثابت قدم رکھے گا، چنانچہ مؤمن جواب میں کہے گا: میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے، اور میرے نبی محمد ﷺ ہیں، جبکہ دنیا میں شکوک وشبہات میں گھرا ہوا انسان جواب میں کہے گا: "ھاہ ھاہ لاادری سمعت الناس یقولون شیئا فقلتہ ." "(یعنی میں نہیں جانتا میں تو لوگوں سے جو کچھ سنا کرتا وہی کچھ کہہ دیا کرتا تھا) چنانچہ لوہے کے ہتھوڑے سے اس کو مارا جائے گا، شدتِ تکلیف سے وہ زور سے چیخ مارے گا جسے انسان کے علاوہ ہر چیز سنے گی، اگر انسان اس چیخ وپکار کو سن لے تو بیہوش ہو کر گر پڑے۔

اس فتنہ (سوال وجواب) کے بعد یا تو ہمیشہ کی نعمتیں ہیں یا پھر ہمیشہ کا عذاب ہے

عبارت کی تشریح

...... **شرح** ......

الیوم الآخر سے مراد یومِ قیامت ہے، یوم الآخر پر ایمان ارکانِ ایمان میں سے ایک رکن ہے، عقل وفطرت یوم الآخر کے اثبات پر دال ہیں، تمام آسمانی کتب میں اس کی تصریح موجود ہے، تمام انبیاء ومرسلین نے بھی اس کی خبر دی ہے، دنیا سے مؤخر ہونے کی وجہ سے اس دن کو یوم الآخر کہا جاتا ہے۔

شیخ رحمہ اللہ نے ایمان بالیوم الآخر کے معنی کیلئے ایک جامع ضابطہ ذکر فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ ایمان بالیوم الآخر یہ ہے کہ موت کے بعد پیش آمدہ تمام احوال وواقعات جن کی خبر رسول اللہ نے دی ہے پر ایمان لایا جائے، جیسے حالتِ نزع، قبر میں میت کی حالت، قبور سے مردوں کا اٹھایا جانا اور بعد کے تمام احوال......

اس کے بعد شیخ رحمہ اللہ نے قبر سے متعلق بعض امور کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اور دو امور کو ذکر فرمایا:

الأمر الاول: فتنة القبر : فتنہ کا لغوی معنی امتحان اور آزمائش ہے، جبکہ یہاں فتنہ سے مراد، دو فرشتوں کا میت سے سوال کرنا ہے، میت خواہ مرد ہو یا عورت۔ عام طور پہ اس موقع پر مرد ہی کا ذکر ہوتا ہے جو کہ از قبیلِ تغلیب ہوتا ہے۔ پھر مؤلف رحمہ اللہ نے ان تین سوالوں کا ذکر کیا ہے جو فرشتوں کی طرف سے میت پر پیش ہوتے ہیں۔ نیز یہ بتایا ہے کہ مؤمن کا جواب کیا ہوگا اور غیر مؤمن کا کیا۔ اس جواب کے بعد قبر میں نعمتوں یا تکلیفوں کے حاصل ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔

قبر میں فرشتوں کے سوال کرنے پر ایمان لانا واجب ہے، کیونکہ اس موضوع کی احادیث حدِ تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں، قرآن کریم کی یہ آیت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے:

﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ. وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظَّالِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ ﴾ (ابراهيم:27)

ترجمہ: "ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ پکی بات کے ساتھ مضبوط رکھتا ہے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، ہاں ناانصاف لوگوں کو اللہ بہکا دیتا ہے اور اللہ جو چاہے کر گزرے"

چنانچہ صحیحین میں جناب براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی ﷺ نے فرمایا: [آیت "يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا......" عذابِ قبر کے متعلق نازل ہوئی ہے]

صحیح مسلم میں مزید یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ [قبر میں مؤمن سے سوال ہوتا ہے: من ربک؟ تو وہ جواب دیتا ہے: میرا رب اللہ ہے، اور میرے نبی محمد ﷺ ہیں تو آیتِ کریمہ "يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا......" میں ثابت قدمی سے مراد مؤمن کا قبر میں صحیح اور درست جواب دینا ہے]

آیتِ کریمہ میں القول الثابت سے مراد کلمۂ توحید ہے، جو کہ ہر مؤمن کے دل میں حجت وبرہان کے ساتھ ثابت ہے۔ مؤمنوں کا اس کلمہ کے ساتھ دنیا میں ثابت قدم رہنے کا معنی یہ ہے

کہ اہلِ ایمان اس کلمہ کو مضبوطی سے تھامے رکھتے ہیں چاہے اس راہ میں انہیں کتنی ہی تکالیف اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے، اور آخرت میں اس کلمہ کے ساتھ ثابت قدم رہنے کا معنی یہ ہے کہ قبر میں فرشتوں کے سوالات کا صحیح اور درست جواب دینے کی انہیں توفیق نصیب ہوتی ہے۔

مؤمن کے برعکس مرتاب (شکوک وشبہات میں مبتلا شخص) فرشتوں کے سوالات پر ھاہ ھاہ کہتا ہے۔ ''ھاہ ھاہ'' ایک ایسا کلمہ ہے جو تردد اور اظہارِ تکلیف کے موقع پر ادا کیا جاتا ہے۔ نیز وہ کہتا ہے: [لا ادری سمعت الناس یقولون شیئا فقلتہ] (مجھے کچھ معلوم نہیں جو لوگ کہتے تھے میں بھی وہ کہتا تھا) کیوں کہ یہ شخص پیغمبر کی لائی ہوئی شریعت پر کامل ومکمل ایمان نہیں رکھتا تھا اس لئے اس پر جواب دینا مشکل ہوجاتا ہے اگر چہ دنیاوی اعتبار سے وہ کتنا ہی علم ومعرفت اور فصاحت وبلاغت کا حامل کیوں نہ ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس آیت میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے: ﴿ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ﴾

ترجمہ: ''ہاں ناانصاف لوگوں کو اللہ بہکا دیتا ہے''

تو ایسے شخص کو لوہے کے بڑے ہتھوڑے کے ساتھ ضرب لگائی جاتی ہے، ضرب کی تکلیف سے وہ زور سے چیختا ہے، جسے انسان کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے، آپ ﷺ نے انسان کے عدمِ سماع کی حکمت یہ بتائی ہے کہ اگر انسان اس دردناک چیخ کو سن لے تو مر جائے یا بیہوش ہوکر گر پڑے، قبر میں میت پر طاری ہونے والے احوال کے انسانوں کے عدمِ احساس وادراک کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے امورِ غیب میں رکھا ہے، کیونکہ اگر ان احوال وکیفیات کو ظاہر کردیا جائے تو حکمت مطلوبہ یعنی ایمان بالغیب فوت ہوجائے گی۔

الأمر الثانی: قبر میں میت کو پیش آنے والا دوسرا معاملہ نعمتوں یا تکلیفوں کا ہے، (چنانچہ مؤمن مستحقِ نعمت قرار پائیں گے اور مرتاب یعنی شک وشبہ میں رہنے والے مستحقِ عذاب) اور دونوں کی یہ حالت قیامتِ کبریٰ کے قائم ہونے تک برقرار رہے گی۔ مصنف رحمہ اللہ کی اس تصریح سے مقصود اثبات عذاب القبر ونعیم القبر ہے۔

اس مسئلہ میں اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب یہی ہے کہ میت یا تو نعمتوں میں ہوتی ہے یا پھر عذاب میں، اور یہ عذاب یا نعمت روح اور بدن دونوں کو لاحق ہوتا ہے، یہ بات احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے، لہذا اس بات پر ایمان لانا واجب ہے، البتہ اس کی کیفیت وصفت کے متعلق کلام نہیں کی جاسکتا کیونکہ یہ امور عقل کے ادراک سے باہر ہیں، یہ اس لئے کہ ان کا تعلق امور آخرت سے ہے اور امورِ آخرت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے یا پھر رسولوں کو اور انہیں بھی اللہ تعالیٰ ہی مطلع فرماتا ہے۔

معتزلہ عذابِ قبر کا انکار کرتے ہیں ان کا شبہ یہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی میت پر عذاب کا ادراک نہیں کیا، اور نہ ہی کبھی میت کو عذاب ہوتے ہوئے یا میت سے سوالات ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

اس شبہ کا ہماری طرف سے جواب یہ ہے کہ ہمارا عدمِ ادراک اور عدمِ رؤیت کسی چیز کے عدمِ وجود یا عدمِ وقوع کی دلیل نہیں بن سکتی، کتنی ہی اشیاء ایسی ہیں جو ہمیں دکھائی نہیں دیتی حالانکہ وہ موجود ہیں، عذاب القبر اور نعیم القبر بھی اس قبیل کی اشیاء سے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے امرِ آخرت اور اس کے متعلقات کو غیب میں رکھا ہے اور اس دنیا میں اسے عقل کے ادراک سے پردے میں رکھا ہے تاکہ غیب پر ایمان لانے والوں اور نہ لانے والوں میں تمیز ہوسکے، پھر امورِ آخرت کو امورِ دنیا پر قیاس کرنا بھی درست نہیں ہے (واللہ اعلم)

عذابِ قبر کی دو قسمیں ہیں:

النوع الاول: ہمیشہ کا عذاب، یہ معاملہ کافر کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ﴾ (الغافر:۴۶)

النوع الثانی: کچھ مدت کیلئے عذاب ہوتا ہے پھر منقطع ہوجاتا ہے، یہ معاملہ اس مؤمن کے ساتھ ہوسکتا ہے جو نافرمانیوں کا مرتکب رہا ہو، چنانچہ اسے بقدرِ جرم عذاب دیکر بالآخر تخفیف کردی جائے گی اور دعا یا صدقہ یا استغفار کی وجہ سے اس کا عذاب کلی طور پر ٹل بھی سکتا ہے۔

٢. القيامة الكبرى وما يجري فيها

قیامتِ کبریٰ اور اس میں جاری ہونیوالے امور

الى أن تقوم القيامة الكبرى فتعاد الأرواح الى الأجساد .وتقوم القيامة التى أخبر الله بها فى كتابه وعلى لسان رسوله ، وأجمع عليها المسلمون، فيقوم الناس من قبورهم لرب العالمين حفاة عراة غرلا .

۞ ۞ ۞

ترجمہ: حتی کہ قیامت قائم ہوجائے گی، چنانچہ ارواح کو اجساد میں لوٹا دیا جائے گا، لوگ اپنی اپنی قبروں سے اللہ رب العالمین کے سامنے پیش ہونے کیلئے ننگے پاؤں، ننگے جسم اور غیر مختون حالت میں اٹھیں گے، قیامِ قیامت کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اپنے رسول ﷺ کی زبان سے دی ہے، جمیع مسلمانوں کا قیامِ قیامت پر اجماع ہے۔

عبارت کی تشریح

...... **شرح** ......

شیخ رحمہ اللہ اس عبارت اور اس کے مابعد عبارت سے قیامِ قیامت سے شروع ہونے والے آخرت کے احوال وواقعات کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں۔

دار (گھر) تین قسم کا ہے: دارالدنیا، دارالبرزخ، دارالآخرۃ۔

ہر گھر کے الگ احکام ہیں جو اس گھر کے ساتھ مختص ہیں، اسی طرح ہر گھر کے الگ احوال ہیں جو اس گھر میں جاری ہوتے ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ دارالبرزخ کے احکام واحوال پر گفتگو فرما چکنے کے بعد دارالآخرت کے احکام پر روشنی ڈال رہے ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ نے قیامت کو قیامتِ کبریٰ کہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کی دو قسمیں ہیں:

قیامتِ صغریٰ اور قیامتِ کبریٰ۔

قیامتِ صغریٰ سے مراد موت ہے، یہ قیامت ہر انسان پر الگ الگ لاحق ہوتی ہے، اس کے وقوع سے روح نکل جاتی ہے اور اعمال منقطع ہوجاتے ہیں، جبکہ قیامتِ کبریٰ تمام انسانوں پر قائم ہوگی اور ایک ہی جھٹکے میں سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیگی، اسے قیامت اس لیئے کہا جاتا ہے کہ اس کے واقع ہوتے ہی تمام انسان اللہ رب العالمین کے سامنے پیش ہونے کیلئے اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

ارواح کو اجساد میں لوٹایا جانا اسرافیل علیہ السلام کے صور پھونکنے کے موقعہ پر ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ .قَالُوْا ياويلنا من بعثنا من مرقد نا ﴾ (يس:٥١،٥٢)

ترجمہ: (تو صور کے پھونکے جاتے ہی سب کے سب اپنی قبروں سے اپنے پروردگار کی طرف (تیز تیز) چلنے لگیں گے۔ کہیں گے ہائے ہائے ہماری خوابگاہوں سے کس نے اٹھادیا)

نیز فرمایا ﴿ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴾ (الزمر:٦٨)

ترجمہ: (پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا پس وہ ایک دم کھڑے ہو کر دیکھنے لگ جائیں گے)

ارواح، روح کی جمع ہے، روح اس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان اور دیگر ذوات الارواح زندہ ہیں، حقیقتِ روح کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ ﴾ (اسراء:٨٥)

ترجمہ: (اور یہ لوگ آپ سے روح کی بابت سوال کرتے ہیں، آپ جواب دے دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے)

بعث بعد الموت (قیامت) کتاب وسنتِ رسول اللہ ﷺ، اجماعِ المسلمین عقل اور فطرتِ سلیمہ سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کی اکثر سورتوں میں قیامِ قیامت کی خبر دی ہے، اس کے دلائل بیان فرمائے ہیں اور منکرینِ قیامت کا رد فرمایا ہے، کیونکہ ہمارے نبی ﷺ خاتم النبیین ہیں اس لئے باقی انبیاء کی بنسبت آپ ﷺ نے آخرت کو زیادہ تفصیل سے بیان فرمایا ہے، اس قدر تفصیلی بیان انبیاءِ سابقین کی کتب میں نہیں ملتا۔

جزائے اعمال عقلاً اور شرعاً ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر عقول کو اس بات کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت وحمد کے لائق نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو بلا مقصد تخلیق فرمائے، اور لوگوں کو مہمل چھوڑ دے کہ نہ تو ان کیلئے احکامات (اوامر ونواہی) ہوں اور نہ ہی ان کیلئے ثواب وعقاب کا سلسلہ ہو اور یہ نیک وبد اور مسلم ومجرم سب یکساں ہوں؟ کیونکہ یہ مشاہداتی بات ہے کہ بسا اوقات نیک آدمی، نیکی کا صلہ وبدلہ لیئے بغیر وفات پا جاتا ہے اور مجرم جرم کی سزا بھگتے بغیر وفات پا جاتا ہے، لہذا اجزاء وسزاء پانے کیلئے ایک گھر کا ہونا ضروری ہے، اور وہ دار الآخرت ہے۔

منکرینِ قیامت کافر ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ﴾ (التغابن:۷)

ترجمہ: ''ان کافروں نے خیال کیا ہے کہ دوبارہ زندہ نہ کئے جائیں گے''

شیخ رحمہ اللہ نے قبروں سے اٹھائے جانے کے وقت ان کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ ننگے پاؤں، ننگے جسم اور غیر مختون حالت میں ہوں گے، اس کی دلیل صحیحین کی یہ حدیث ہے: عن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان رسول اللہ ﷺ قال: [انکم تحشرون الی اللہ یوم القیامۃ حفاۃ عراۃ غرلا] (الحدیث)

ترجمہ: سیدۃ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [تم لوگ ننگے پاؤں، ننگے جسم اور غیر مختون حالت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کئے جاؤ گے۔

۳. مایجری فی یوم القیامة

احوالِ روزِ قیامت

وتدنو منهم الشمس ويلجمهم العرق، فتنصب الموازين فتوزن بها أعمال العباد: ﴿ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولٰئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْا أَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خَالِدُوْنَ ﴾ (المؤمنون:۱۰۲،۱۰۳) وتنشر الدواوين (وهي صحائف الأعمال) فآخذ كتابه بيمينه وآخذ كتابه بشماله أو من وراء ظهره كما قال سبحانه وتعالىٰ: ﴿ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا. اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴾ (الاسراء:۱۳،۱۴) ويحاسب الله الخلائق ويخلو بعبده المؤمن فيقرره بذنوبه، كما وصف ذلك في الكتاب والسنة وأما الكفار فلايحاسبون محاسبة من توزن حسناته وسيئاته؛ فانهم لاحسنات لهم ولكن تعدأعمالهم فتحصى فيوقفون عليها ويقررون بها ويجزون بها.

۞ ۞ ۞

ترجمہ: روزِ قیامت سورج لوگوں کے بالکل قریب ہو جائے گا، پسینہ ان کے نتھنوں تک پہنچ چکا ہوگا، ترازو قائم کئے جائیں گے اور ان ترازوؤں سے بندوں کے اعمال تولے جائیں گے

﴿ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولٰئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْا أَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خَالِدُوْنَ ﴾ (المؤمنون:۱۰۲،۱۰۳)

ترجمہ: ''جن کی ترازؤوں کا پلہ بھاری ہوگیا وہ تو نجات پانے والے ہوگئے۔ اور جن کی ترازو کا پلہ ہلکا ہوگیا یہ ہیں وہ جنہوں نے اپنا نقصان آپ کرلیا جو ہمیشہ کیلئے جہنم واصل ہوئے''

دواوین یعنی صحائف اعمال پھیلا دیئے جائیں گے، کوئی اپنا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں اٹھائے گا، کوئی بائیں ہاتھ میں اور کوئی پیٹھ پیچھے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا . اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴾ (الاسراء:۱۳،۱۴)

ترجمہ: ''ہم نے ہرانسان کی برائی بھلائی کو اس کے گلے میں لگا دیا ہے اور بروزِ قیامت ہم اس کے سامنے اس کا نامہ اعمال نکالیں گے جسے وہ اپنے اوپر کھلا ہوا پالے گا۔ لے! خود ہی اپنی کتاب آپ پڑھ لے، آج تو تو آپ ہی اپنا خود حساب لینے کو کافی ہے''

اللہ تعالیٰ مخلوق کا حساب خود ہی لے گا اور اپنے مؤمن بندے سے خلوت میں گناہوں کا اعتراف واقرار کرائے گا۔ یہ سب باتیں کتاب وسنت میں مذکور ہیں، البتہ کفار کا محاسبہ نیکیوں اور بدیوں کا وزن کر کے نہیں ہوگا، کیونکہ ان کی تو سرے سے نیکیاں ہی نہیں ہونگی، بلکہ ان کے اعمال شمار کر کے انہیں مطلع کیا جائے گا اور وہ اقرار بھی کرلیں گے، پھر اس کے مطابق انہیں بدلہ دیا جائے گا۔

عبارت کی تشریح

...... **شرح** ......

شیخ رحمہ اللہ اس عبارت میں کتاب وسنت کی روشنی میں بعض احوالِ قیامت کا تذکرہ فرمارہے ہیں احوالِ قیامت کا ادراک عقل سے نہیں بلکہ نبی ﷺ کی احادیث صحیحہ سے ہی ممکن ہے، کیونکہ

نبی ﷺ وہ ذات ہیں جو محض اپنی رائے وخواہش سے نہیں بولتے بلکہ وحی الٰہی سے کلام فرماتے ہیں: ﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ اللہ تعالیٰ کا علم مخلوق کے اعمال واحوال کو محیط ہے اس کے باوجود محاسبہ اعمال، وزن اعمال اور صحائف میں اعمال کا مکتوب کیا جانا کی حکمت یہ ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کے کمالِ حمد، کمالِ عدل، وسعت رحمت اور عظمتِ بادشاہت کو دیکھ سکیں۔

شیخ رحمہ اللہ نے احوالِ قیامت میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر فرمایا ہے:

(۱) ''أن تدنو منهم الشمس '' (سورج لوگوں کے سروں کے قریب ہوجائے گا)

چنانچہ صحیح مسلم میں مقداد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

[اذا كان يوم القيامة أدنيت الشمس من العباد حتى تكون قدر ميل أو ميلين]

ترجمہ: [روزِ قیامت سورج ایک یا دو میل کی مسافت کے بقدر بندوں کے قریب ہوجائے گا]

سورج کے اتنے قریب ہونے سے شدتِ گرمی کی وجہ سے خوب پسینہ جاری ہوگا یہاں تک کہ لوگوں کے چہروں تک پہنچ جائے گا۔

شیخ رحمہ اللہ کا قول'' ويلجمهم العرق '' (یعنی پسینے نے انہیں لگام ڈالی ہوئی ہوگی) کا مطلب ہے کہ سورج قریب ہونے سے شدتِ گرمی کی وجہ سے لوگوں پر خوب پسینہ جاری ہوگا یہاں تک کہ ان کے منہ تک پہنچ جائے گا اور ان کیلئے بمنزلہ لگام بن جائے گا، لوگ اس وجہ سے کلام بھی نہیں کرسکیں گے، اکثر لوگوں کا یہی حال ہوگا، البتہ انبیاء اور دیگر وہ جنہیں اللہ تعالیٰ چاہے گا اس تکلیف سے مستثنیٰ ہوں گے۔

(۲) ''وتنصب الموازين وتوزن بها الأعمال '' (میزان قائم کیئے جائیں گے اور ان سے اعمال کا وزن کیا جائے گا)

موازین، میزان کی جمع ہے، یہاں میزان سے مراد وہ ترازو ہے جس سے نیکیاں اور بدیاں تولی جائیں گی، یہ میزان حقیقی ہے، اس کا کانٹا اور دو پلڑے ہوں گے۔ میزان بھی امورِ آخرت سے تعلق رکھتا ہے، حدیث میں جس طرح اس کا ذکر آیا ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، اس کی کیفیت وغیرہ سے بحث نہیں کرتے۔

وزنِ اعمال میں حکمت یہ ہے کہ مقادیرِ اعمال ظاہر کی جائیں تاکہ ان کے مطابق جزا مرتب ہو سکے۔

آیتِ کریمہ: ''فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' کا مطلب ہے کہ جن کی نیکیاں ان کی بدیوں پر بھاری ہو گئیں وہ آگ سے نجات پا جائیں گے اور دخولِ جنت کے مستحق ہوں گے۔

آیت کریمہ: ''وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولٰئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْا أَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خَالِدُوْنَ'' کا مطلب ہے کہ جن لوگوں کی بدیاں نیکیوں پر بھاری ہو جائیں گی وہ ناکام ونامراد ہوں گے اور جہنم میں داخل ہوں گے اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

آیتِ کریمہ میں شاہد یہ ہے کہ اس میں موازین کا اثبات ہے، اور یہ وزنِ اعمال روزِ قیامت ہوگا، وزن اور موازین کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقام پر ہوا ہے، نصوص سے پتہ چلتا ہے کہ وزن، عمل، عامل اور صحائف سب کا ہوگا، ان نصوص میں کوئی منافات نہیں ہے، وزن تو سب کا ہوگا لیکن بوجھل اور ہلکا پن ہونے میں اعتبار صرف نفسِ عمل کا ہوگا، ذاتِ عامل اور صحائف کا اعتبار نہیں ہوگا۔

معتزلہ ان نصوص کی تاویل کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ وزن ومیزان سے مراد عدل ہے، ان کی یہ تاویل فاسد ہے اور نصوص، اجماعِ سلفِ صالحین وائمہ امت کے خلاف ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''معتزلہ نے وزن وموازین وغیرہ کا عقلاً محال وناممکن

ہونے کی وجہ سے انکار کیا ہے، عقلاً محال وناممکن ہونا کسی کیلئے حجت نہیں ہے، معتزلہ کے عقول اگر ان امور کو قبول نہیں کرتے تو صحابہ، تابعین، اور تبع تابعین کے عقول جو کہ ان کے عقول سے قوی ہیں، نے ان امور کو قبول کیا ہے، لیکن جب بدعات اندھیری رات کے اندھیرے کی طرح پھیل گئیں تو جس کی مرضی میں جو آیا اس نے وہی کہا اور لوگوں نے شریعت کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا''
اور امورِ آخرت کا ادراک عقل سے نہیں کیا جا سکتا۔ (واللہ اعلم)

(۳) ''وتنشر الدواوين وهي صحائف الأعمال'' (رجسٹر یعنی صحائفِ اعمال پھیلا دیئے جائیں گے) صحائف سے مراد وہ رجسٹر ہیں جس میں بندوں کے دنیا میں کیئے ہوئے اعمال درج ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ نگران فرشتے ان اعمال کو لکھتے ہیں، عند الموت ان صحائف کو لپیٹ دیا جاتا ہے، اور روزِ قیامت انہیں لوگوں کے سامنے پھیلا دیا جائے گا صحائف کا پھیلا دیا جانا یعنی کھول دیا جانا حساب کے موقعہ پر ہوگا، تاکہ ہر انسان اپنے اپنے صحیفہ سے مطلع ہو جائے اور اپنے اعمال کو جان لے۔

شیخ رحمہ اللہ کا قول'' فآخذ كتابه بيمينه وأخذ كتابه بشماله أو من وراء ظهره'' (کوئی اپنا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں اٹھائے گا، کوئی بائیں ہاتھ میں اور کوئی پیٹھ پیچھے) شیخ رحمہ اللہ کی اس عبارت میں لوگوں کے اپنے اپنے صحائف اٹھانے کی کیفیت کا بیان ہے قرآن کریم میں بھی اس کیفیت کا بیان موجود ہے۔

صحائف اعمال اٹھانے کی کیفیت کی دو قسمیں ہیں۔

کچھ لوگ تو دائیں ہاتھ سے اٹھائیں گے، یہ اہل ایمان ہوں گے اور کچھ لوگ بائیں ہاتھ کے ساتھ یا پیٹھ پیچھے سے اٹھائیں گے، یہ کافر ہوں گے۔ پیٹھ پیچھے اور بائیں ہاتھ میں اٹھانے کی کیفیت میں کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ کافر کے دائیں ہاتھ کو تو گردن کے ساتھ باندھ دیا جائے گا اور بائیں ہاتھ کو موڑ کر پیٹھ پیچھے کر دیا جائے گا اور اس میں نامۂ اعمال تھما دیا جائے گا۔

شیخ رحمہ اللہ نے اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے:

﴿ وَكُلَّ اِنسَانٍ أَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِىْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا. اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴾ (الاسراء:۱۳،۱۴)

ترجمہ: ''ہم نے ہر انسان کی برائی بھلائی کو اس کے گلے میں لگا دیا ہے اور بروزِ قیامت ہم اس کے سامنے اس کا نامہ اعمال نکالیں گے جسے وہ اپنے اوپر کھلا ہوا پالے گا۔ لے! خود ہی اپنی کتاب آپ پڑھ لے، آج تو تو آپ ہی اپنا خود حساب لینے کو کافی ہے''

یہاں طائر سے مراد انسان کے اعمالِ خیر وشر ہیں جو اس سے صادر ہوتے ہیں۔

یعنی ہر انسان کا نامۂ اعمال اس کے ساتھ چپکا دیا جائے گا، اور لازماً اسے جزا دی جائے گی، چھٹکارہ کی کوئی صورت نہ ہوگی، یہ نامۂ اعمال اس طرح اس کے ساتھ چپکا ہوا ہوگا جس طرح ہار گردن کے ساتھ چپکا ہوتا ہے ﴿ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ﴾

ترجمہ: ''اور بروزِ قیامت ہم اس کے سامنے اس کا نامہ اعمال نکالیں گے جسے وہ اپنے اوپر کھلا ہوا پالے گا''

یعنی قیامت کے دن انسان کے تمام اعمال کو ایک کتاب میں جمع کر دیا جائے گا، اگر نیک بخت ہوگا تو کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں دے دی جائے گی اور بد بخت ہوگا تو کتاب بائیں ہاتھ میں دے دی جائے گی۔

'' يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا '' منشور بمعنی مفتوح ہے یعنی وہ کتاب کھلی ہوگی تا کہ وہ خود بھی اور دوسرے بھی اس کو پڑھ لیں۔

حسنات کی صورت میں جلد خوشخبری دینے کیلئے ہے اور سیئات کی صورت میں توبیخاً ہے۔

''اِقْرَاْ كِتٰبَكَ'' (اپنا نامہ اعمال پڑھو) یہ حکم اللہ کی طرف سے ہوگا، کہا جاتا ہے کہ اس دن پڑھنا جاننے والے اور نہ جاننے والے سب اپنی کتاب کو پڑھیں گے۔

'' كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا '' (آج تو تو آپ ہی اپنا خود حساب لینے کو کافی ہے) حسیب بمعنی حاسب ہے، اور بوجہ تمییز کے منصوب ہے۔ یہ عظیم عدل ہے کہ ہر انسان کو اسکے نفس کا محاسب بنا دیا جائے تا کہ وہ خود اپنے اعمال دیکھ لے اور کسی عمل کا انکار نہ کر سکے۔

آیتِ کریمہ سے شاہد یہ ہے کہ اس آیت میں اس بات کا اثبات ہے کہ قیامت کے دن ہر انسان کو اس کا صحیفہ عمل دیا جائے گا اور وہ بغور بغیر کسی واسطے کے اسے پڑھے گا اور اپنے اعمال سے آگاہ ہوگا۔

(۴) ''ویحاسب اللہ الخلائق'' (اور اللہ تعالیٰ مخلوق کا حساب لے گا) اللہ تعالیٰ کا حساب لینا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو ان کے اعمال، جنہیں بندے بھول چکے ہوں گے کی یاد دھانی کرائے گا اور پھر جزائے اعمال سے انہیں آگاہ کرے گا۔

دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کا حساب لینا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں کو ان کے محشر سے انصراف سے پہلے ان کے اعمال خواہ خیر ہو یا شر، سے آگاہ کرنا۔

اس کے بعد شیخ رحمہ اللہ نے حساب کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

النوع الاول: مؤمن کا حساب

اس کے متعلق شیخ رحمہ اللہ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ علیحدگی میں مؤمن بندے سے اس کے گناہوں کا اعتراف کرائے گا، جیسا کہ کتاب اللہ وسنت میں وارد ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا . وَيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴾ (الانشقاق:۷تا۹)

ترجمہ: ''تو (اس وقت) جس شخص کے داہنے ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا۔ اس کا حساب تو بڑی آسانی سے لیا جائے گا۔ اور وہ اپنے اہل کی طرف ہنسی خوشی لوٹ آئے گا''

صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

[ان الله یدنی المؤمن فیضع علیه کنفه ویستره من الناس ویقرره بذنوبه ویقول له :أتعرف ذنب کذا. أتعرف ذنب کذا؟ أتعرف ذنب کذا؟ حتی اذا قرره بذنوبه ورأی فی نفسه أن قد هلک ، قال :فانی قد سترتها علیک فی الدنیا ، وأنا أغفرها لک الیوم ثم یعطی کتاب حسناته]

ترجمہ:[...... اللہ تعالیٰ مؤمن کو اپنے نزدیک کر کے اس پر اپنا پردہ عزت ڈال کر اسے چھپائے گا اور اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا، اس سے پوچھے گا کیا تجھے فلاں گناہ یاد ہے؟ کیا تجھے فلاں گناہ یاد ہے؟ کیا تجھے فلاں گناہ یاد ہے؟ اس طرح اللہ تعالیٰ اس سے تمام گناہوں کا اقرار کرائے گا اور وہ شخص اپنے دل میں خیال کرے گا کہ اب میں ہلاک ہو گیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے دنیا میں تیرے گناہ چھپا رکھے تھے اور آج بھی تیرے گناہ معاف کرتا ہوں، پھر اسے نیکیوں کی کتاب دے دی جائے گی]

گناہوں کے اقرار کرانے کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یاد دلانے اور سوال کرنے پر بندہ اپنے گناہوں کا اقرار کرتا جائے گا۔

مؤمنین میں سے بعض ایسے ہوں گے جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے جیسا کہ مشہور حدیث ہے، اس امت کے ستر ہزار افراد بغیر حساب وعذاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔

مؤمنین کے حساب کی مختلف صورتیں ہیں: (۱) حساب یسیر (آسان حساب) اس میں صرف بندے کے سامنے اس کے اعمال پیش کئے جائیں گے۔

(۲) **المناقشہ**: حساب کی تفصیل سختی سے لینا، سخت پوچھ گچھ کرنا، چنانچہ صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے:

[ان رسول الله ﷺ قال :لیس أحد یحاسب یوم القیامة الاهلک ، فقلت: یا رسول الله ألیس قد قال الله تعالیٰ: ﴿ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ﴾ فقال رسول الله :انما ذلک العرض ولیس أحد یناقش الحساب یوم القیامة الاعذب]

ترجمہ:[قیامت کے دن جس سے حساب لیا گیا وہ ہلاک ہو گیا، عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے سوال کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: ﴿ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ﴾

ترجمہ: ''(تو (اس وقت) جس شخص کے داہنے ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا۔ اس کا حساب تو بڑی آسانی سے لیا جائے گا۔''

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' حِسَابًا يَسِيرًا '' سے مراد ''عرض'' (اعمال پیش کیا جانا) ہے، البتہ جس کسی سے قیامت کے دن مناقشہ جانچ پڑتال ہوا، وہ ضرور عذاب میں مبتلا ہوگا]

النوع الثانی: کافروں کا حساب

اس کے متعلق شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''البتہ کفار کا محاسبہ نیکیوں اور بدیوں کا وزن کر کے نہیں ہوگا کیوں کہ ان کی تو سرے سے نیکیاں ہی نہیں ہونگی۔''

یعنی کفار کے نامۂ اعمال میں نیکیاں ہونگی ہی نہیں کہ گناہوں کے ساتھ ان کے وزن کی ضرورت پڑے کیونکہ کفر کی وجہ سے ان کے اچھے اعمال اکارت ہو چکے ہوں گے اور آخرت میں ان کے پاس صرف ان کے گناہ ہوں گے۔ چنانچہ ان کفار کے محاسبہ کی صورت وکیفیت بیان کرتے ہوئے شیخ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ان کے اعمال شمار کر کے انہیں مطلع کیا جائے گا اور وہ اقرار بھی کر لیں گے اور پھر انہیں ان اعمال کی جزا دی جائے گی''

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴾ (فصلت:۵۰)

ترجمہ: ''یقیناً ہم ان کفار کو ان کے اعمال سے خبردار کریں گے اور انہیں سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے''

نیز فرمایا: ﴿ وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ﴾ (اعراف:۳۷)

ترجمہ: ''اور اپنے کافر ہونے کا اقرار کریں گے''

نیز فرمایا: ﴿ فَاعْتَرَفُوا بِذَنبِهِمْ فَسُحْقًا لِّأَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴾ (الملک:۱۱)

ترجمہ: ''پس انہوں نے اپنے جرم کا اقبال کرلیا، اب یہ دوزخی دفع ہوں (دور ہوں)''

حوض النبی ﷺ ومکانہ وصفاتہ

حوضِ کوثر، اس کے مقام اور اسکی صفات کا بیان

وفی عرصات القیامۃ الحوض المورود للنبی ﷺ ماؤہ أشد بیاضا من اللبن وأحلی من العسل. آنیتہ عدد نجوم السماء. طولہ شہر وعرضہ شہر. من یشرب منہ شربۃ لا یظمأ بعدہا أبدا.

ترجمہ: میدانِ محشر میں نبی ﷺ کا حوضِ کوثر بھی ہے، جہاں لوگ پانی پینے کیلئے آئیں گے، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے، آسمان کے ستاروں کی تعداد کے بقدر وہاں آب خورے ہوں گے، اس کا طول ایک مہینہ کی مسافت جتنا ہے اور عرض بھی ایک مہینہ مسافت جتنا، جو ایک بار وہاں سے پانی پی لے گا کبھی اس کو پیاس نہیں لگے گی۔ (جنت میں داخل ہونے تک)

عبارت کی تشریح

...... **شرح** ......

روزِ قیامت کے امور میں نبی ﷺ کا حوض بھی ہے، چنانچہ اس عبارت میں شیخ رحمہ اللہ نے حوض اور اس کی صفات کا ذکر فرمایا ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حوض کے متعلق چالیس صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے احادیث مروی ہے، جن میں سے بیشتر صحیحین میں ہیں۔

لغتِ عرب میں حوض پانی جمع ہونے کی جگہ کو کہا جاتا ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا اثباتِ حوض پر اجماع ہے، البتہ اس مسئلہ میں معتزلہ نے اہل السنۃ کی مخالفت کی ہے، چنانچہ وہ حوض کو نہیں مانتے،

حوض کے متعلق نصوص کی تاویل کرتے ہیں اور ظاہری معنی مراد نہیں لیتے۔

اس کے بعد شیخ رحمہ اللہ نے حوض کے اوصاف بیان فرمائے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

''اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے، آسمان کے ستاروں کی تعداد کے بقدر وہاں آب خورے ہوں گے، اس کا طول ایک مہینہ کی مسافت جتنا ہے اور عرض بھی ایک مہینہ کی مسافت جتنا ہے، جو ایک بار وہاں سے پانی پی لے گا کبھی اسے پیاس نہیں لگے گی''

حوض کی یہ تمام صفات احادیث سے ثابت ہیں، مثلاً: صحیحین میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

[قال : قال رسول الله :حوضي مسيرة شهر، ماءه ابيض من اللبن ، وريحه أطيب من المسك وكيزانه كنجوم السماء من شرب منه لايظمأ أبدا]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [میرے حوض (کا طول وعرض) ایک مہینہ کی مسافت جتنا ہے اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہے، اس کی خوشبو مسک سے زیادہ عمدہ ہے اس کے کوزے آسمان کے ستاروں کی تعداد کے برابر ہیں، جس نے اس سے پانی پی لیا، اسے کبھی پیاس نہیں لگے گی]

الصراط ومعناه ومكانه وصفة مرور الناس عليه

پل صراط، اس کا معنی، اس کا مقام اور اس پر سے لوگوں کے گذرنے کی حالت وکیفیت کا بیان

والصراط منصوب على متن جهنم وهو الجسر الذي بين الجنة والنار. يمر الناس عليه على قدر أعمالهم، فمنهم من يمر كلمح البصر، ومنهم من يمر كالبرق ومنهم من يمر كالريح، ومنهم من يمر كالفرس الجواد، ومنهم من يمر كركاب الابل ومنهم من يعدو عدوا، ومنهم من يمشي مشيا، ومنهم من يزحف زحفا. ومنهم من يخطف ويلقى في جهنم، فان الجسر عليه كلاليب تخطف الناس بأعمالهم.

ترجمہ: پل صراط جہنم کے اوپر قائم ہے، اور یہ جنت اور جہنم کے درمیان پل ہے، لوگ اپنے اپنے اعمال کے بمطابق اس پر سے گذریں گے، بعض تو پلک جھپکتے گذر جائیں گے بعض بجلی کی سی تیزی سے گذر جائیں گے، بعض ہوا کی طرح گذر جائیں گے، بعض عمدہ گھوڑے کی طرح گذر جائیں گے، بعض اونٹ کی رفتار سے گذر جائیں گے، بعض دوڑتے ہوئے گذر جائیں گے، بعض چلتے چلتے گذر جائیں گے، بعض گھسٹ کر چلیں گے اور بعض لوگوں کو اچک کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا؛ کیونکہ پل صراط پر لوہے کے آنکڑے لگے ہوں گے جو لوگوں کو ان کے اعمال کے بمطابق کھینچ لیں گے۔

شرح

شیخ رحمہ اللہ اس عبارت میں یہ بات بتانا چاہتے ہیں کہ قیامت کے روز رونما ہونے والے احوال وامور میں پل صراط پر مرور بھی ہے۔

"الصراط"، کا لغوی معنی طریقِ واضح ہے، اس کا شرعی معنی شیخ رحمہ اللہ نے بایں الفاظ بیان فرمایا ہے:"وھو الجسر الذی بین الجنة والنار "(الصراط جنت اور جہنم کے درمیان ایک پل ہے) پل صراط کا مقام بیان کرتے ہوئے فرمایا:" علی متن جھنم" (یعنی پل صراط جہنم کی پشت پر قائم گا) پل صراط پر سے لوگوں کے گذرنے کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا: "یمر الناس علیه علی قدر أعمالهم "(لوگ اپنے اپنے اعمال کے بمطابق اس پر سے گذریں گے)

پل صراط پر سے یہ گزرنا موقف، حشر اور حساب کے بعد ہوگا، کیونکہ پل صراط پر سے گذر کر ہی اہل ایمان جہنم سے نجات پا کر جنت تک پہنچیں گے، جبکہ اہل النار پل صراط پر سے جہنم میں گر جائیں گے۔ جیسا کہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔

اس کے بعد شیخ رحمہ اللہ نے پل صراط پر سے گذرنے والوں کے احوال کو تفصیلاً ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:"فمنهم من یمر کلمح البصر "یعنی قیامت کے دن لوگوں کا پل صراط پر تیزی یا آہستگی سے گذرنا ان کے ایمان اور عمل صالحہ کے بمطابق ہوگا، چنانچہ آدمی کی دینِ اسلام پر استقامت وثبات کے بقدر ہی پل صراط پر سے گذرتے ہوئے اسے ثبات نصیب ہوگا، چنانچہ جو دنیا میں صراط معنوی یعنی دینِ اسلام پر ثابت قدم رہا ہوگا وہ آخرت میں صرطِ حسی یعنی جہنم پر قائم پل صراط پر بھی ثابت قدم رہے گا، اور جو صراطِ معنوی پر قائم نہ رہا ہوگا وہ صراطِ حسی پر بھی قائم نہ رہ سکے گا۔

بعض الفاظ کی توضیح:

"العدو":دوڑنا "الزحف"سرین کے بل چلنا "کلالیب"کلوب کی جمع ہے لوہا جس کا ایک سرا مڑا ہوا ہو " تخطف "کسی چیز کو جلدی سے اٹھا لینا یعنی اچک لینا۔

بعض لوگوں کا پل صراط پر سے سرین کے بل گذرنا یا پل صراط پر لگے آنکڑوں کا انہیں اچک

لینا ان لوگوں کے اعمال سیئہ کے سبب سے ہوگا۔ چنانچہ جتنا شکوک وشبہات نے لوگوں کو صراطِ مستقیم سے دور کیا ہوگا، اس کے بقدر پل صراط پر لگے آنکڑے انہیں پکڑیں گے۔

اہل السنۃ والجماعۃ احادیث سے ثابت شدہ امور مثلاً جہنم پر قائم پل صراط، لوگوں کا پل صراط پر سے گذرنا پر ایمان رکھتے ہیں۔ البتہ قاضی عبد الجبار المعتزلی اور اس کے اتباع نے اس مسئلہ میں اہل السنۃ کی مخالفت کی ہے ان کا کہنا ہے کہ احادیث میں مذکور صراط سے مراد طریقِ جنت ہے جس کا تذکرہ اس آیتِ کریمہ میں ہے:

﴿ سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ﴾ (محمد:۵)

ترجمہ"انہیں راہ دکھائے گا اور ان کے حالات کی اصلاح کر دے گا"

اور طریقِ جہنم ہے، جس کا تذکرہ اس آیتِ کریمہ میں ہے:

﴿ فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ ﴾ (الصافات:۲۳)

ترجمہ:"(ان سب کو) جمع کرکے انہیں دوزخ کی راہ دکھاؤ"

یہ قول سراسر باطل ہے بلکہ اس سے نصوصِ صحیحہ کا رد لازم آتا ہے، اس لئے ان نصوص کو ظاہر پر محمول کرنا واجب ہے۔

القنطرة بين الجنة والنار

جنت اور جہنم کے درمیان پل

فمن مر على الصراط دخل الجنة ،فاذا عبروا عليه وقفوا على قنطرة بين الجنة والنار فيقتص بعضهم من بعض ،فاذا هذبوا ونقوا اذن لهم فى دخول الجنة .

ترجمہ: جو پل صراط پر سے گزر جائے گا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا، جب یہ لوگ پل صراط کو عبور کرلیں گے تو انہیں جنت اور جہنم کے درمیان قائم ایک پل پر روک لیا جائے گا اور ایک دوسرے سے قصاص دلایا جائے گا، پس جب حقوق ومعاملات سے پاک وصاف کردیئے جائیں گے تو انہیں دخولِ جنت کی اجازت دے دی جائے گی۔

عبارت کی تشریح

...... شرح ......

شیخ رحمہ اللہ نے اس عبارت میں امورِ قیامت میں سے ایک امر ''پل پر روک لیا جانا'' کا تذکرہ فرمایا ہے۔

شیخ رحمہ اللہ کی عبارت ''جو پل پر سے گذر جائے گا جنت میں داخل ہوگا'' کا مطلب ہے کہ جس نے پل صراط عبور کی اور جہنم میں گرنے سے محفوظ رہا وہ جنت میں داخل ہوگا، کیونکہ جہنم سے نجات پانے والا ہی جنت میں داخل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ﴾

ترجمہ: ''پس جو شخص آگ سے بچالیا جائے اور جنت میں داخل کردیا جائے بے شک وہ کامیاب ہوگیا'' (آل عمران:۱۸۵)

نیز فرمایا: ﴿ فَرِيْقٌ فِی الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِی السَّعِيْرِ ﴾ (الشوریٰ:۷)

ترجمہ: ''ایک گروہ جنت میں اور ایک گروہ جہنم میں جائے گا۔''

البتہ دخولِ جنت سے قبل اہلِ ایمان میں قصاص جاری کیا جائے گا، تاکہ اکمل حالت میں جنت میں داخل ہوں، کہ ان کے ذمہ کوئی ظلم باقی نہ ہو، شیخ رحمہ اللہ نے اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا ''جب یہ لوگ پل صراط کو عبور کرلیں گے تو انہیں جنت اور جہنم کے درمیان قائم ایک پل پر روک لیا جائے گا'' اس پل کے متعلق ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد پل صراط کی جنت والی طرف ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ایک الگ پل ہے جو اہل ایمان کیلئے خاص ہوگا۔

شیخ رحمہ اللہ کی عبارت ''بعض بعض سے قصاص لے گا'' کا مطلب ہے مظالم کا قصاص دلایا جائے گا یعنی مظلوم کو ظالم سے حق دلایا جائے گا۔

مظالم سے پاک صاف کردیئے جانے کے بعد ہی دخولِ جنت کی اجازت ملے گی، کا مطلب یہ ہے کہ جب سب کو ان کے حقوق مل جائیں گے، اور مظالم کا بدلہ مل جائے گا تو دلوں کا بغض وکینہ ختم ہوجائے گا، تو پاک وصاف دل کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴾ (الحجر:۴۷)

ترجمہ: ''انکے دلوں میں جو کچھ رنجش وکینہ تھا، ہم سب کچھ نکال دیں گے وہ بھائی بھائی بنے ہوئے ایک دوسرے کے آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے''

اول من يستفتح باب الجنة وأول من يدخلها وشفاعات النبى ﷺ

سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھلوانے والے اور سب سے پہلے جنت میں داخل ہونیوالے کا بیان اور نبی ﷺ کی شفاعتوں کا تذکرہ

واول من يستفتح باب الجنة محمد ﷺ واول من يدخلها من الأمم أمته . وله ﷺ فى القيامة ثلاث شفاعات : أما الشفاعة الأولىٰ فيشفع فى أهل الموقف حتى يقضى بينهم ، بعد أن يتراجع الأنبياء آدم ونوح وإبراهيم وموسى وعيسىٰ ابن مريم عن الشفاعة حتى تنتهى إليه . وأما الشفاعة الثانية فيشفع فى أهل الجنة أن يدخلوا الجنة. وهاتان الشفاعتان خاصتان له. وأما الشفاعة الثالثة فيشفع فيمن استحق النار . وهذه الشفاعة لـه، ولسائر النبيين والصديقين وغيرهم - فيشفع فيمن استحق النار أن لا يدخلها . ويشفع فيمن دخلها أن يخرج منها.

۞ ۞ ۞

ترجمہ: جنت کا دروازہ سب سے پہلے جناب محمد ﷺ کھلوائیں گے، اور جنت میں سب سے پہلے اُمت محمد یہ داخل ہوگی، رسول اللہ ﷺ کو قیامت میں تین شفاعتیں حاصل ہوگی۔ پہلی شفاعت، شفاعتِ عظمیٰ ہے، یہ اہل موقف (میدانِ محشر میں جمع تمام انسانوں) کیلئے ہوگی کہ ان میں فیصلہ کیا جائے۔ لوگ اس شفاعت کیلئے پہلے دیگر انبیاء، آدم، نوح، ابراھیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم (علیہم السلام) کے پاس جائیں گے لیکن وہ انکار کردیں گے، آخرکار یہ شفاعت آپ ﷺ تک آپہنچے گی۔ دوسری شفاعت اہل جنت کے متعلق ہوگی کہ انہیں جنت میں داخل کیا جائے، مذکورہ دونوں شفاعتیں جنابِ محمد ﷺ کے ساتھ خاص ہیں۔

تیسری شفاعت مستحقین جہنم کیلئے ہوگی، آپ ﷺ ان کے حق میں شفاعت کریں گے کہ انہیں جہنم میں داخل نہ کیا جائے اور جو داخل کئے جاچکے ہوں گے ان کے متعلق جہنم سے نکالے جانے کی شفاعت کریں گے۔ اس شفاعت میں انبیاء اور صدیقین وغیرہ بھی آپ کے شریک ہوں گے۔

عبارت کی تشریح

...... شرح ......

۸. امورِ قیامت کے تذکرہ میں شیخ رحمہ اللہ اہل ایمان کے انتہائی اہم امر کو بیان فرمارہے ہیں چنانچہ گذشتہ عبارت میں شیخ رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ پل صراط کو عبور کرنے اور حقوق و مظالم میں قصاص کے اجراء کے بعد اہلِ ایمان کو جنت میں داخلہ کی اجازت دی جائے گی یعنی جنت میں داخلہ اللہ تعالیٰ کے اذن اور جنت کے دروازے کے کھولنے کے بعد ہوگا۔

چنانچہ شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”جنت کا دروازہ سب سے پہلے محمد ﷺ کھلوائیں گے“ جیسا کہ صحیح مسلم میں جناب انس ؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں:

قال رسول اللہ ﷺ: [آتى باب الجنة يوم القيامة فاستفتح، فيقول الخازن: من أنت؟ فأقول :محمد، فيقول :بك أمرت أن لا أفتح لأحد قبلك]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:[میں جنت کے دروازے کے پاس آؤں گا اور دروازہ کھولنے کا مطالبہ کروں گا خازنِ جنت کہے گا: آپ کون ہیں؟ میں کہوں گا: میں محمد (ﷺ) ہوں، خازنِ جنت کہے گا مجھے آپ ہی کے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ آپ سے پہلے کسی کیلئے دروازہ نہ کھولوں]

اس حدیث سے آپ ﷺ کے شرف وفضل کا اظہار ہورہا ہے۔

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”جنت میں سب سے پہلے امت محمد یہ داخل ہوگی“ اس کی دلیل صحیح مسلم کی یہ حدیث ہے: [ونحن اول من يدخل الجنة]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے]

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کو قیامت کے دن تین شفاعتیں حاصل ہوگی''

''الشفاعۃ'' کا لغوی معنی وسیلہ ہے، جبکہ عرفِ عام میں اس کا معنی ہے: کسی دوسرے کیلئے خیر کا سوال کرنا۔

لفظِ ''الشفاعۃ'' الشفع سے مشتق ہے جوکہ ''الوتر'' کی ضد ہے۔ اس لحاظ سے شافع کو شافع اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مشفوع لہ (جس کیلئے شفاعت کی جارہی ہے) جوکہ پہلے اکیلا تھا کے سوال کے ساتھ اپنے سوال کو ملا دیتا ہے۔

شیخ رحمہ اللہ اپنے اس قول میں رسول اللہ ﷺ کی ان شفاعتوں کا ذکر فرمارہے ہیں جو آپ ﷺ کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی اجازت سے حاصل ہوگی۔ شیخ رحمہ اللہ نے اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف تین شفاعتوں کا ذکر فرمایا ہے جبکہ استقصاء سے ان کی تعداد آٹھ معلوم ہوتی ہے، ان میں بعض تو صرف آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہیں اور بعض ایسی ہیں جو آپ ﷺ اور دیگر انبیاء وصالحین میں مشترک ہیں۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

پہلی شفاعت: شفاعتِ عظمیٰ (اور یہی مقامِ محمود ہے) اس کی تفصیل یہ ہے کہ میدانِ محشر میں جب لوگوں کا قیام لمبا ہوجائے گا تو لوگ انبیاءِ کرام کے پاس جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ سے سفارش کریں کہ وہ ہمارا حساب لے (تاکہ ہم میدانِ محشر کی تکلیف سے نجات پاسکیں) تمام انبیاء انکار کردیں گے، یہ لوگ ہمارے نبی ﷺ کے پاس آئیں گے تو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے اذن سے شفاعت فرمائیں گے۔

دوسری شفاعت: یہ شفاعت حساب کے سلسلہ کے ختم ہونے کے بعد مستحقینِ جنت کے متعلق ہوگی کہ انہیں جنت میں داخل کیا جائے۔

تیسری شفاعت: آپ ﷺ اپنے چچا ابو طالب کیلئے تخفیفِ عذاب کی شفاعت

فرمائیں گے، شفاعت کی یہ قسم آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ یہ خبر دے چکا ہے کہ کافروں کو کسی کی شفاعت نفع نہیں دے گی، اور نبی ﷺ بھی بتا چکے ہیں کہ ان کی شفاعت صرف اہلِ توحید کیلئے ہوگی۔ اس لئے ابو طالب کے حق میں شفاعت آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہے، اور وہ بھی صرف ابو طالب کیلئے۔ شفاعت کی یہ تینوں قسمیں ہمارے نبی محمد ﷺ کے ساتھ خاص ہیں۔

چوتھی شفاعت: اہل توحید میں سے گناہ گار جو جہنم کے مستحق بن چکے ہوں گے ان کے حق میں آپ ﷺ کی شفاعت کہ انہیں جہنم میں داخل نہ کیا جائے۔

پانچویں شفاعت: اہل توحید میں سے گناہ گار جو جہنم میں داخل ہوچکے ہوں گے ان کے حق میں آپ ﷺ کی شفاعت کہ انہیں جہنم سے نکالا جائے۔

چھٹی شفاعت: بعض اہل جنت کے رفع درجات کیلئے آپ ﷺ کی شفاعت۔

ساتویں شفاعت: جن لوگوں کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوگی ان کے حق میں آپ ﷺ کی شفاعت کہ انہیں جنت میں داخل کیا جائے۔ ایک قول کے مطابق یہ لوگ اہل اعراف ہیں۔

آٹھویں شفاعت: بعض مؤمنین کے متعلق آپ ﷺ کی شفاعت کہ انہیں بلاحساب وعذاب جنت میں داخل کیا جائے، جیسا کہ عکاشہ بن محصن کیلئے آپ ﷺ نے دعا فرمائی کہ یہ ان ستر ہزار افراد میں سے ہوجائے جو بلاحساب وعذاب جنت میں داخل ہوں گے۔

شفاعت کی ان پانچوں قسموں میں دیگر انبیاء، ملائکہ، صدیقین اور شہداء بھی آپ ﷺ کے شریک ہیں۔ کیونکہ ادلہ شرعیہ سے یہ شفاعات ثابت ہیں، اس لئے اہل السنۃ والجماعۃ شفاعت کی ان تمام قسموں کی مانتے ہیں، البتہ شفاعت کیلئے دو شرطیں لازمی ہیں:

پہلی شرط: شافع کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے شفاعت کرنے کی اجازت۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مَنْ ذَاالَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ (البقرۃ:۲۵۵)

ترجمہ: ''کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے''

نیز فرمایا: ﴿ مَامِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ ﴾ (یونس:۳)

ترجمہ: ''اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس کے پاس سفارش کرنے والا نہیں''

دوسری شرط: مشفوع لہ (جس کے حق میں شفاعت ہو رہی ہے) کیلئے اللہ تعالیٰ کی رضامندی

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ﴾ (الانبیاء:۲۸)

ترجمہ: ''وہ کسی کی بھی سفارش نہیں کرتے بجز ان کے جن سے اللہ تعالیٰ خوش ہو''

مذکورہ دونوں شرطوں کو اللہ تعالیٰ کے اس قول نے جمع کر دیا ہے

﴿ وَكَمْ مِنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَرْضٰى ﴾ (النجم:۲۶)

ترجمہ: ''اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی مگر یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خوشی اور اپنی چاہت سے جس کیلئے چاہے اجازت دے دے''

معتزلہ مؤمنوں میں سے مرتکب کبیرہ جو مستحق جہنم ہو چکے ہوں کے متعلق شفاعت، کہ انہیں جہنم میں داخل نہ کیا جائے اور جو جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے کے متعلق شفاعت کہ انہیں جہنم سے نکالا جائے، میں اہل السنۃ کی مخالفت کرتے ہیں (یعنی شفاعت کی پانچویں اور چھٹی قسم کو نہیں مانتے)

انکی حجت اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ ﴾ (المدثر:۴۸)

ترجمہ: ''انہیں سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہیں دے گی''

ان کی اس حجت کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت کفار کے متعلق وارد ہوئی ہے، چنانچہ انہیں کسی کی شفاعت نفع نہیں دے گی، البتہ مؤمنوں کو شفاعت، مذکورہ شروط کے مطابق نفع دے گی۔

مسئلہ شفاعت میں لوگ تین اصناف میں منقسم ہیں:

صنف اول: نصاریٰ، مشرکین، غال قسم کے صوفیہ، اور قبر پرست۔ یہ لوگ اثباتِ شفاعت میں غلو کا شکار ہیں اس طرح کہ یہ لوگ اپنے بزرگوں کی عند اللہ شفاعت کو دنیاوی بادشاہوں سے کی جانیوالی شفاعت کی طرح سمجھتے ہیں چنانچہ یہ لوگ غیر اللہ سے شفاعت کے طالب ہوتے ہیں، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مشرکین کے متعلق اس بات کی خبر دی ہے۔

صنف ثانی: معتزلہ وخوارج۔ یہ لوگ نفی شفاعت میں غلو کا شکار ہیں، چنانچہ یہ لوگ اھل الکبائر (مرتکبین کبیرہ) کے حق میں نبی ﷺ اور دیگر انبیاء وصلحاء وغیرہ کی شفاعت کا انکار کرتے ہیں۔

صنف ثالث: اھل السنۃ والجماعۃ۔ یہ لوگ کتاب وسنت سے ثابت تمام شفاعات کو کتاب وسنت کی روشنی میں، کتاب وسنت سے ثابت شروط کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔

إخراج بعض العصاة من النار برحمة الله
بغير شفاعة واتساع الجنة عن أهلها

بعض گناہ گاروں کا بغیرِ شفاعت محض رحمتِ الٰہی سے جہنم سے نکالا جانا اور جنت کا جنتیوں کی تعداد سے کشادہ ہوجانا

ويخرج الله من النار اقواما بغير شفاعة بفضله ورحمته . ويبقىٰ فى الجنة فضل عمن دخلها من أهل الدنيا فينشيء الله أقواما فيدخلهم الجنة. وأصناف ما تضمنته الدار الآخرة من الحساب والثواب والعقاب ، والجنة والنار، وتفاصيل ذلک مذکورة فی الکتب المنزلة من السماء والآثار من العلم المأثور عن الأنبياء . وفی العلم الموروث عن محمد ﷺ من ذلک ما يشفي ويکفي . فمن ابتغاهُ وجده.

❁ ❁ ❁

ترجمہ: اللہ تعالیٰ بعض قوموں کو بغیر شفاعت کے محض اپنی رحمت وفضل سے جہنم سے نکال لے گا اور اہل دنیا میں سے جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے کے بعد جنت میں جگہ بچ جائے گی تو اللہ تعالیٰ کچھ اور قوموں کو پیدا فرما کر جنت میں داخل کرے گا۔

دارِ آخرت جن امور کو متضمن ہے مثلاً: حساب، ثواب، عقاب، جنت وجہنم وغیرہ ان کی اور دیگر امورِ آخرت کی تفصیل آسمانی کتب اور انبیاءِ کرام سے منقول علم میں موجود ہے خاصکر محمد ﷺ کے ورثہ علمی میں تو ایسی تفصیل موجود ہے جو کافی اور شافی ہے جو مزید تفصیل جاننا چاہتا ہے وہ اسی طرف رجوع کرے اسے اس کا مطلوب مل جائے گا۔

عبارت کی تشریح

شرح

شیخ رحمہ اللہ شفاعات کے ذریعے بعض لوگوں کے جہنم سے نکالے جانے کے ذکر کے بعد جہنم سے خروج کے ایک اور سبب کا ذکر کررہے ہیں اور وہ سبب اللہ تعالیٰ کی رحمت، فضل اور احسان ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ گناہ گار مؤمنین میں سے ایسے لوگوں کو جہنم سے نکال لے گا جن کے دلوں میں کسی ادنیٰ دانے کے برابر ایمان ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ ﴾ (النساء:۴۸)

ترجمہ: (بے شک اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشتا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے، اور اس کے سوا جس گناہ کو چاہے معاف کردے)

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے:

[يقول الله تعالىٰ شفعت الملائكة وشفع النبيون وشفع المؤمنون ولم يبق الا ارحم الراحمين فيقبض قبضة من النار فيخرج منها قوما لم يعملوا خيرا قط]

ترجمہ: [اللہ تعالیٰ فرمائے گا: فرشتوں نے شفاعت کرلی، نبیوں نے شفاعت کرلی، اور مؤمنوں نے بھی شفاعت کرلی، اور اب صرف ارحم الراحمین باقی رہ گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ جہنم سے ایک مٹھی بھرے گا اور اس سے ایسی قوم کو نکالے گا جنہوں نے کبھی خیر کا کام نہیں کیا ہوگا]

شیخ رحمہ اللہ اپنے قول ''ويبقى فى الجنة فضل عن من دخلها من اهل الجنة'' میں جنت کی وسعت کا ذکر کررہے ہیں، جنت کی وسعت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ﴾ (آل عمران:۳۳)

چنانچہ اللہ تعالیٰ جنت کی اس وسعت کو بھرنے کیلئے نئی مخلوق پیدا فرمائے گا اور انہیں اپنے فضل

ورحمت سے جنت میں داخل فرمائے گا کیونکہ جنت اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے وہ اس جنت کے ذریعے جس پر چاہے گا رحمت فرمائے گا البتہ جہنم میں صرف انہیں لوگوں کو مبتلائے عذاب کیا جائے گا جن پر حجت پوری ہو چکی ہوگی، اور جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی ہوگی۔

آخر میں شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ روزِ آخرت کے احوال اور اس روز پیش آنے والے امور جن کا تذکرہ پیچھے ہوا کی مزید تفصیل اور مزید احوال وامور کی معرفت کیلئے کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے کیونکہ ان احوال وامور کا تعلق علمِ غیب سے ہے اور امورِ غیب کی معرفت وحی الٰہی سے ہی ممکن ہے۔

الایمان بالقدر وما یتضمنه

تقدیر پر ایمان اور تقدیر جن امور کو متضمن ہے کا بیان

وتؤمن الفرقة الناجية "اهل السنة والجماعة" بالقدر خيره وشره والايمان بالقدر على درجتين كل درجة تتضمن شيئين.

۞ ۞ ۞

ترجمہ: فرقہ ناجیہ اہل السنہ والجماعۃ کا تقدیر خواہ اچھی ہو یا بُری ہو پر ایمان ہے اور تقدیر پر ایمان کے دو درجے ہیں ہر درجہ دو چیزوں کو متضمن ہے۔

عبارت کی تشریح

شرح

"القدر" مصدر ہے، عربی لغت میں کہتے ہیں: "قدرت الشیٔ"، جس کا مطلب ہے "میں نے فلاں چیز کی مقدار کا احاطہ کیا"

"قدر" کا مطلب ہے کہ کائنات کے متعلق اللہ تعالیٰ کو ازل سے علم ہے اور یہ کائنات اللہ تعالیٰ کے ارادے سے معرضِ وجود میں آئی ہے، لہٰذا ہر حادث چیز کا اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے ارادے سے حادث ہوئی ہے۔

تقدیر پر ایمان ایمان کے چھ ارکان میں سے ہے، اس رکن کو "الایمان بالقدر خیرہ وشرہ" (تقدیر خواہ اچھی ہو یا بُری پر ایمان رکھنا) کہتے ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ کے قول "فرقہ ناجیہ اہل السنۃ والجماعۃ کا تقدیر خواہ اچھی ہو یا بُری پر ایمان ہے" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا وہ اہل السنۃ والجماعۃ میں سے نہیں ہے، نصوصِ شرعیہ کا مقتضیٰ بھی یہی ہے جیسا کہ حدیث جبرئیل میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے

آپ ﷺ سے ایمان کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے جواب دیا: [أن تؤمن بالله، وملائكته، وكتبه، ورسله، واليوم الآخر، وتؤمن بالقدر خيره وشره]

ترجمہ: [ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اسکے فرشتوں کے ساتھ اور اسکی کتابوں کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور یومِ آخرت کے ساتھ ایمان لائے اور تقدیر پر ایمان لائے خواہ اچھی ہو یا بُری]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے تقدیر کے ساتھ ایمان لانے کو ایمان کا چھٹا رکن قرار دیا ہے، پس جس کسی نے تقدیر کا انکار کیا وہ مؤمن نہیں ہے جس طرح کہ اگر وہ دیگر ارکانِ ایمان میں سے کسی کا انکار کرے تو وہ مؤمن نہیں رہتا۔

شیخ رحمہ اللہ کا قول ''تقدیر پر ایمان کے دو درجے ہیں......''

شیخ رحمہ اللہ اس مقام پر فرماتے ہیں کہ ایمان بالقدر چار مراتب پر مشتمل ہے، جن کی اجمالی تفصیل درج ذیل ہے:

الأولی: ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کا علمِ ازلی، اس علمِ ازلی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کو عمل کرنے سے قبل جانتا ہے۔

الثانية: اس علمِ ازلی کی لوحِ محفوظ میں کتابت۔

الثالثه: ہر حادث کا اللہ تعالیٰ کی مشیتِ شاملہ اور اس کی قدرتِ تامہ سے ہونا۔

الرابعة: اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوقات کا موجد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ خالق ہے اور اس کے ماسویٰ ہر چیز مخلوق ہے۔

تقدیر کے ان مراتب کے اجمالی ذکر کے بعد تفصیل ملاحظہ ہو۔

تفصيل مراتب القدر

مراتبِ قدر کی تفصیل

الدرجة الاولىٰ وما تتضمنه:

فالدرجة الاولىٰ: الايمان بأن الله تعالىٰ عليم بما الخلق عاملون بعلمه القديم الذى هو موصوف به أزلا وأبدا. وعلم جميع أحوالهم من الطاعات والمعاصي والأرزاق والآجال. ثم كتب الله في اللوح المحفوظ مقادير الخلق. فأول ما خلق الله القلم قال له اكتب. قال ما أكتب؟ قال اكتب ما هو كائن إلى يوم القيامة. فما أصاب الإنسان لم يكن ليخطئه. وما أخطأه لم يكن ليصيبه. جفت الأقلام وطويت الصحف. كما قال تعالىٰ: ﴿ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتَابٍ إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللهِ يَسِيْرٌ ﴾ (الحج:۷۰) وقال: ﴿ مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِيْ أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللهِ يَسِيْرٌ ﴾ (الحديد:۲۲) وهذا التقدير التابع لعلمه سبحانه يكون في مواضع جملة وتفصيلا فقد كتبت في اللوح المحفوظ ما شاء وإذا خلق جسد الجنين قبل نفخ الروح فيه بعث إليه ملكا فيؤمر بأربع كلمات فيقال له: اكتب رزقه وأجله وعمله وشقي أوسعيد. ونحو ذلك. فهذا التقدير قد كان ينكره غلاة القدرية قديما: ومنكروه اليوم قليل.

پہلا درجہ: اس بات پر ایمان لانا کہ مخلوق نے جو عمل کرنے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے علمِ قدیم کے ساتھ اسے پہلے سے جانتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم ازلی وابدی ہے۔

اللہ تعالیٰ مخلوق کے جمیع احوال، طاعات، معاصی، اجل اور رزق وغیرہ سب کو پہلے سے جانتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تقدیریں لوحِ محفوظ میں لکھ دیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قلم پیدا کر کے اسے کہا: لکھو! قلم نے کہا: کیا لکھوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قیامت کے دن تک جو کچھ ہونیوالا ہے وہ سب کچھ لکھ دو، چنانچہ انسان کو جو کچھ پہنچنا تقدیر میں لکھا ہوا ہے وہ اس سے خطا ہو ہی نہیں سکتا اور جس چیز کا خطا ہونا لکھا ہوا ہے وہ اسے حاصل ہو ہی نہیں سکتی، قلمیں خشک ہو چکیں اور صحائف لپیٹے جا چکے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ ذٰلِكَ فِي كِتَابٍ إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ ﴾ (الحج:٧٠)

ترجمہ: ”کیا آپ نے نہیں جانا کہ آسمان وزمین کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے۔ یہ سب لکھی ہوئی کتاب میں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ پر تو یہ امر بالکل آسان ہے“

نیز فرمایا: ﴿ مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ ﴾ (الحدید:٢٢)

ترجمہ: ”نہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے نہ (خاص) تمہاری جانوں میں، مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے اللہ تعالیٰ پر تو یہ امر بالکل آسان ہے“

اور یہ تقدیر جو کہ اللہ تعالیٰ کے علم کے تابع ہے، عموم اور تفصیل پر مشتمل ہے، (عموم سے مراد تمام مخلوقات کی تقدیر اور تفصیل سے مراد ایک شخص کی تفصیل تقدیر) اللہ تعالیٰ نے جو چاہا

لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے، اللہ تعالیٰ جب بچے کا جسد پیدا فرماتا ہے تو اس میں روح ڈالنے سے قبل فرشتہ بھیجتا ہے اور اس فرشتہ کو چار امور لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے، رزق، اجل (موت کا وقت) عمل، شقی (بدبخت) ہے یا سعید (نیک بخت) ہے۔

تقدیر کی اس قسم کا قدیم زمانہ میں غالی قدریہ نے انکار کیا ہے، البتہ آج کے دور میں اس کے منکر بہت قلیل ہیں۔

عبارت کی تشریح

شرح

بعض الفاظ کی توضیح وتشریح

”ازل“ قدیم کو کہتے ہیں، ایسا قدیم جس کی ابتداء نہ ہو۔ اور ”ابد“ کا معنی ہے: مستقبل میں ہمیشہ رہنا اس طرح کہ اس کی کوئی انتہا نہ ہو۔

”الطاعات“ ”طاعۃ“ کی جمع ہے جس کا معنی ہے حکم کی موافقت کرنا، جبکہ ”المعاصی“ ”معصیۃ“ کی جمع ہے جس کا معنی حکم کی مخالفت کرنا، ”الارزاق“ ”رزق“ کی جمع ہے، رزق، ہر نفع مند چیز کو کہتے ہیں، الآجال ”اجل“ کی جمع ہے جس کا معنی کسی شیٔ کی مدت ہے، انسان کی اجل سے مراد، موت کی صورت میں دنیا میں اس کے وقت کا ختم ہونا ہے۔

”اللوح المحفوظ“ سے مراد ”ام الکتاب“ (اصل کتاب) ہے، اسے محفوظ اس لیئے کہا جاتا ہے کہ یہ ہر قسم کی کمی بیشی سے محفوظ ہے۔

شیخ رحمہ اللہ اپنے اس کلام میں، ایمان بالقدر کا درجہ اولیٰ جن چیزوں کو متضمن ہے، کا ذکر کر رہے ہیں، چنانچہ شیخ رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ درجہ اولیٰ دو مراتب کو متضمن ہے:

مرتبہ اولی: اللہ تعالیٰ کے علم پر ایمان لانا جو موجودات اور معلومات میں سے ہر چیز کو محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ علم اس کی صفاتِ ذاتیہ میں سے ایک صفت ہے اور اللہ تعالیٰ ان صفات

کے ساتھ ازل سے متصف ہے اور ابد تک متصف رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے اعمالِ طاعات
ومعاصی کا علم اور ان کے رزق وآجال وغیرہ کے احوال کا علم رکھنا اسی علم سے متعلق ہے۔

مرتبۂ ثانیہ : دوسرا مرتبہ لکھنا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ میں مخلوق کی تقدیریں
لکھ دی ہیں، چنانچہ کائنات میں جو بھی حادثہ رونما ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے رونما ہونے سے پہلے
اسے جانتا ہے اور اسے لکھا ہوا بھی ہے۔

ایمان بالقدر کے درجہ اولیٰ کے ان دونوں مراتب کے ذکر کے بعد شیخ رحمہ اللہ نے کتاب
وسنت سے دلائل ذکر کیئے ہیں، چنانچہ شیخ رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں جو حدیث بیان کی ہے وہ
ابوداؤد کی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

عن عبادة بن الصامت ؓ:[سمعت رسول الله ﷺ يقول: اول ماخلق الله
القلم. فقال له :اكتب .قال وما اكتب .قال: اكتب مقادير كل شي حتى تقوم
الساعة]

ترجمہ: عبادۃ بن الصامت ؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ
فرماتے ہوئے سنا: [سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا فرمایا: چنانچہ اسے کہا: لکھو! قلم نے کہا:
کیا لکھوں! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قیامت تک آنیوالی ہر چیز کی تقدیر لکھو۔]

یہ حدیث ''مرتبۂ کتابت'' پر دلالت کر رہی ہے، اور اس بات پر بھی کہ تمام تقدیریں لکھی جا چکی
ہیں۔

''اول ما خلق الله القلم قال له اكتب'' اس عبارت کو دو طرح پڑھا گیا ہے۔ لفظِ
''اول'' اور لفظِ ''القلم'' دونوں پر نصب اور دونوں پر رفع، نصب کی حالت میں یہ کلام ایک
جملہ ہے اور معنی یہ ہوگا کہ قلم کی تخلیق کے اول مرحلے ہی میں قلم سے کہا گیا: لکھو!۔ جبکہ رفعی حالت
میں یہ کلام دو جملوں پر مشتمل ہوگی، پہلا جملہ ''اول ما خلق الله القلم'' اور دوسرا جملہ ''قال له

اكتب'' اس صورت میں معنی ہوگا کہ مخلوقات میں سے سب سے پہلی مخلوق قلم ہے۔

''فما اصاب الانسان لم يكن ليخطئه'' یہ عبارت راوی حدیث جنابِ عبادۃ بن
الصامت ؓ کا کلام ہے (حدیث کا حصہ نہیں)

اس کا معنی یہ ہے کہ انسان کو نفع یا نقصان پہنچانے والی جو بھی چیز پہنچتی ہے وہ اس انسان کے
مقدر میں لکھی ہوئی ہوتی ہے، اس نے لازماً واقع ہو کر رہنا ہے، اس کے برخلاف کوئی چیز واقع
ہو ہی نہیں سکتی۔

''جفت الاقلام و طويت الصحف'' ''قلمیں خشک ہو چکی ہیں اور صحائف لپیٹے جا چکے
ہیں'' یہ عبارت اس بات سے کنایہ ہے کہ تقادیر لکھی جا چکی ہیں اور اس مسئلہ سے فراغت پائی
جا چکی ہے۔ جامع ترمذی میں ابن عباس ؓ سے یہ الفاظ مروی ہیں ''رفعت الاقلام و جفت
الصحف'' یعنی قلمیں اٹھائی جا چکی ہیں اور صحائف خشک ہو چکے ہیں۔ دونوں عبارتوں کا مطلب
ایک ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ علم کے اثبات پر قرآنی دلائل

اس سلسلہ میں شیخ نے پہلی آیت یہ ذکر کی ہے:

﴿ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ ذٰلِكَ فِي كِتَابٍ إِنَّ
ذٰلِكَ عَلَى اللهِ يَسِيرٌ ﴾ (الحج:۷۰)

ترجمہ: ''کیا آپ نے نہیں جانا کہ آسمان وزمین کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے۔ یہ سب لکھی
ہوئی کتاب میں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ پر تو یہ امر بالکل آسان ہے''

آیتِ کریمہ میں استفہام تقریری ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اے محمد ﷺ آپ کو اس بات کا
یقینی علم حاصل ہے: آیت میں اس بات کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم عالم سفلی وعلوی کو محیط ہے، اور
یہی مرتبہ علم ہے، ''في كتاب'' یعنی لوحِ محفوظ میں مکتوب ہے۔ میں مرتبہ کتابت کا بیان ہے۔

'' إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ '' ''یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے''، یعنی اللہ کے علم کا آسمان اور زمین کی ہر چیز کا احاطہ کرنا اور پھر اسے کتابت فرمانا اس پر آسان ہے۔

شاہد آیت: آیتِ کریمہ میں ہر چیز کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کے علم اور لوحِ محفوظ میں اس کے مکتوب ہونے کا اثبات ہے اور درجہ اولیٰ انہی مراتب کو متضمن ہے۔

دوسری آیت: ﴿ مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ ﴾ (الحدید:۲۲)

ترجمہ: ''نہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے نہ (خاص) تمہاری جانوں میں، مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے اللہ تعالیٰ پر تو یہ امر بالکل آسان ہے''

یعنی زمین میں جو مصیبت نازل ہوتی ہے مثلاً قحط، بارش، نباتات میں ضعف اور پھلوں کی کمی وغیرہ یا جو مصیبت انسانوں میں نازل ہوتی ہے مثلاً: تکالیف، امراض اور تنگیٔ عیش وغیرہ یہ سب کچھ تخلیق وایجاد سے پہلے لوحِ محفوظ میں مکتوب ہے اور اتنے کثیر امور کا پہلے سے لوحِ محفوظ میں لکھ لینا اللہ تعالیٰ کیلئے بالکل سہل وآسان ہے۔

شاہد آیت: یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ تمام حوادث وقوع سے قبل ہی لوحِ محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا ان حوادث کو وقوع سے پہلے لکھ لینا، اس کے وقوع سے پہلے علم کو متضمن ہے، اس لحاظ سے یہ آیت بھی مرتبۂ علم وکتابت کی زبردست دلیل ہے۔

اسکے بعد شیخ رحمہ اللہ نے تقدیر کی دو نوع کی طرف اشارہ فرمایا ہے، تقدیر عام اور تقدیر خاص۔

تقدیر عام: یہ کائنات کی ہر چیز کو شامل ہے، اور یہی تقدیر لوحِ محفوظ میں مکتوب ہے، اس نوع پر مفصل بحث مع ادلہ گذر چکی ہے۔

تقدیر خاص: تقدیر کی یہ نوع درحقیقت نوعِ عام کی تفصیل ہے، اس کی پھر تین انواع ہیں، تقدیر عمری، تقدیر حولی، تقدیر یومی۔

(۱) تقدیر عمری: اس نوع کا ذکر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے، چنانچہ اس حدیث میں ہے کہ بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اس کے متعلق چار باتیں لکھی جاتی ہیں، رزق، وقتِ موت، عمل، اور شقاوت یا سعادت۔

(۲) تقدیر حولی: اس سے مراد وہ تقدیر ہے جو ایک سال کے واقعات کے متعلق لیلۃ القدر میں مقرر کی جاتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ﴾
ترجمہ ''اسی رات میں ہر ایک مضبوط کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے'' (الدخان:۴)

(۳) تقدیر یومی: اس سے مراد حوادث یومیہ ہیں مثلاً: موت، حیات، عزت اور ذلت وغیرہ جنہیں اللہ تعالیٰ ہر دن کے حوالے سے متعین اور مقرر فرماتا ہے۔
چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴾ (الرحمٰن:۲۹)
ترجمہ ''ہر روز وہ ایک شان میں ہے''

نیز ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

[ان الله خلق لوحا محفوظا من درة بيضاء ،دفتاه من ياقوتة حمراء ،قلمه نور وكتابته نور عرضه مابين السماء والأرض ينظر فيه كل يوم ثلاثمائة وستين نظرة يحيى ويميت ، ويعز ويذل ، ويفعل ما يشاء ، فكذلك قوله سبحانه : ﴿ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴾] (رواه عبدالرزاق وابن المنذر والطبرانی والحاكم)

ترجمہ: [اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ کو سفید موتی سے پیدا فرمایا ہے، اس کے دونوں پاٹ سرخ یاقوت کے ہیں، اس کا قلم وکتاب دونوں نور ہیں، اور اس کا عرض آسمان وزمین کے درمیان کی مسافت جتنا ہے، اللہ تعالیٰ ہر دن اس میں تین سو ساٹھ دفعہ دیکھتا ہے، زندہ فرماتا ہے، مارتا ہے، عزت دیتا ہے اور ذلت دیتا ہے، اور جو چاہتا ہے کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴾ کا یہی معنی ہے۔]

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس تقدیر (جس کا ابھی ابھی بیان ہوا ہے اور اس کے دو نوع، عام وخاص بیان کی گئی ہیں) کا غالی قسم کے منکرینِ قدر نے انکار کیا ہے، یعنی یہ لوگ، اشیاء کے وقوع سے پہلے اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کے لوحِ محفوظ میں لکھے جانے کا انکار کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امر ونہی ارشاد فرمائے ہیں امر ونہی کے ارشاد فرماتے وقت اسے معلوم نہیں ہوتا کہ کون اس معاملہ میں اس کی اطاعت کرے گا اور کون نافرمانی۔ (والعیاذ باللہ) تقدیر کا معاملہ مستأنف ہے یعنی اسی وقت اللہ کے علم میں آتا ہے جب بندہ عمل کرتا ہے پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں نہیں ہوتا۔

ائمہ اسلام نے ان غالی قسم کے منکرین قدر پر کفر کا حکم لگایا ہے، البتہ اب اس قسم کے غالیوں کا وجود باقی نہیں رہا ہے، اس لئے شیخ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ آج کے دور میں منکرین تقدیر بہت کم ہیں، آج تقدیر میں انحراف کرنے والے اللہ تعالیٰ کے علمِ سابق کا اقرار تو کرتے ہیں لیکن بندوں کے افعال کے تقدیر میں داخل ہونے کی نفی کرتے ہیں، ان کا زعمِ باطل یہ ہے کہ اعمالِ عباد ان کیلئے الگ سے بنائے گئے ہیں پہلے سے پیدا شدہ نہیں اور نہ ہی تقدیر میں ہر چیز کے لکھے جانے سے افعالِ عباد مراد ہیں۔ اس کا ذکر اگلے صفحات میں بھی آئے گا۔

الدرجة الثانيه وماتتضمنه

درجہ ثانیہ اور یہ درجہ جن امور کو متضمن ہے، کا بیان

واما الدرجة الثانية : فهي مشيئة الله النافذة وقدرته الشاملة ،وهو الإيمان بأن ماشاء الله كان وما لم يشأ لم يكن . وانه مافي السموات ومافي الارض من حركة ولاسكون إلا بمشيئة الله سبحانه .ولا يكون في ملكه مالايريد .وانه سبحانه على كل شئ قدير من الموجودات والمعدومات .فما من مخلوق في الارض ولافي السماء إلا الله خالقه سبحانه ،لاخالق غيره ولارب سواه.

❁ ❁ ❁

دوسرا درجہ: دوسرا درجہ اللہ تعالیٰ کی مشیتِ نافذہ اور قدرتِ شاملہ کا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لانا کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا وہی ہوا اور جو اس نے نہیں چاہا وہ نہیں ہوا، اور یہ کہ آسمان وزمین کی ہر حرکت وسکون اللہ تعالیٰ کی مشیت سے صادر ہوتی ہے، (اس کی سلطنت میں صرف وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے،) اور جو وہ نہیں چاہتا وہ بالکل نہیں ہوتا، وہ موجودات ومعدومات میں سے ہر ایک چیز پر قادر ہے، آسمان وزمین میں پائی جانیوالی ہر مخلوق کا خالق وہی ہے، اس کے سوا نہ کوئی خالق ہے نہ رب۔

عبارت کی تشریح

شرح

یہاں پر تقدیر کے چار مراتب میں سے آخری دو کا بیان ہو رہا ہے، چنانچہ مرتبہ ثانیہ یہ ہے کہ ''کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہو رہا ہے، اس مشیت کو کوئی رد نہیں

کرسکتا، اسی طرح کائنات میں موجود ومعدوم ہرشئی صرف اور صرف اس کی قدرت سے ہے"

اس مرتبہ کا معنی ومفہوم یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا ہے وہ ہوا ہے اور جونہیں چاہا وہ نہیں ہوا، اور یہ کہ آسمان وزمین میں جو حرکت وسکون ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے اور یہ کہ موجودات ومعدومات میں سے ہر ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہے، اللہ تعالیٰ کی شان ہے "ان اللہ علی کل شیٔ قدیر" (یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے) اور "کل شیٔ" کے عموم میں موجودات ومعدومات میں سے ہر ہر چیز داخل ہے۔

مرتبہ رابعہ یہ ہے کہ "آسمان وزمین کی ہر مخلوق کا خالق اللہ تعالیٰ ہے" اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا ہر چیز مخلوق ہے اور تمام افعالِ خیر وشر اللہ تعالیٰ کے خلق فرمانے سے ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ تقدیر کے مراتب کے ذکر کے بعد تقدیر کے متعلق کچھ مسائل پر متنبہ فرمانا چاہتے ہیں

پہلا مسئلہ: تقدیر اور شریعت میں باہم کوئی تعارض نہیں ہے۔

دوسرا مسئلہ: اللہ تعالیٰ کے وقوع معاصی کو مقدر کرنے اور اس کے ان سے بغض رکھنے میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

تیسرا مسئلہ: افعالِ عباد کے اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہونے اور عباد کا ان افعال کو اپنے اختیار سے کرنے میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

۲.۱ لا تعارض بین القدر والشرع، ولا بین تقدیرہ للمعاصی وبغضہ لھا

شرع اور قدر کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے معاصی کو مقدر کرنے اور اس کے ان سے بغض رکھنے میں کوئی تعارض ہے۔

ومع ذلک فقد امر العباد بطاعتۃ وطاعۃ رسلہ ونھاھم عن معصیتہ. وھو سبحانہ یحب المتقین والمحسنین والمقسطین .ویرضی عن الذین آمنوا وعملوا الصالحات ولایحب الکافرین .ولایرضی عن القوم الفاسقین. ولایأمر بالفحشاء .ولایرضی لعبادہ الکفر ولایحب الفساد.

❁ ❁ ❁

باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنی اور اپنے رسولوں کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور انہیں اپنی معصیت سے روکا ہے، اور وہ متقین، محسنین اور عدل کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے، اور ایمان دار اور نیک عمل کرنیوالوں سے راضی ہوتا ہے، اور کافروں سے محبت نہیں کرتا، اور فاسقوں سے راضی نہیں ہوتا اور فحشاء کا حکم نہیں دیتا، اور اپنے بندوں کیلئے کفر اور فساد کو پسند نہیں فرماتا۔

عبارت کی تشریح

شرح

شیخ رحمہ اللہ تقدیر کے چار مراتب علم، کتابت، مشیت وارادہ اور خلق وایجاد کے بیان کے بعد اور یہ بتانے کے بعد کہ اللہ رب العزت جس چیز کو ایجاد فرماتا ہے اسے اس کا پہلے سے علم ہوتا ہے اور وہ اس نے لکھ بھی دیا ہے اور اس چیز کا ظہور میں آنا اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ کے تحت ہوتا

ہے، اب یہ بات بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا تقدیر مقدر کرنا اور پھر اپنی اطاعت کا حکم دینا اور اپنی معصیت سے روکنا، کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، اور اسی طرح وقوع معصیت کی تقدیر مقرر کرنے اور اس سے بغض رکھنے میں بھی کوئی تعارض نہیں ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں: ''ومع ذلک فقد امر اللہ العباد ...... ''یعنی'' باوجودیکہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کے متعلق علم رکھتا ہے، اس نے انہیں مقدر کیا ہے اور انہیں اپنے پاس لکھ لیا ہے، ان کا ارادہ فرمایا ہے، اور ان کا خالق موجد بھی وہی ہے، اس نے اپنے بندوں کو اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کا حکم دیا اور اپنی معصیت سے روکا ہے۔'' جیسا کہ کتاب وسنت کے بہت سے دلائل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اطاعت کا حکم دیا ہے اور معصیت سے منع فرمایا ہے، جس سے ثابت ہوا کہ شریعت اور تقدیر میں کوئی تعارض نہیں (اگر تعارض ہوتا تو اللہ تعالیٰ قطعاً ان دونوں باتوں کو ذکر نہ کرتا) جیسا کہ بعض گمراہ لوگوں کا ظنِ باطل ہے جو شریعت اور قدر میں تعارض پیدا کرتے ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ اس موضوع پر کلام کرتے ہوئے اپنے رسالہ ''التدمرية'' میں فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں گمراہی میں مبتلا لوگ تین فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں: مجوسیہ، مشرکیہ اور ابلیسیہ۔

المجوسية: یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی تکذیب کرتے ہیں، اگرچہ اس کے امرونہی پر ایمان رکھتے ہیں، البتہ ان میں جو غالی طبقہ ہے وہ مسئلہ تقدیر میں علم وکتابت کا انکار کرتا ہے، جبکہ ان کا معتدل طبقہ اللہ تعالیٰ کی عمومی مشیت اور خلق وقدرت کا انکار کرتا ہے۔ اس سے مراد معتزلہ اور ان سے موافقت رکھنے والے فرقے ہیں۔

المشركية: یہ لوگ قضاء وقدر کا تو اقرار کرتے ہیں، البتہ امرونہی کا انکار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوا لَوْشَاءَ اللّٰهُ مَااَشْرَكْنَا وَلَا آبَائُنَا وَلَاحَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ﴾ (الانعام:۱۴۸)

ترجمہ ''یہ مشرکین (یوں) کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہی ہمارے باپ دادا اور نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام کہہ سکتے''

پس جو بھی اللہ تعالیٰ کے امرونہی کے معطل ہونے کا عقیدہ رکھے گا اس کا تعلق اسی فرقے سے ہوگا۔

الابليسيه: یہ فرقہ دونوں باتوں (شرع وقدر) کا تو اقرار کرتے ہیں لیکن اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تناقض پر محمول کرتے ہیں اور اس کی حکمت وعدل میں طعنہ کرتے ہیں، اس فرقہ کے پیشوا ''ابلیس'' سے یہی نظریہ منقول ہے۔

یہاں اہل ضلال کی ہذیان گوئی ذکر کرنا مقصود تھی، جبکہ ان گمراہ فرقوں کے بالمقابل ہدایت اور فلاح پر قائم لوگ دونوں باتوں پر ایمان رکھتے ہیں، یہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ ہر شئی کا خالق، رب اور مالک اللہ تعالیٰ ہے، اس نے جو چاہا وہی ہوا اور اس نے جو نہ چاہا نہ ہوا اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اور اس نے علم کے اعتبار سے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے اور اس نے ہر چیز کو لوحِ محفوظ میں محفوظ کیا ہوا ہے۔

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وهو سبحانه يحب المتقين......''

یعنی اللہ تعالیٰ تقویٰ، احسان اور عدل وانصاف جیسی صفاتِ حمیدہ سے متصف لوگوں سے محبت کرتا ہے اور ایمان دار اور نیک عمل کرنیوالوں سے راضی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عملِ صالح سے متصف لوگوں سے اپنی محبت اور رضا کی خبر قرآن کی متعدد آیات میں دی ہے۔ اس کے مقابل جو لوگ کفر، فسق اور دیگر صفات ذمیمہ سے متصف ہیں اللہ تعالیٰ ان سے راضی نہیں ہوتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ قبیح قسم کے اقوال وافعال کا حکم فرماتا ہے اور نہ ہی اپنے بندوں کیلئے کفر وفساد کو پسند فرماتا ہے، کیونکہ یہ دونوں کام انتہائی قبیح اور انسانوں اور شہروں کیلئے انتہائی ضرر رساں ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ اپنی اس کلام میں ان لوگوں پر رد کرنا چاہتے ہیں، جن کا یہ زعمِ باطل ہے کہ "ارادہ اور محبت آپس میں لازم ملزوم ہیں، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے تو یقیناً اس سے محبت بھی کرتا ہے اسی طرح جب کسی چیز کی مشیت فرماتا ہے تو یقیناً اس سے محبت بھی کرتا ہے۔"

ان لوگوں کا یہ قول سراسر باطل ہے، جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ ارادہ کونیہ اور محبت یا مشیت اور محبت میں کوئی تلازم نہیں ہے، چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی چیز کی مشیت فرماتا ہے کہ جس سے محبت نہیں کرتا، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز سے محبت تو کرتا ہے لیکن اس کے ایجاد کی مشیت نہیں فرماتا۔

پہلی بات کی مثال: ابلیس اور اس کے لشکر کا وجود اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت نہیں فرماتا، اسی طرح یہ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی مشیت سے وجود میں آئی ہے لیکن اس کائنات میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ بغض رکھتا ہے۔

دوسری بات کی مثال: اللہ تعالیٰ اس بات سے محبت کرتا ہے کہ کفار ایمان لائیں اور نیک عمل کریں لیکن ان میں ایمان واطاعت کے موجود ہونے کی مشیت نہیں فرمائی، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ ان میں ایمان واطاعت کے موجود ہونے کی مشیت فرماتا تو یقیناً وہ سب مؤمن اور فرمانبردار ہوتے۔

٣.لاتنافی بین اثبات القدر واسناد افعال العباد إليهم حقيقة وانهم يفعلونها باختيارهم

اثبات قدر اور بندوں کے افعال کی ان کی طرف حقیقی کرنے اور یہ کہ وہ یہ افعال اپنے اختیار سے بجالاتے ہیں، کے مابین کوئی تعارض نہیں

والعباد فاعلون حقيقة والله خالق أفعالهم ،والعبد هو المؤمن والكافر والبر والفاجر والمصلى والصائم وللعباد قدرة على أعمالهم ولهم إرادة، والله خالقهم وخالق قدرتهم وإرادتهم كماقال تعالىٰ: ﴿ لِمَنْ شَاءَ مِنكُمْ اَن يَّسْتَقِيمَ .وَمَاتَشَاءُ وْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ﴾ (التكوير: ٢٨، ٢٩)

وهذه الدرجة من القدر يكذب بها عامة القدرية الذين سماهم النبى ﷺ مجوس هذه الامة .ويغلو فيها قوم من أهل الإثبات حتى سلبوا العبد قدرته واختياره ، ويخرجون عن أفعال الله وأحكامه حكمها ومصالحها.

۞ ۞ ۞

ترجمہ: بندے حقیقتاً اپنے افعال کے فاعل ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی بندوں کے افعال کا خالق ہے مؤمن، کافر، نیک، فاجر، نمازی اور صائم وغیرہ تمام بندوں کو اپنے اپنے اعمال پر قدرت حاصل ہے اور یہ سب اپنے اپنے افعال اپنے ارادہ سے کرتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ ان سب بندوں کا اور ان کی قدرت وچاہت کا خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لِمَنْ شَاءَ مِنكُمْ اَن يَّسْتَقِيمَ .وَمَاتَشَاءُ وْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ﴾

ترجمہ "(بالخصوص) اس کیلئے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلتا ہے۔ اور تم بغیر پروردگار عالم کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے" (التکویر:٢٨، ٢٩)

تقدیر کے اس درجہ کا عام قدریہ نے انکار کیا ہے، نبی ﷺ نے انہی کو اس امت کے مجوسی قرار دیا ہے۔ جبکہ تقدیر کے اس درجہ کا اثبات کرنیوالوں میں سے ایک قوم نے غلو کا شکار ہوکر بندہ سے اس کی قدرت اور اختیار کو سلب کرلیا ہے ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے افعال واحکام سے اس کی حکمتوں اور مصالح کو خارج کر دیا ہے۔

عبارت کی تشریح

......شرح......

شیخ رحمہ اللہ اس کلام میں اس بات کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ تقدیر کے مذکورہ مراتب کے ساتھ اثبات کرنے اور اس بات میں کہ بندے اپنے اپنے افعال اپنے اختیار اور ارادہ سے کرتے ہیں، میں کوئی منافات نہیں ہے۔

اس سے شیخ رحمہ اللہ کا مقصد ان لوگوں پر رد ہے جن کا یہ زعم باطل ہے کہ ان دونوں باتوں کے اثبات سے تناقض لازم آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض لوگ اثباتِ قدر میں غلو کا شکار ہوتے ہیں حتی کہ انہوں نے بندے سے افعال پر اس کی قدرت واختیار کو سلب کرلیا ہے، جبکہ ایک دوسرا گروہ بندوں کے افعال اور ان کے اختیار میں غلو کا شکار ہوا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے بندوں کو ہی اپنے اپنے افعال کا خالق قرار دے دیا ہے اور یہ کہ ان افعال کا اللہ تعالیٰ کی مشیت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ان کے افعال اس کی قدرت کے تحت ہیں۔

پہلے گروہ کو جبریہ کہا جاتا ہے کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ بندہ اپنے افعال پر مجبور ہے اسے اس سلسلہ میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ جبکہ دوسرے گروہ کو قدریہ اور نفاۃ کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ لوگ تقدیر کی نفی کرتے ہیں۔

چنانچہ شیخ رحمہ اللہ طائفہ ''جبریہ'' پر رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں'' والعباد فاعلون حقيقة'' بندے اپنے افعال کے حقیقتاً فاعل ہیں۔

کیونکہ یہ کہتے ہیں کہ بندے افعال کے حقیقتاً فاعل نہیں ہیں، اور افعال کی نسبت جو بندوں کی طرف کی گئی ہے یہ مجازی ہے۔ اس کے بعد شیخ رحمہ اللہ دوسرے گروہ ''القدرية النفاة'' پر رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:'' والله خالقهم وخالق افعالهم ''یعنی اللہ تعالیٰ ہی بندوں اور ان کے افعال کا خالق ہے۔ کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ افعالِ عباد کا خالق اللہ تعالیٰ نہیں ہے بلکہ عباد خود ہی مستقلاً اپنے افعال کے خالق ہیں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور تقدیر کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اور جبریہ کا مزید رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں'' والعبد هو المؤمن والكافر والبر والفاجر والمصلي والصائم وللعباد قدرة على أعمالهم ولهم إرادة ''یعنی ''اللہ تعالیٰ مؤمن، کافر، نیک، فاجر، نمازی اور صائم وغیرہ تمام بندوں کو اپنے اپنے اعمال پر قدرت حاصل ہے اور یہ افعال وہ اپنے ارادے سے کرت ہیں''

یعنی بندے اپنے ان افعال میں مجبور نہیں ہیں، کیونکہ اگر یہ بات درست ہوتی تو پھر ان افعال کی بناء پر بندوں کی توصیف قطعاً درست نہ ہوتی، کیونکہ مجبور شخص کے فعل کی نہ تو اس کی طرف نسبت کی جاتی ہے نہ ہی اس فعل کی وجہ سے اس کی توصیف کی جاتی ہے اور نہ ہی وہ اس فعل پر کسی قسم کے ثواب یا عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔

شیخ رحمہ اللہ فرقہ ''قدریہ، النفاة'' کا مزید رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:'' والله خالقهم وخالق قدرتهم ''یعنی ''اللہ تعالیٰ بندوں کا اور ان کی قدرت کا خالق ہے'' کیونکہ قدریہ کا زعمِ باطل ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کے بغیر اپنے افعال کے خود ہی خالق ہیں۔ (کما تقدم)

اسکے بعد شیخ رحمہ اللہ نے ان دونوں گمراہ فرقوں کے رد کیلئے اس آیت سے استدلال کیا ہے:

﴿ لِمَنْ شَاءَ مِنكُمْ اَن يَّسْتَقِيمَ .وَمَاتَشَاءُ وْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ﴾

ترجمہ ''(بالخصوص) اس کیلئے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا ہے۔ اور تم بغیر پروردگار عالم کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے'' (التکویر:۲۸،۲۹)

پہلی آیت '' لِمَنْ شَاءَ مِنكُمْ اَن يَّسْتَقِيمَ '' میں جبریہ پر رد ہے، کیونکہ اس میں بندوں کیلئے مشیت کا اثبات ہے جبکہ یہ لوگ اس کی نفی کرتے ہیں۔

اور دوسری آیت '' وَمَاتَشَاءُ وْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ '' میں قدریہ پر رد ہے، ان کا کہنا ہے کہ ایجاد فعل میں بندے کی مشیت مستقل ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف نہیں ہے۔ ان کا یہ نظریہ باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں مشیت عباد کو اپنی مشیت کے ساتھ معلق و مربوط کر دیا ہے۔

تقدیر کے اس درجہ ''مشیت، ارادہ، خلق اور یہ کہ عباد بھی حقیقتاً اپنے افعال کے خالق ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا اور ان کے افعال کا خالق ہے'' کی اکثر قدریہ نے تکذیب کی ہے، ان کا زعم باطل یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود ہی خالق ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ''مجوس هذه الأمة'' یعنی ''اس امت کا مجوسی'' قرار دیا ہے، یعنی یہ لوگ اپنے اس باطل نظریہ میں مجوسیوں کے مشابہ ہیں، کیونکہ مجوسی دو خالقوں کا اثبات کرتے ہیں ''النور'' اور ''الظلمة'' ان کا کہنا ہے کہ خیر ''النور'' کا فعل ہے اور شر ''الظلمة'' کا فعل ہے۔ اس طرح یہ لوگ دو خالقوں کا اثبات کر کے ''الثنوية'' ہو گئے ہیں، جبکہ قدریہ نے بھی بندوں کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ و مشیت کے بغیر افعال کا خالق قرار دیکر اللہ تعالیٰ کے ساتھ خالق قرار دے دیا ہے بلکہ یہ لوگ بندوں کو اپنے افعال کا مستقلاً خالق قرار دیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا انہیں (قدریہ) ''مجوس هذ الامة'' قرار دینا صحیح ثابت نہیں ہے کیونکہ ان کا ظہور تو نبی ﷺ کے زمانہ کے بعد ہوا ہے البتہ صحابہ کرام سے ان کی مذمت میں اقوال ثابت ہیں۔

قدریہ کی تکذیب کے مقابل ''جبریہ'' نے تقدیر کے اس درجہ کے اثبات میں غلو سے کام لیا ہے ''غلو'' کا معنی ہے کسی چیز میں اس کی مطلوبہ حد سے زیادتی کرنا۔ جبریہ کا کہنا ہے کہ بندہ اپنے فعل پر مجبور کیا گیا ہے، اس طرح انہوں نے بندہ سے اس فعل پر اس کی قدرت اور اختیار کو سلب کر لیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ پہلے گروہ (قدریہ) نے اثبات افعالِ عباد میں غلو کیا ہے، یہاں تک کہ ان افعال کو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے خارج کر دیا ہے اور دوسرے گروہ (جبریہ) نے نفی افعالِ عباد میں غلو کیا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے بندوں سے قدرت و اختیار کو سلب کر لیا ہے۔

جبریہ اپنے نفی افعالِ عباد کے باطل نظریہ میں ایک اور باطل قول کے مرتکب ہوئے ہیں، وہ یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ بندوں کو ایسے افعال پر عذاب و عقاب دیتا ہے جو ان کا فعل ہے ہی نہیں اور انہیں ایسے افعال کا حکم دیتا ہے جس پر بندے قدرت ہی نہیں رکھتے، کیونکہ جب انہوں نے افعالِ عباد کی نفی کی اور بندوں سے قدرت اور اختیار کو سلب کر لیا تو نتیجۃً اللہ تعالیٰ کے امر و نہی، ثواب و عقاب میں حکمت و مصلحت کی نفی کے مرتکب ہوئے، اپنے اس باطل قول کی وجہ سے انہوں گویا اللہ تعالیٰ کو ظلم و عبث (بے کار اور حکمت و مصلحت سے خالی کام) سے متہم کیا ہے۔ (تعالیٰ اللہ عما یقولون علوا کبیرا)

حقيقة الايمان وحكم مرتكب الكبيرة

حقیقتِ ایمان اور مرتکبِ گناہِ کبیرہ کے حکم کا بیان

ومن اصول اهل السنة والجماعة ان الدين والايمان قول وعمل. قول القلب واللسان ، وعمل القلب واللسان والجوارح . وأن الإيمان يزيد بالطاعة وينقص بالمعصية . وهم مع ذلك لا يكفرون أهل القبلة بمطلق المعاصي والكبائر كما يفعله الخوارج، بل الأخوة الإيمانية ثابتة مع المعاصي . كما قال سبحانه في آية القصاص :﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ﴾ وقال :﴿ وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فإن بغت إحداهما على الأخرى فقاتلوا التي تبغي حتى تفيء إلى أمر الله فإن فآءت فأصلحوا بينهما بالعدل وأقسطوا إن الله يحب المقسطين 0 إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم ﴾ ولا يسلبون الفاسق الملّي الإسلام بالكلية . ولا يخلدون في النار كما تقوله المعتزلة. بل الفاسق يدخل في اسم الإيمان المطلق كما في قوله تعالىٰ :﴿ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ ﴾ وقد لا يدخل في اسم الإيمان المطلق كما في قوله تعالىٰ: ﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا ﴾ وقوله ﷺ [لايزني الزاني حين يزني وهو مؤمن،ولايسرق السارق حين يسرق و هو مؤمن ،ولايشرب الخمر حين يشربها وهو مؤمن، ولاينتهب نهبة ذات شرف يرفع الناس إليه فيها ابصارهم حين ينتهبها وهو مؤمن] ونقول هو مؤمن ناقص الإيمان ، أو مؤمن بإيمانه فاسق بكبيرته فلا يعطل الاسم المطلق ولا يسلب مطلق الاسم .

ترجمہ: اہل السنۃ والجماعۃ کے اصول میں دین اور ایمان، قول وعمل کا نام ہے یعنی قلب ولسان کا اقرار اور قلب، لسان اور اعضاء کا عمل اور یہ کہ ایمان اطاعت سے بڑھتا ہے اور معصیت سے کم ہوتا ہے ایمان کے متعلق اس نظریہ کے باوجود اہل السنۃ، اہلِ قبلہ کی مطلق معاصی اور کبائر کی بناء پر تکفیر نہیں کرتے ،جیسا کہ خوارج کرتے ہیں ، بلکہ معاصی کے باوجود اخوتِ ایمانی قائم رہتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ آیتِ قصاص میں فرماتا ہے:

﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ﴾ (البقرۃ:۱۷۸)

ترجمہ ''جس کسی کو اس کے بھائی کی طرف سے معافی دے دی جائے اسے بھلائی کی اتباع کرنی چاہیئے''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا...... ﴾ الی قولہ : ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ﴾ (الحجرات:۹تا۱۰)

ترجمہ: ''اور اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں میل ملاپ کرادیا کرو۔ پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسری (جماعت) پر زیادتی کرے تو تم (سب) اس گروہ سے جو زیادتی کرتا ہے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے ،اگر لوٹ آئے تو انصاف کے ساتھ صلح کرادو اور عدل کرو بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۔ یاد رکھو سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں پس اپنے دو بھائیوں میں ملاپ کرادیا کرو''

اہل السنۃ فاسق مسلمان سے کلیۃً اسلام سلب نہیں کرتے اور نہ اسے دائمی جہنمی قرار دیتے ہیں، جیسا کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے، بلکہ فاسق ایمانِ مطلق کے اسم میں داخل رہتا ہے جیسا کہ

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ﴾ (النساء:۹۲)

ترجمہ ''اس پر ایک مسلمان غلام کی گردن آزاد کرنا ہے''

اور کبھی ایمانِ مطلق کے اسم میں داخل نہیں بھی ہوتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا ﴾ (الانفال:۲)

ترجمہ ''بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

[لایزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن، ولایسرق السارق حین یسرق وھو مؤمن، ولایشرب الخمر حین یشربھا وھومؤمن، ولاینتھب نھبة ذات شرف یرفع الناس إلیه فیھا ابصارھم حین ینتھبھا وھو مؤمن] (بخاری ومسلم)

ترجمہ ''زانی جب زنا کر رہا ہوتا ہے اس وقت وہ مؤمن نہیں ہوتا، چور جب چوری کر رہا ہوتا ہے اس وقت وہ مؤمن نہیں ہوتا اور ڈاکو جب کسی عمدہ نفیس شئی پر ڈاکہ ڈال رہا ہوتا ہے اور لوگ اس کی طرف آنکھیں اٹھائے دیکھ رہے ہوتے ہیں تو وہ بھی اس وقت مؤمن نہیں ہوتا]

ہم کہتے ہیں کہ ایسا شخص مؤمن ناقص الایمان ہوتا ہے اپنے ایمان کی وجہ سے تو مؤمن ہے البتہ ارتکابِ کبیرہ کی وجہ سے فاسق ہے، لہذا ایسے شخص کو نہ تو ایمانِ مطلق کا نام دیا جائے اور نہ ہی اس سے مطلق اسم ایمان سلب کیا جائے۔

عبارت کی تشریح

''اہل السنۃ کے اصول'' سے مراد ایسے قواعد ہیں جن پر اہل السنۃ کے عقائد کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

''الدین'' کا لغوی معنی جھکنا اور انقیاد ہے، جبکہ شرعی اصطلاح میں ''ہر وہ چیز جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے'' کو کہتے ہیں۔

''الایمان'' کا لغوی معنی تصدیق کرنا ہے، جبکہ شرعی اصطلاح میں قول وعمل یعنی دل وزبان کا اقرار اور دل، زبان اور اعضاء کے عمل کو کہتے ہیں، جیسا کہ شیخ رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک ایمان کی یہی تعریف ہے، یعنی ایمان، قول وعمل کا نام ہے۔

قول کی دو قسمیں ہیں: قول القلب، یعنی اعتقاد، اور قول اللسان یعنی اسلام کی حقانیت کا زبان سے اقرار کرنا۔

اسی طرح عمل کی بھی دو قسمیں ہیں: عملِ قلب یعنی نیت اور اخلاص اور عملِ جوارح یعنی اعضاء کا عمل جیسے نماز، حج اور جہاد۔

قلب کے اقوال واعمال میں فرق:

قلب کے اقوال واعمال میں فرق یہ ہے کہ اقوال سے مراد عقائد ہیں، قلب جن کا اعتراف کرتا ہے اور اعتقاد رکھتا ہے جبکہ اعمالِ قلب سے، قلب کی وہ حرکت ہے جسے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں، قلب کی حرکت سے مراد، قلب کا خیر سے محبت کرنا، اس کا پختہ ارادہ کرنا اور شر سے کراہت کرنا اور ترکِ شر کا عزم کرنا ہے۔

اعمالِ جوارح اور اقوال اللسان، اعمالِ قلب سے ہی پھوٹتے ہیں اس بناء پر اقوال اللسان اور اعمال الجوارح بھی ایمان میں سے ہیں

ایمان کی تعریف میں مختلف اقوال

(ا) اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک: ایمان، قلب کے اعتقاد، زبان کے نطق اور اعضاء سے عمل کرنے کا نام ہے۔

(۲) مرجئہ کے نزدیک: ایمان، صرف دل کے اعتقاد اور زبان کے اقرار کا نام ہے۔

(۳) کرامیہ کے نزدیک: ایمان، زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے۔

(٤) الجبریۃ کے نزدیک: ایمان، قلب سے اعتراف کرنے یا محض قلب کی معرفت کا نام ہے

(۵) المعتزلۃ کے نزدیک: ایمان، قلب کے اعتقاد، زبان کے نطق اور اعضاء کے عمل کا نام ہے۔

معتزلہ اور اہل السنۃ والجماعۃ کے درمیان فرق یہ ہے کہ معتزلہ مرتکبِ کبیرہ سے اسم الایمان بالکلیہ سلب کرتے ہیں اور اسے مخلد فی النار سمجھتے ہیں جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ مرتکبِ کبیرہ سے اسم الایمان بالکلیہ سلب نہیں کرتے بلکہ اسے مؤمن ناقص الایمان کہتے ہیں اور اگر وہ جہنم میں داخل بھی ہو جائے تو اسے مخلد فی النار نہیں سمجھتے۔ ادلہ کثیرہ کی روشنی میں اس مسئلہ میں اہل السنۃ کا قول حق ہے اور باقی تمام اقوال باطل ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہل السنۃ والجماعۃ کے اصول میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ''ایمان اطاعت سے بڑھتا ہے اور معصیت سے کم ہوتا ہے''

یعنی اہل السنۃ والجماعۃ کے اصول میں یہ بات بھی ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، اطاعت سے ایمان بڑھتا ہے اور معصیت سے اس میں کمی واقع ہوتی ہے۔

اس بات کے بہت سے دلائل ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ﴾ (الانفال:۲)

ترجمہ ''بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں''

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ﴾ (الفتح:۴)

ترجمہ: ''تا کہ اپنے ایمان کے ساتھ ہی ساتھ اور بھی ایمان میں بڑھ جائیں''

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''اہل السنۃ اس عقیدے کے باوجود اہل قبلہ کی معاصی اور کبائر کے ارتکاب کی بنا پر تکفیر نہیں کرتے جیسا کہ خوارج کرتے ہیں''

یعنی اہل السنۃ والجماعۃ اپنے اس عقیدے کہ اعمال حقیقت ایمان میں داخل ہیں اور یہ کہ ایمان اطاعت سے بڑھتا اور معصیت سے کم ہوتا ہے کے باوجود، مدعی اسلام اور کعبۃ اللہ کی طرف نماز میں رُخ کرنیوالے پر شرک وکفر کے علاوہ مطلق ارتکاب معاصی کی بنا پر کفر کا حکم نہیں لگاتے، جیسا کہ خوارج کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ مرتکبِ کبیرہ دنیا میں کافر ہے اور آخرت میں ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور کبھی اس سے نہیں نکلے گا۔

جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ اخوت ایمانیہ کو ارتکاب معاصی کے باوجود ثابت مانتے ہیں یعنی عاصی (گناہگار) ایمان میں ہمارا بھائی ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (البقرۃ:۱۷۸)

ترجمہ ''جس کسی کو اس کے بھائی کی طرف سے معافی دے دی جائے اسے بھلائی کی اتباع کرنی چاہیئے''

اگر مجرم کو مظلوم یا اس کا ولی قصاص معاف کر دے اور دیت لینے پر آمادہ ہو جائے تو مستحق مال پر لازم ہے کہ دیت کی طلب میں سختی نہ کرے اور مجرم پر لازم ہے کہ وہ دیت دینے میں ٹال مٹول سے کام نہ لے۔

اس آیت سے وجہ استدلال یہ ہے کہ باوجود یکہ قتل ایک کبیرہ گناہ ہے پھر بھی قاتل کو مقتول کا بھائی کہا گیا ہے یعنی قتل جیسے گناہ کے ارتکاب کے باوجود اخوتِ ایمانی ختم نہیں ہوتی۔

دوسری دلیل: ﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ...... ﴾

الی قوله : ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ (الحجرات:۹تا۱۰)

ترجمہ:''اوراگرمسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں توان میں میل ملاپ کرادیا کرو۔ پھراگران دونوں میں سے ایک دوسری (جماعت) پرزیادتی کرے توتم (سب) اس گروہ سے جوزیادتی کرتا ہے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے ،اگرلوٹ آئے تو انصاف کے ساتھ صلح کرادواور عدل کرو بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔یادرکھو سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں پس اپنے دو بھائیوں میں ملاپ کرادیا کرو''

اس آیت سے وجہ استدلال یہ ہے کہ آپس میں قتال اور بغی کے باوجود دونوں گروہوں کو مؤمنین کہا گیا ہےاور''فاصلحوا بین اخویکم ''میں دونوں گروہوں کواہل ایمان کا بھائی قراردیا گیا ہے۔

مذکورہ آیت کریمہ کا اجمالی معنی یہ ہے کہ اگرمسلمانوں کے دوگروہ آپس میں لڑ پڑیں تو مسلمانوں پرلازم ہے کہ ان میں صلح کرائیں اورانہیں اللہ کے حکم کی طرف دعوت دیں،اگرایک فریق دوسرے پرتعدی کرتا ہےاور صلح قبول نہیں کرتا،تو مسلمانوں پرلازم ہے کہ اس باغی گروہ سے قتال کریں تاآنکہ وہ اللہ کے حکم وامر کی طرف آجائے،اگرباغی گروہ اپنی بغاوت سے رجوع کرلے اور کتاب اللہ سے فیصلہ کرانے پرآمادہ ہوجائے تو پھر مسلمانوں پرلازم ہے کہ وہ ان دونوں گروہوں میں عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کریں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مطلق اپنے تمام امور میں عدل وانصاف کرنے کا حکم ارشاد فرمایاہے،چنانچہ فرمایا:

﴿وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (الحجرات:۹)

''اورعدل کرو،بے شک اللہ تعالیٰ عدل کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے''

آیت مذکورہ میں جملہ''انماالمؤمنون اخوۃ''(اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں) پہلی بات

کی تقریروتاکید ہےیعنی سب کےسب مسلمان ایک ہی امر کی طرف لوٹیں اوروہ امراسلام ہے، اسی طرح سب مسلمان آپس میں دینی بھائی ہیں۔

جملہ''فَاَصْلِحُوا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ''(یعنی اپنے دومسلمانوں بھائیوں میں صلح کراؤ) میں دومسلمانوں میں صلح کے ذکر سے دو سے زائد مسلمانوں میں صلح کرانے کے وجوب کا اثبات بطریق اولیٰ ہورہا ہے۔

اورآخر میں فرمایا:''وَاتَّقُوا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ''یعنی اپنے تمام امور میں تقوی اختیار کرو، اس تقویٰ کے سبب سے اللہ تعالیٰ تم پررحم فرمائے گا۔

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''ولایسلبون الفاسق الملِّی الاسلام بالکلیة،ولایخلدونه فی النار کما تقول المعتزلة''

''اہل السنۃ فاسق مسلمان سے کلیۃ اسلام سلب نہیں کرتے اور نہ اسے دائمی جہنمی قراردیتے ہیں جیسا کہ معتزلہ کاعقیدہ ہے''

''الفسق'' کامعنی اطاعت سے خروج اختیار کرنا ہے،اس عبارت میں''الفاسق'' سے مراد وہ شخص ہے جو گناہِ کبیر کاارتکاب کرتا ہے،جیسے شراب پینا،زنا کرنااور چوری کرنا وغیرہ۔

''المِلّی'' سے مراد وہ شخص ہے جوملتِ اسلام پرقائم ہےاوراس نے کسی ایسے گناہ کاارتکاب نہ کیا جوموجب کفر ہو۔

یعنی اہل السنۃ والجماعۃ فاسق مسلمان سے کلیتًا اسلام کی نفی نہیں کرتے چنانچہ وہ فاسق مسلمان پرنہ تو دنیامیں کفر کاحکم لگاتے ہیں،اورنہ ہی اسے دائمی جہنمی قراردیتے ہیں جیسے کہ معتزلہ اورخوارج کاقول ہے،معتزلہ کہتے ہیں کہ فاسق کومسلمان کہا جائے اورنہ کافر ان کے نزدیک فاسق اسلام اور کفر کے درمیان ایک تیسرے منزلہ پرہے فاسق کے متعلق معتزلہ کا یہ حکم دنیا میں ہے،جبکہ آخرت میں اس پرمخلد فی النار(دائمی جہنمی) ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔

معتزلہ اور خوارج کا یہ مذہب صریحاً باطل ہے ان کے اس مذہب کے بطلان پر کچھ ادلہ گزر چکے ہیں اور مزید آگے آئیں گے (ان شاءاللہ)

اس کے بعد شیخ رحمہ اللہ نے فاسق مسلمان کا حکم کتاب وسنت کے ادلہ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

" بل الفاسق یدخل فی اسم الایمان المطلق کمافی قوله تعالیٰ: ﴿ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ﴾ وقدلایدخل فی اسم الایمان المطلق کمافی قوله تعالیٰ ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ﴾ "

بلکہ فاسق ایمانِ مطلق کے اسم میں داخل ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ﴾ (النساء:۹۲)

ترجمہ "اس پر ایک مسلمان غلام کی گردن آزاد کرنا ہے"

اور کبھی ایمانِ مطلق کے اسم داخل نہیں بھی ہوتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ﴾ (الانفال:۲)

ترجمہ "بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں"

یعنی صحیح اور درست بات یہ ہے کہ فاسق مسلمان، ایمانِ مطلق کے اسم میں داخل ہے کیونکہ مطلق ایمان میں ایمانِ کامل اور ایمانِ ناقص دونوں داخل ہیں، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ﴾ (النساء:۹۲)

یعنی "ظہار اور قتلِ خطأ کے گناہ میں ایک مؤمن گردن آزاد کرنا ہے"

اگر کوئی شخص ان کفارات جن میں مؤمن گردن آزاد کرنے کا حکم ہے، میں کسی فاسق مسلمان کو آزاد کرتا ہے تو باتفاق العلماء اسے کفایت کر جائے گا، کیونکہ فاسق مسلمان عمومِ آیت میں داخل ہے، اگر وہ (آزاد کردہ فاسق مسلمان) کامل مؤمنین میں سے نہیں ہے اور کبھی کبھی فاسق مسلمان ایمان کے اسم میں داخل نہیں بھی ہوتا، یعنی ایمان سے مراد کامل ایمان ہو تو اس صورت میں فاسق مسلمان اس میں داخل نہیں ہوتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ﴾ (الانفال:۲)

ترجمہ "بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں"

یعنی کامل مؤمنین تو صرف اور صرف وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی عظمت، قدرت اور اس کے عذاب کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں، اور جب ان کے سامنے قرآنی آیات یا کائنات میں موجود اللہ تعالیٰ کی قدرت وعظمت کی نشانیاں بیان ہوتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے، اور یہ لوگ اپنے تمام امور کو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں کسی اور کے سپرد نہیں۔

اس آیت میں ایمان سے مراد ایمان کامل ہے (یعنی کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جو ان (آیت میں مذکور) صفات سے متصف ہیں) چنانچہ فاسق مسلمان اس ایمان میں داخل نہیں کیونکہ اس کا ایمان ناقص ہوتا ہے۔

شیخ رحمہ اللہ قرآن سے دلیل ذکر کرنے کے بعد سنت سے دلیل پیش کر رہے ہیں

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان:

[لایزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن، ولایسرق السارق حین یسرق و ھو مؤمن، ولایشرب الخمر حین یشربھا وھومؤمن ،ولاینتھب نھبۃ ذات شرف یرفع الناس إلیہ فیھا ابصارھم حین ینتھبھا وھو مؤمن] (بخاری ومسلم)

ترجمہ ”زانی جب زنا کررہا ہوتا ہے اس وقت وہ مؤمن نہیں ہوتا، چوری جب چوری کررہا ہوتا ہے اس وقت وہ مؤمن نہیں ہوتا اور ڈاکو جب کسی عمدہ نفیس شئی پر ڈاکہ ڈال رہا ہوتا ہے اور لوگ اسی کی طرف آنکھیں اٹھائے دیکھ رہے ہوتے ہیں تو وہ بھی اس وقت مؤمن نہیں ہوتا]

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ زانی، چور اور ڈاکو کامل الایمان مؤمن نہیں ہوتا، حدیث میں زانی، چوراورڈاکو سے کمالِ ایمان کی نفی کی گئی ہے، جمیع ایمان کی نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ زانی، چوراور ڈاکو باجماع المسلمین وراثت کے حق دار ہیں، کتاب وسنت کے دیگر بہت سے نصوص اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ لوگ ان کبائر کی وجہ سے مرتد نہیں ہوجاتے، جو اس بات کی صریح دلیل ہے کہ اس حدیث میں کمال ایمان کی نفی کی گئی ہے، جمیع ایمان کی نہیں۔

آخر میں شیخ رحمہ اللہ بحثِ سابق کا نتیجہ اور فاسق مسلمان کے حکم کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”ونقول ھو مؤمن ناقص الایمان اومؤمن بایمانہ فاسق بکبیرۃ، فلایعطی الاسم المطلق ولایسلب مطلق الاسم“

یعنی ”فاسق مسلمان کے متعلق ہمارا مذہب یہ ہے کہ وہ ناقص الایمان ہوتا ہے یا یہ کہ اپنے ایمان کی بنا پر تو وہ مؤمن ہے البتہ ارتکاب کبیرہ کی بنا پر فاسق ہے“ (چنانچہ نہ تو اسے ایمان مطلق (کامل ایمان) کا نام دیا جائے اور نہ ہی مطلقاً اسم ایمان کی نفی کردی جائے)

فاسق کے متعلق یہ حکم عدل پر مبنی ہے، اور دونوں طرح کہ ادلہ کے درمیان جمع کی بھی یہی بہترین صورت ہے۔

دونوں طرح کے ادلہ سے مراد فاسق سے ایمان کی نفی کرنیوالے ادلہ مثلاً: حدیث: [لایزنی الزانی......] اور فاسق کیلئے ایمان کو ثابت کرنیوالے ادلہ ہیں، مثلاً: آیتِ قصاص اور آیت: ﴿وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوا ......﴾ ہیں۔

فاسق کے متعلق مذکورہ حکم کی بنا پر اسے ایمان مطلق یعنی ایمانِ کامل کا نام بھی نہیں دیا جاسکتا اور اس سے مطلق طور سے ایمان کا نام یعنی ایمان کی نفی بھی نہیں کی جاسکتی جیسا کہ خوارج اور معتزلہ کا مذہب ہے کہ یہ لوگ مطلق طور سے فاسق سے ایمان کی نفی کرکے اسے ایمان سے خارج کردیتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

الواجب نحو أصحاب رسول الله ﷺ وذكر فضائلهم

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق صحیح عقیدہ اوران کے فضائل کا بیان

ومن اصول أهل السنة والجماعة سلامة قلوبهم والسنتهم لأصحاب رسول الله ﷺ كما وصفهم الله به فى قوله تعالىٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (الحشر:۱۰)

وطاعة الرسول ﷺ فى قوله : [لاتسبوا أصحابى ،فوالذى نفسى بيده لو أن أحدكم أنفق مثل أحد ذهبا مابلغ مد أحدهم ولانصيفه]

۞ ۞ ۞

ترجمہ: اھل السنۃ والجماعۃ کے اصول میں یہ بات بھی شامل ہے کہ صحابہ کرام کے متعلق اپنے دلوں اورزبانوں کی حفاظت کی جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس سوچ کے حامل لوگوں کی تعریف فرمائی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (الحشر:۱۰)

ترجمہ:’’اوران کے لئے بھی جوان (مہاجرین) کے بعد آئے اوردعا کرتے ہیں کہ ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے، کہ جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں گناہ معاف فرما اور مؤمنوں کے واسطے ہمارے دلوں میں کینہ(بغض) نہ پیدا ہونے

دے۔اے ہمارے رب! بے شک تو بڑا شفقت کرنے والا اوررحم کرنے والا ہے‘‘

اوررسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا بھی یہی تقاضہ ہے چنانچہ فرمان نبوی ہے:

[لاتسبوا أصحابى ،فوالذى نفسى بيده لو أن أحدكم أنفق مثل أحد ذهبا مابلغ مد أحدهم ولانصيفه]

ترجمہ:[میرے صحابہ کو گالیاں مت دو، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگرتم میں سے کوئی اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کردے تو وہ ان میں سے کسی ایک کے ایک مد یا نصف مد کے خرچ کے برابر ثواب کو بھی نہیں پہنچ سکتا]

عبارت کی تشریح

یعنی اہل السنۃ کے اصول میں یہ بات داخل ہے کہ وہ صحابہ کرام کے متعلق اپنے دل اورزبان کی حفاظت کرتے ہیں ،یعنی دل میں ان کیلئے بغض ،کینہ اور حسد وغیرہ نہیں رکھتے اور زبان سے انہیں لعن طعن اورسب وشتم نہیں کرتے۔کیونکہ ان کی فضیلت مسلم ہے،انہیں اسلام میں سب پر سبقت اوررسول اللہ ﷺ کی صحبت کے شرف کی خصوصیت حاصل ہے اور کیونکہ انہیں اس بات میں پوری امت پر فضیلت حاصل ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے شریعت سیکھ کر بعد میں آنیوالوں تک پہنچائی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر جہاد کیا ہے اور آپ ﷺ کی خوب نصرت وتائید کی ہے۔

اس فصل کے قائم کرنے سے شیخ رحمہ اللہ کی غرض روافض اور خوارج کا رد ہے۔کیونکہ یہ لوگ صحابہ کرام کو گالیاں دیتے ہیں،ان سے بغض رکھتے ہیں اوران کے فضائل ومناقب کا انکار کرتے ہیں نیز یہ بھی غرض ہے کہ اس خبیث مذہب سے اہل السنۃ والجماعۃ کی برأت کا اظہار کیا جائے۔

اہل السنۃ والجماعۃ کا اصحابِ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وہی تعلق ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں کیا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾

ترجمہ:"اوران کے لئے بھی جوان (مہاجرین) کے بعد آئے اوردعا کرتے ہیں کہ ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے، کہ جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں گناہ معاف فرما اور مؤمنوں کے واسطے ہمارے دلوں میں کینہ (بغض) نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بڑا شفقت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے" (الحشر:۱۰)

یعنی مہاجرین وانصار کے بعد قیامت تک آنیوالے مسلمان جوانہیں مہاجر وانصار کے نقشِ قدم چلنے والے ہیں، یہ لوگ اپنے لئے بھی اور جو مسلمان ان سے پہلے گذر چکے ہیں یعنی مہاجرین وانصار وغیرہ ان کیلئے بھی استغفار کرتے ہیں اور یہ دعا کرتے ہیں کہ "اے اللہ ہمارے دلوں میں کسی قسم کا بغض، حسد اور کینہ نہ ڈالنا" اب ان اہل ایمان میں صحابہ کرام تو سب سے پہلے داخل ہیں کیونکہ وہ افضل المؤمنین ہیں اور سیاقِ آیت ہے ہی انہیں کے متعلق۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جو شخص صحابہ کرام کیلئے استغفار نہیں کرتا اور ان کے حق میں اللہ تعالیٰ کی رضوان کا طالب نہیں تو وہ اس آیت میں مذکور اللہ تعالیٰ کے امر کی مخالفت کر رہا ہے، اور اگر اس کے دل میں ان کے متعلق کوئی بغض وکینہ ہے تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس پر شیطان کا حملہ کارگر ہو چکا ہے، اور اللہ کے اولیاء اور امت محمدیہ کے بہترین لوگوں کے ساتھ بغض وعداوت رکھ لے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ایک وافر نصیب اپنے حصے میں لے چکا ہے، اور اس نے اپنے لئے محرومی اور رسوائی کا ایک ایسا باب کھول لیا ہے کہ اگر اس نے اللہ کی طرف رجوع نہ کیا اور اپنے دل کو ان خیر القرون اور اشرف ھذہ الامۃ، طبقہ کے متعلق بغض وکینہ سے پاک کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ سے مدد نہ مانگی تو یہ دروازہ اسے نارِ جہنم تک پہنچا کر چھوڑے گا۔

اور اگر بغض وکینہ سے بڑھکر اس شخص کا معاملہ سب وشتم تک جا پہنچا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ شیطان نے اس پر اپنی لگام ڈال کر اسے اپنا متقاد بنالیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا غیض وغضب اس پر واقع ہو چکا ہے۔

اس داءِ عضال کا شکار وہی شخص ہوتا ہے جس کا واسطہ روافض کے کسی معلم یا خیر ھذہ الامۃ "صحابہ کرام" کے اعداد سے پڑتا ہے کیونکہ شیطان نے انہیں خوب اچھی طرح بازیچہ اطفال بنایا ہے اور چھوٹی باتوں، من گھڑت قصوں اور خرافات کو ان لوگوں کے سامنے مزین کردیا ہے اور انہیں کتاب اللہ سے دور کردیا ہے کہ جسکے سامنے اور پیچھے سے باطل آہی نہیں سکتا۔" (انتھی)

شاہدِ آیت: آیتِ کریمہ میں شاہد یہ ہے کہ اس میں صحابہ کرام کی فضیلت کا بیان ہے کیونکہ وہ ایمان کی طرف سبقت لے جانیوالے ہیں اور اس میں ان سے دوستی ومحبت رکھنے والوں (اھل السنۃ والجماعۃ) کی فضیلت اور ان سے بغض رکھنے والوں کی مذمت کا بیان ہے۔

نیز آیت میں صحابہ کرام کیلئے استغفار کرنے وران کے ساتھ اپنی رضا کے اظہار کی مشروعیت کا بیان ہے۔

نیز آیت میں صحابہ کرام کے متعلق اہل السنۃ کے دلوں اور زبانوں کی سلامتی کا ذکر ہے، چنانچہ "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ "میں زبان کی سلامتی کا ذکر ہے اور "وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" میں دلوں کی سلامتی کا ذکر کا بیان ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ صحابہ کرام سے بغض رکھنے اور انہیں سب وشتم کا نشانہ بنانے کی حرمت پر دلالت کررہی ہے اور اس بات پر بھی دلالت کررہی ہے کہ یہ مسلمانوں کا فعل نہیں ہے۔

صحابہ کرام کے بارہ میں اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ مذہب رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے بھی عین مطابق ہے، چنانچہ فرمانِ نبوی ہے:

[لاتسبوا أصحابی ،فوالذی نفسی بیدہ لو أن أحدکم أنفق مثل أحد ذھبا مابلغ مد أحدھم ولانصیفہ]

ترجمہ:[میرے صحابہ کو گالیاں مت دو، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم میں سے کوئی اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کردے تو وہ ان میں سے کسی ایک کے ایک مد یا نصف مد کے خرچ کے برابر ثواب کو بھی نہیں پہنچ سکتا]

صحابی اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جس نے ایمان کی حالت میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی ہو اور ایمان ہی کی حالت میں وفات پائی ہو۔

حدیث میں قسم مابعد کی تاکید کیلئے ہے۔ ''اُحد'' مدینہ میں ایک مشہور پہاڑ کا نام ہے، وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ پہاڑ دیگر پہاڑوں سے بالکل الگ تھلگ ہے۔

حدیث کا اجمالی معنی یہ ہے کہ غیر صحابی کا اللہ کی راہ میں کثیر مال انفاق، کسی صحابی کے قلیل مال کے انفاق کے برابر نہیں ہوسکتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں انفاق کے وقت جو صحابہ کا ایمان تھا، جب کہ اس وقت مسلمان انتہائی قلیل تھے اور اسلام سے برگشتہ کرنے کے اسباب بہت زیادہ اور دواعی اسلام انتہائی ضعیف تھے، ایسا ایمان بعد میں آنیوالوں کیلئے حاصل ہونا ناممکن ہے۔

شاھدِ حدیث: حدیث سے شاہد یہ ہے کہ اس میں صحابہ کو سب وشتم کرنے کی حرمت بیان ہے اور یہ کہ صحابہ کو غیر صحابی پر فضیلت حاصل ہے اور یہ کہ عمل کرنیوالے کی نیت اور عمل کے وقت کے اعتبار سے عمل میں تفاضل ہوتا ہے۔

نیز اس حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہو رہی ہے کہ جو شخص صحابہ سے محبت کرتا ہے اور ان کی تعریف کرتا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کر رہا ہے اور جو شخص ان پر سب وشتم کرتا ہے اور ان سے بغض رکھتا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کر رہا ہے۔

فضل الصحابة
وموقف أهل السنة والجماعة منه وبيان تفاضلهم

صحابہ کرام کی فضیلت اور ان کے متعلق
اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف اور صحابہ کے باہم تفاضل کا بیان

ويقبلون ماجاء به الكتاب والسنة والإجماع من فضائلهم ومراتبهم. ويفضلون من أنفق من قبل الفتح (وهو صلح الحديبية) وقاتل على من أنفق من بعد وقاتل. ويفضلون المهاجرين على الأنصار. ويؤمنون بأن الله قال لأهل بدر وكانوا ثلا ثمائة وبضعة عشر: [اعملوا ماشئتم فقد غفرت لكم] وبأنه لايدخل النار أحد بايع تحت الشجرة كماأخبر به النبي ﷺ. بل لقد رضي الله عنهم ورضوا عنه. وكانوا أكثر من ألف وأربعمائة، ويشهدون بالجنة لمن شهد له رسول الله ﷺ كالعشرة، وثابت بن قيس بن شماس وغيرهم من الصحابة. ويُقرّون بما تواتر به النقل عن أمير المؤمنين علي بن أبي طالب رضي الله عنه وغيره ؛من أن خير هذه الأمة بعد نبيها أبوبكر ثم عمر ويثلثون بعثمان ويربعون بعلي رضي الله عنهم. كما دلت عليه الآثار وكما أجمع الصحابة على تقديم عثمان في البيعة، مع أن بعض أهل السنة كانوا قد اختلفوا في عثمان وعلي رضي الله عنهما بعد اتفاقهم على تقديم أبي بكر وعمر أيهما أفضل فقدم قوم عثمان وسكتوا وربعوا بعلي. وقدم قوم عليا. وقوم توقفوا. لكن استقر أمر أهل السنة على تقديم عثمان ثم علي.

ترجمہ: اہل السنۃ والجماعۃ، کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت شدہ فضائلِ صحابہ اور ان کے مراتب کو قبول کرتے ہیں، اور صلح حدیبیہ سے قبل خرچ کرنیوالوں اور قتال کرنیوالوں کو صلح حدیبیہ کے بعد خرچ کرنیوالوں اور قتال کرنیوالوں پر فضلیت وفوقیت دیتے ہیں، نیز مہاجرین صحابہ کو انصار صحابہ پر فضلیت وفوقیت دیتے ہیں۔

اہل السنۃ والجماعۃ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اہل بدر۔ جو کہ تین سو اور دس سے کچھ اوپر تھے۔ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:[اعملوا ماشئتم فقد غفرت لکم]

ترجمہ:[تم جو چاہو عمل کرو، میں نے تم سب کو معاف کر دیا ہے] (بخاری)

اور یہ کہ بیت رضوان میں شریک صحابہ جو ۱۴۰۰ سو سے زائد تھے میں سے کوئی بھی جہنم میں نہ جائے گا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے متعلق یہ بشارت دی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ ان سے اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو چکے ہیں۔

اہل السنۃ والجماعۃ ان صحابہ کے جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں جن کا نام لیکر رسول اللہ ﷺ نے جنتی ہونے کی شہادت دی، جیسا کہ عشرہ مبشرہ اور ثابت بن قیس وغیرہ ہیں۔

اہل السنۃ والجماعۃ علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے تواتر کے ساتھ ثابت اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اس اُمت میں نبی ﷺ کے بعد سب سے افضل شخص ابو بکر رضی اللہ عنہ ہے، پھر عمر رضی اللہ عنہ۔ اور (اہل السنۃ والجماعۃ) تیسرے نمبر پر عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کو افضل قرار دیتے ہیں اور ان کے بعد (چوتھے نمبر پر) علی رضی اللہ عنہ کے افضل ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ آثارِ صحابہ اسی بات پر دلالت کرتے ہیں۔ نیز بیعتِ خلافت میں صحابہ کرام نے بالاجماع عثمان رضی اللہ عنہ کو علی رضی اللہ عنہ پر مقدم کیا تھا۔ البتہ بعض اہل السنۃ کا عثمان اور علی رضی اللہ عنہما میں اختلاف ہے کہ ان میں سے کون افضل ہے، بعض نے عثمان رضی اللہ عنہ کو علی رضی اللہ عنہ پر مقدم کیا اور چوتھے نمبر پر علی رضی اللہ عنہ

کو قرار دیا ہے اور بعض نے علی رضی اللہ عنہ کو مقدم کیا ہے اور بعض نے اس مسئلہ میں توقف اختیار کیا ہے لیکن مجموعی طور پر اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف تقدیم عثمان رضی اللہ عنہ پر استقرار پا چکا ہے۔

عبارت کی تشریح

......شرح......

صحابہ کرام کی فضیلت بیان کرنے کے بعد شیخ رحمہ اللہ تفاضلِ صحابہ (بعض کا بعض سے افضل ہونا) بیان کر رہے ہیں اور اس مسئلہ میں اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں: ''اہل السنۃ کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت شدہ صحابہ کرام کے تفاضل ومراتب قبول کرتے ہیں''

اجماع سے، اجماع المسلمین مراد ہے، شیخ رحمہ اللہ نے صحابہ کرام کے فضائل اور مراتب کے اثبات کیلئے ان تین مصادر (کتاب، سنت، اجماع) کا ذکر کیا ہے کیونکہ فضائل صحابہ کے اثبات کیلئے یہی مصادر ہی کافی ہیں مزید کسی مصدر کی ضرورت نہیں۔

صحابہ، فضیلت میں ایک درجہ پر فائز نہیں ہیں، بلکہ اسلام کی طرف سبقت لے جانے، جہاد کرنے اور ہجرت کے اعتبار سے ان میں تفاضل ہے۔ نبی ﷺ اور دین کی خدمت کے اعتبار سے بھی ان میں تفاضل موجود ہے۔

چنانچہ شیخ رحمہ اللہ اس تفاضل کی طرف نشاندھی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ویفضلون من انفق من قبل الفتح وھو صلح الحدیبیة''

یعنی ''اہل السنۃ فتح یعنی صلح حدیبیہ سے پہلے خرچ کرنیوالوں کو فتح کے بعد خرچ کرنیوالوں پر فضیلت دیتے ہیں''

شیخ رحمہ اللہ نے ''فتح'' سے مراد صلح حدیبیہ لیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو فتح قرار دیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ﴾ (فتح:۱)

ترجمہ ''ہم نے آپ کو فتح مبین عطا فرمائی ہے''

اور اہل علم میں یہی بات مشہور ہے کہ اس آیت میں فتح مبین سے مراد صلح حدیبیہ ہے، کیونکہ سورۃ الفتح صلح حدیبیہ کے فوراً بعد نازل ہوئی ہے۔

''حدیبیہ'' مکہ کے قریب ایک کنواں ہے، یہیں پر ایک درخت کے نیچے بیعت الرضوان کا واقعہ پیش آیا تھا، جب مشرکین مکہ نے آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو دخولِ مکہ سے روک دیا تھا تو صحابہ نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی تھی، اس بیعت کو فتح سے تعبیر اس لئے کیا گیا ہے کہ اس بیعت کے سبب سے مسلمانوں کو خیر اور نصرت حاصل ہوئی۔

صلح حدیبیہ سے قبل خرچ کرنیوالوں کی فضیلت کی دلیل یہ آیتِ کریمہ ہے:

﴿ لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَّنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا ﴾ (الحدید:۱۰)

ترجمہ: ''تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے فی سبیل اللہ خرچ کیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں، بلکہ ان سے بہت بڑے درجے کے ہیں جنھوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیے''

یہ مہاجرین وانصار صحابہ تھے انہیں ''السابقون الاولون'' کہا جاتا ہے (یعنی اسلام کی طرف سبقت لیجانے والے) انہیں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ﴾ (التوبۃ:۱۰۰)

ترجمہ: ''اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے''

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ویقدمون المهاجرين على الانصار'' یعنی ''اہل السنۃ

مہاجرین صحابہ کو انصار صحابہ پر فضیلت میں مقدم رکھتے ہیں''

''المهاجرون'' ''مهاجر'' کی جمع ہے ان سے مراد وہ صحابہ ہیں جنھوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔

ہجرت کا لغوی معنیٰ ''ترک'' (چھوڑنا) ہے جبکہ شرعی اصطلاح میں اس کا معنیٰ ''بلادِ کفر وشرک سے بلادِ اسلام کی طرف منتقل ہوجانا'' ہے۔

''الانصار'' وہ صحابہ جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خوب مدد کی، یہ قبیلہ اوس وخزرج سے تعلق رکھتے تھے، ان کا یہ نام خود رسول اللہ ﷺ نے رکھا۔

مہاجرین صحابہ کی انصار صحابہ پر افضلیت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں مہاجرین کا انصار سے پہلے ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ﴾ (التوبۃ:۱۰۰)

ترجمہ: ''اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے''

نیز فرمایا: ﴿ لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ ﴾ (التوبۃ:۱۱۷)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے حال پر توجہ فرمائی اور مہاجرین اور انصار کے حال پر بھی جنھوں نے تنگی کے وقت پیغمبر کا ساتھ دیا''

نیز فرمایا: ﴿ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ ﴾ (الحشر:۸،۹)

ترجمہ:''(فی کا مال) ان مہاجر مسکینوں کیلئے ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے نکال دیئے گئے ہیں وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضا مندی کے طلب گار ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی راست باز ہیں۔اور (ان کیلئے) جنہوں نے اس گھر میں (یعنی مدینہ) اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنالی ہے اور اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں''

مذکورہ آیاتِ کریمہ مہاجرین وانصار صحابہ کی فضیلت پر دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ، مہاجرین کی انصار پر افضلیت پر بھی دلالت کر رہی ہیں کیونکہ؛ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر انصار سے پہلے کیا ہے،ان کی افضلیت کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بلاد، اموال اور اولاد کو محض اللہ سے اجر وثواب حاصل کرنے کیلئے اور اللہ اور اس کے رسول کی نصرت کیلئے ترک کیا، اور یقیناً یہ لوگ اپنے اس عمل میں مخلص اور صادق تھے۔

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''ویؤمنون بأن اللہ قال لأھل بدر و کانوا ثلاثمائة......''

یعنی:''اہل السنۃ والجماعۃ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اہل بدر۔ جو کہ تین سو اور دس سے کچھ اوپر تھے۔کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:[اعملوا ماشئتم فقد غفرت لکم]

ترجمہ:[تم جو چاہو عمل کرو، میں نے سب کو معاف کر دیا ہے] (بخاری) ''

یہ بات صحیحین میں حاطب ابن ابی بلتعہ کے قصہ کے ضمن میں مذکور ہے۔

''بدر'' ایک مشہور بستی ہے جو کہ مدینہ منورہ سے تقریباً چار مراحل پر واقع ہے یہیں پر جنگِ بدر ہوئی تھی جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی ہے،اس واقعہ کو''یوم بدر'' اور''یوم الفرقان'' کہا جاتا ہے۔

''ثلاثة وبضعة عشر '' کا معنی ہے تین سو دس سے کچھ اوپر،''بضعة '' کا اطلاق تین سے لیکر نو تک ہوتا ہے،اہل بدر کی تعداد کے متعلق صحیح بخاری میں یہی الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ اس حدیث کے متعلق اپنی کتاب ''الفوائد'' میں فرماتے ہیں۔

''اس حدیث کے معنی نے بہت سے لوگوں کو اشکال میں ڈال دیا ہے، چنانچہ اس حدیث کے معنی کے متعلق اقوال کے ذکر کے بعد ابن القیم فرماتے ہیں:''اس معاملہ میں ہماری رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ خطاب ایک ایسی قوم سے ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ یہ دین پر قائم رہیں گے اور اسلام پر ہی ان کا خاتمہ ہوگا اور یہ کہ عام لوگوں کی طرح اگر ان سے گناہ سرزد ہوئے تو اللہ تعالیٰ انہیں گناہ پر مصر نہیں رہنے دے گا بلکہ انہیں استغفار اور توبۃ النصوح کی توفیق دے گا اور ایسے اعمال صالحہ کی توفیق دے گا جو ان گناہوں کا کفارہ بن جائیں گے اور یہ صرف انہی کی خصوصیت ہے کیونکہ ان کے متعلق یہ بات محقق ہے اور یہ بخشے ہوئے ہیں۔''

اس حدیث سے مغفرت کے دیگر اسباب کے حصوں کی ممانعت نہیں ہو رہی ہے، جس طرح کہ اس حدیث کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ یہ لوگ مغفرت پر اعتماد کرتے ہوئے فرائض کو چھوڑ دیں، کیونکہ اگر اوامر کے بجالائے بغیر انہیں مغفرت حاصل ہوتی تو اس اعلان کے بعد یہ لوگ نماز، حج، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ کے بجالانے کے محتاج نہ ہوتے ''

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:'' وبأنه لایدخل النار أحد بایع تحت الشجرة کما اخبر النبی ﷺ بل قد رضی اللہ عنهم ورضوا عنه و کانوا أکثر من ألف وأربعمائة''

''اور یہ کہ بیعت رضوان میں شریک صحابہ جو ۱۴۰۰ سو سے زائد تھے میں سے کوئی بھی جہنم میں نہ جائے گا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے متعلق یہ بشارت دی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ ان سے اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو چکے ہیں۔''

شیخ رحمہ اللہ اپنے اس کلام میں بیعت الرضوان میں شریک صحابہ کی شان بیان کرنا چاہتے ہیں۔

بیعتِ رضوان کا واقعہ حدیبیہ کے مقام پر ہوا تھا، جہاں پر مشرکین نے رسول اللہ اور آپ کے

صحابہ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا، جیسا کہ پیچھے گذر چکا ہے۔

شیخ رحمہ اللہ نے اپنے اس کلام میں اہل بیعتِ رضوان کی دو فضیلتیں بیان فرمائی ہیں:

الاولیٰ: پہلی فضیلت یہ کہ ان میں سے کوئی بھی جہنم میں داخل نہیں ہوگا، اس کی دلیل صحیح مسلم میں جابر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ:

[ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لایدخل النار احد بایع تحت الشجرة]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: [درخت کے نیچے بیعت کرنیوالوں میں سے کوئی ایک بھی جہنم میں داخل نہیں ہوگا]

الثانیۃ: دوسری فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو چکا ہے، یہ بات تو قرآن میں صراحتاً مذکور ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ﴾ (الفتح:۱۸)

ترجمہ: ”یقیناً اللہ تعالیٰ مؤمنوں سے خوش ہو گیا جبکہ وہ درخت کے تلے تجھ سے بیعت کر رہے تھے“

شیخ رحمہ اللہ نے بیعتِ رضوان میں شریک صحابہ کی تعداد بالیقین ذکر کرنے کی بجائے ”أكثر من ألف وأربعمائة“ (چودہ سو) سے زائد کے الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے؛ کیونکہ ان کی تعداد کے متعلق یہی بات ہی صحیح ہے (یعنی ان کی تعداد کا تعین صحت کیساتھ ثابت نہیں)

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”ویشهدون بالجنة لمن شهد له رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم كالعشرة وثابت بن قيس بن شماس وغيرهم من الصحابة“

”اہل السنۃ والجماعۃ ان صحابہ کے جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں جن کا نام لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی ہونے کی شہادت دی، جیسا کہ عشرہ مبشرہ اور ثابت بن قیس وغیرہ ہیں۔“

یعنی اہل السنۃ ان صحابہ کے متعلق جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں جن کے متعلق رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شہادت دی ہے، البتہ جن لوگوں کے متعلق رسول اللہ نے یہ شہادت نہیں دی اہل السنۃ بھی ان کے متعلق یہ شہادت نہیں دیتے، کیونکہ ایسی صورت میں یہ شہادت دینا اللہ تعالیٰ پر بلا دلیل بات کہنا ہے۔ (جو کہ حرام ہے)

لیکن اہل السنۃ والجماعۃ نیک لوگوں کیلئے جنت کی امید رکھتے ہیں اور گناہگاروں کیلئے جنت سے محرومی کا خوف رکھتے ہیں اور یہ بات اصولِ عقیدہ سے متعلق ہے۔

”عشرۃ مبشرۃ“، یعنی ”دس صحابہ جن کا نام لیکر جنت کی بشارت دی گئی“ یہ ہیں:

ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد، سعید، عبدالرحمٰن بن عوف اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم

ان صحابہ کے جنتی ہونے کی بشارت احادیث سے ثابت ہے۔

ثابت بن قیس بن شماس، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطیب تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے جنتی ہونے کی بشارت صحیح بخاری میں ثابت ہے۔

ان صحابہ کے علاوہ بھی بعض صحابہ کے جنتی ہونے کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، جیسے عکاشہ بن محصن اور عبداللہ بن سلام وغیرہ۔

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”ويقرون بماتواتر به النقل عن امير المؤمنين علی بن ابی طالب ان خير هذه الامة بعد نبيها ابوبكر ثم عمر، ويثلثون بعثمان“

اہل السنۃ والجماعۃ علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے تواتر کے ساتھ ثابت اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اس اُمت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل شخص ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے، پھر عمر رضی اللہ عنہ۔ اور (اہل السنۃ والجماعۃ) تیسرے نمبر پر عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کو افضل قرار دیتے ہیں اور ان کے بعد (چوتھے نمبر پر) علی رضی اللہ عنہ کے افضل ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

”تواتر“ سند کا قوی ترین درجہ ہے۔ علی رضی اللہ عنہ سے مروی اس متواتر روایت میں روافض کا رد ہے، جو علی رضی اللہ عنہ کو ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتے ہیں اور خلافت میں بھی ان کی ابوبکر وعمر پر

تقدیم کے قائل ہیں، جبکہ شیخین (ابوبکر وعمر رضی اللہ عنھما) کی خلافت میں طعن کرتے ہیں، یہ بحث دو مسئلوں کو متضمن ہے، "مسئلہ خلافت" اور "مسئلہ تفضیل"

مسئلہ خلافت: اس مسئلہ میں اہل السنۃ بشمول صحابہ رضی اللہ عنھم کا موقف یہ ہے کہ: رسول اللہ ﷺ کے بعد خلیفہ ابوبکر ہیں پھر عمر، پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنھم۔

مسئلہ تفضیل: (ابوبکر، عمر، عثمان اور علی میں سے کس کو کس پر فضیلت حاصل ہے) اس مسئلہ میں اہل السنۃ کا اجماع ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ان سب سے افضل ابوبکر ہیں پھر عمر رضی اللہ عنھما۔

البتہ عثمان اور علی رضی اللہ عنھما کے معاملے میں اختلاف ہے کہ ان میں سے کون افضل ہے شیخ رحمہ نے اس مسئلہ میں تین اقوال ذکر کیئے ہیں اور یہ تینوں اقوال اس اختلافی مسئلہ میں حاصل اختلاف ہیں۔

(۱) عثمان ؓ کی علی ؓ پر فضیلت۔

(۲) علی ؓ کی عثمان ؓ پر فضیلت۔

(۳) توقف، یعنی ان دونوں میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دینے میں سکوت اختیار کیا جائے۔

شیخ رحمہ اللہ نے بعض وجوہ کی بنا پر پہلے قول "عثمان ؓ کی علی ؓ پر فضیلت۔" کی ترجیح کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہ وجوہ یہ ہیں:

(۱) عثمان ؓ کی فضیلت کے متعلق جو آثار مروی ہیں وہی اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔

(۲) صحابہ کرام ؓ کا بیعت کے معاملے میں عثمان ؓ کو علی ؓ پر مقدم کرنے پر اجماع۔

یقیناً صحابہ ؓ کا یہ اجماع ان کی افضلیت ہی کی بنا پر ہے، چنانچہ ان چاروں (ابوبکر، عمر، عثمان اور علی ؓ) کی فضیلت میں ترتیب وہی ہے جو خلافت میں ترتیب ہے۔

(۳) مجموعی طور پر اہل السنۃ کا اس بات کا قائل ہونا کہ عثمان ؓ کو علی ؓ پر تقدیم حاصل ہے

البتہ چوتھے نمبر پر علی ؓ ہیں جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے کہ صحابہ نے بالاجماع عثمان ؓ کو علی ؓ پر خلافت میں مقدم کیا ہے۔

عبدالرحمٰن بن عوف ؓ نے علی ؓ سے فرمایا: میں نے لوگوں کا جائزہ لیا ہے وہ عثمان ؓ کے برابر کسی کو درجہ نہیں دیتے۔

ابوایوب ؓ کا قول ہے: "جو عثمان ؓ کو علی ؓ پر مقدم نہیں سمجھتا یقیناً وہ مہاجرین وانصار صحابہ پر عیب جوئی کرتا ہے۔"

صحابہ کرام کا بیعتِ خلافت میں عثمان ؓ کو علی ؓ پر مقدم کرنا، عثمان ؓ کی افضلیت کی دلیل ہے کیونکہ انہوں نے عثمان ؓ کو مشاورت اور مکمل اختیار سے ہی خلافت میں علی ؓ پر مقدم کیا تھا، پھر خود علی ؓ بھی بیعتِ خلافت کرنیوالوں میں شامل تھے، بلکہ عثمان ؓ کی خلافت میں حدود نافذ کیا کرتے تھے۔

❁ ❁ ❁

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں ہم لوگ نبی ﷺ کے سامنے کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابوبکر ؓ اور پھر عمر ؓ ہیں۔

حکم تقديم علی ؓ

على غيره من الخلفاء الأربعة فی الخلافة

مسئلہ خلافت میں علی ؓ کی دیگر خلفاءِ راشدین پر تقدیم کا حکم

وان كانت هذه المسألة (مسألة عثمان وعلى) ليست من الأصول التي يضلل المخالف فيها عند جمهورا أهل السنة لكن التي يضلل فيها مسألة الخلافة. وذلك لأنهم يؤمنون أن الخليفة بعد رسول الله ﷺ أبوبكر ثم عمر ثم عثمان ثم علي. ومن طعن في خلافة أحد من هؤلاء فهو أضل من حمار أهله.

۞ ۞ ۞

ترجمہ: عثمان ؓ کی علی ؓ پر افضلیت جمہور اہل السنۃ کے ہاں کوئی ایسا اصولی مسئلہ نہیں ہے کہ اس مسئلہ میں مخالفین کو گمراہ قرار دیا جائے، البتہ مسئلہ خلافت، ایسا اصولی مسئلہ ہے کہ اس میں مخالفین کو گمراہ قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل السنۃ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلیفہ ابوبکر الصدیق ہیں پھر عمر پھر عثمان اور پھر علی ؓ۔ جو شخص ان چاروں میں سے کسی ایک کی خلافت میں طعنہ زنی کرتا ہے تو وہ اپنے گھریلو گدھے سے بھی بڑھ کر جاہل ہے۔

عبارت کی تشریح

شرح

شیخ رحمہ اللہ نے ان دو مسئلوں یعنی علی ؓ کو عثمان ؓ پر افضلیت دینے اور علی ؓ کو مسئلہ خلافت میں دیگر خلفاء پر مقدم سمجھنے میں موازنہ کیا ہے کہ اس تقدیم وافضلیت پر کیا گناہ مرتب ہوتے ہیں۔

چنانچہ شیخ رحمہ اللہ نے واضح کیا ہے کہ علی ؓ کو عثمان ؓ پر افضلیت دینے والے کی تضلیل درست نہیں کیونکہ اہل السنۃ میں یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے اگرچہ راجح بات عثمان ؓ کی افضلیت ہے۔

لیکن مسئلہ خلافت میں مخالفین کی تضلیل جائز ہے، یعنی جو لوگ مسئلہ خلافت میں اہل السنۃ کی مخالفت کرتے ہیں اور ان کی یہ رائے ہے کہ علی ؓ خلافت میں ابوبکر، عمر اور عثمان ؓ پر مقدم ہیں یا یہ کہ علی ؓ کو ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر افضلیت ہے کے گمراہ ہونے کا حکم لگایا جاسکتا ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلیفہ ابوبکر ؓ ہیں کیونکہ انہیں پوری امت پر افضلیت حاصل ہے، سبقت الی الاسلام کا شرف حاصل ہے، آپ ﷺ نے امامت کیلئے انہیں جمیع صحابہ پر مقدم فرمایا ہے اور ان کی بیعتِ خلافت پر صحابہ کا اجماع ہے۔

ابوبکر ؓ کے بعد خلیفہ عمر ؓ ہیں کیونکہ انہیں باقی صحابہ پر افضلیت حاصل ہے، سبقت الی الاسلام کا شرف حاصل ہے، ابوبکر ؓ نے انہیں اپنا ولی عہد مقرر فرمایا تھا اور امت نے ابوبکر ؓ کے بعد ان کی خلافت پر اتفاق کیا۔

عمر ؓ کے بعد خلیفہ عثمان ؓ ہیں، کیونکہ مجلسِ شوریٰ نے خلافت کیلئے انہیں مقدم کیا تھا، اور امت نے ان کی خلافت پر اتفاق کیا ہے، عثمان ؓ کے بعد خلیفہ علی ؓ ہیں، کیونکہ انہیں باقی لوگوں پر افضلیت حاصل ہے اور ان کے معاصرین نے ان کی خلافت پر اجماع کیا ہے اور یہی وہ خلفاء اربعہ ہیں جن کی طرف عرباض بن ساریہ کی درج ذیل حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے:

[عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدی]

ترجمہ: [تم پر میری سنت اور میرے بعد آنیوالے میرے خلفاء راشدین المھدیین کی سنت کو لازم پکڑ لینا]

شیخ رحمہ اللہ نے مذکورہ خلفاء اربعہ کی خلافت پر طعن کرنیوالوں کی مذمت کرتے ہوئے انہیں اپنے گھریلوں گدھے سے بھی بڑھکر گمراہ قرار دیا ہے، کیونکہ یہ لوگ بلا حجت وبرہان نص اور اجماع کی مخالفت کرتے ہیں، یہ روافض ہیں جن کا گمان ہے کہ نبی ﷺ کے بعد خلافت علی ؓ کیلئے ہے۔

علی ؓ کی دیگر تینوں خلفاء پر تقدیم کے حکم کا ماحصل یہ ہے۔

(۱) جو انہیں خلافت میں مقدم سمجھتا ہے وہ بالاتفاق گمراہ ہے۔

(۲) جو انہیں ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت میں مقدم سمجھتا ہے وہ بھی بالاتفاق گمراہ ہے۔

البتہ جو انہیں عثمان ؓ پر فضیلت میں مقدم سمجھتا ہے اسے گمراہ قرار نہیں دیا جا سکتا اگرچہ یہ بات راجح قول کے خلاف ہے۔

مكانة اهل بيت النبى ﷺ عند اهل السنة والجماعة

اہل السنۃ والجماعۃ کے ہاں اہلِ بیت کا مقام ومرتبہ

ويحبون اهل بيت رسول الله ويتولّونهم ويحفظون فيهم وصية رسول الله ﷺ حيث قال يوم غدير خم: [أذكركم الله فى أهل بيتى] وقال أيضا للعباس عمه، وقد اشتكى إليه أن بعض قريش يجفو بنى هاشم فقال: [والذى نفسى بيده لايؤمنون حتى يحبوكم لله ولقرابتى] وقال[ان الله اصطفى بنى اسماعيل واصطفى من بنى اسماعيل كنانة واصطفى من كنانة قريشا واصطفى من قريش بنى هاشم واصطفانى من بنى هاشم]

ترجمہ: اہل السنۃ رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت سے محبت کرتے ہیں اور ان سے دوستی قائم کرتے ہیں غدیر خم کے دن ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل وصیت کی حفاظت کرتے ہیں: [اذكركم الله فى اهل بيتى](یعنی: میں تمہیں اپنے اہل بیت کے متعلق اللہ تعالیٰ کے خوف کی یاد دلاتا ہوں) (مسلم)

عباس ؓ نے آپ ﷺ سے شکایت کی کہ بعض قریشی بنی ھاشم کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:[والذى نفسى بيده لايؤمنون حتى يحبوكم لله ولقرابتى](یعنی: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے حتی کہ اللہ کی خاطر اور میری قرابت کی خاطر تم سے محبت نہ کریں)

(احمد وغیرہ)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:[ان الله اصطفى بنى اسماعيل واصطفى من بنى

اسماعیل کنانة واصطفی من کنانة قریشا واصطفی من قریش بنی ہاشم واصطفانی من بنی ہاشم] (یعنی: اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کو دیگر قوموں میں سے چن لیا اور بنی اسماعیل سے کنانہ کو چن لیا اور کنانہ سے قریش کو چن لیا اور قریش سے بنی ہاشم کو چن لیا اور بنی ھاشم سے مجھے چن لیا) (احمد و مسلم)

عبارت کی تشریح

شرح......

شیخ رحمہ اللہ اپنی اس کلام میں اہل السنۃ کے ہاں اہل بیت کے مقام ومرتبہ کو بیان فرمارہے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں: "یحبون أهل بیت رسول اللہ ویتولونهم " یعنی "اہل السنۃ رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت سے محبت رکھتے ہیں اور ان سے دوستی قائم کرتے ہیں"

"اہل بیت" سے مراد آپ ﷺ کی آل ہے جن پر صدقہ حرام ہے اور وہ یہ ہیں آل علی، آل جعفر، آل عقیل، آل عباس، اولادِ حارث بن عبدالمطلب۔

آپ ﷺ کی ازواج (بیویاں) اور بنات بھی آپ ﷺ کے اہل بیت میں سے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ (الاحزاب:۳۳)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ اے نبی کی گھر والیو! تم سے وہ (ہر قسم کی) گندگی کو دور کردے اور تمہیں خوب پاک کردے"

اہل السنۃ، اہل بیت سے محبت، ان کا احترام اور ان کی تکریم کرتے ہیں؛ کیونکہ یہ چیزیں بھی آپ ﷺ کے احترام وتکریم میں شامل ہے اور اس لئے بھی کہ اللہ اور اس کے رسول نے اس بات کا حکم دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ﴾

ترجمہ: "آپ کہہ دیجئے! میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی"

(الشوریٰ:۲۳)

اس سلسلہ میں متعدد نصوص وارد ہیں، بعض نصوص شیخ رحمہ اللہ نے ذکر کی ہیں۔

اہل بیت کا یہ مقام ومرتبہ اس صورت میں ہے کہ اگر وہ سنت کے پیروکار اور دین پر مستقیم ہوں جیسا کہ اہل بیت کے سلف ہیں مثلاً: عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد اور علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد۔ البتہ جو لوگ سنت کی مخالفت کرتے ہیں اور دین پر مستقیم نہیں ہیں ان سے محبت جائز نہیں ہے اگرچہ ان کا تعلق اہل بیت سے ہی ہو۔

"ویتولونهم" یہ "ولایة" (بفتح الواو) سے ماخوذ ہے، جس کا معنی محبت ہے، یعنی اہل السنۃ اہل بیت سے محبت کرتے ہیں۔

"ویحفظون فیهم وصیة رسول اللہ ﷺ حیث قال یوم غدیر خم: [اذکرکم اللہ فی اهل بیتی] (مسلم)"

یعنی "غدیر خم کے دن ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل وصیت کی حفاظت کرتے ہیں: [اذکرکم اللہ فی اهل بیتی](یعنی: میں تمہیں اپنے اہل بیت کے متعلق اللہ تعالیٰ کے خوف کی یاد دلاتا ہوں) (مسلم)

"غدیر" سے مراد پانی کا بڑا تالاب ہے۔ "خم" ایک جگہ کا نام ہے جو ایک قول کے مطابق اس شخص کا نام تھا جس کی طرف وہ تالاب منسوب تھا، جبکہ ایک اور روایت کے مطابق "خم" سے مراد لپٹا ہوا درخت ہے، جس کی طرف وہ تالاب منسوب تھا، یہ مدینہ کے راستے میں واقع ہے، نبی ﷺ نے حجۃ الوداع سے لوٹتے ہوئے وہاں خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس خطبہ میں وہ الفاظ بھی مذکور تھے جن کا شیخ رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے، یعنی: [اذکرکم اللہ فی اهل بیتی] جس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے اہل بیت کے احترام، اکرام اور ان کے حقوق کی ادائیگی کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کا امر یاد دلاتا ہوں

"وقال ایضا للعباس عمه، وقد اشتكى إليه أن بعض قريش يجفو بني هاشم فقال: [والذى نفسي بيده لايؤمنون حتى يحبوكم لله ولقرابتي]"

عباس رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے شکایت کی کہ بعض قریشی بنی ھاشم کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

ترجمہ:[قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے حتی کہ اللہ کی خاطر اور میری قرابت کی خاطر تم سے محبت نہ کریں]

عباس رضی اللہ عنہ کا نام ونسب یہ ہے: عباس بن عبدالمطلب بن ھاشم بن عبدمناف۔

"الجفاء" حسن سلوک اور صلہ رحمی کے ترک کو کہتے ہیں۔ یہاں مطلق ایمان کی نفی نہیں بلکہ ایمان کامل جس کا اختیار کرنا واجب ہے، کی نفی ہے۔

اس حدیث میں آپ ﷺ نے اپنے اہل بیت سے محبت کیلئے دو امور ذکر فرمائے:

(۱) اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کیلئے، کیونکہ اہل بیت اللہ تعالیٰ کے اولیاء میں سے ہیں۔

(۲) کیونکہ اہل بیت، رسول اللہ ﷺ کے قرابت والے ہیں، اور ان سے محبت میں آپ ﷺ کو راضی کرنا اور اکرام کرنا ہے۔

بنی ھاشم کی فضیلت کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:[ان اللہ اصطفى بنى اسماعيل واصطفى من بنى اسماعيل كنانة واصطفى من كنانة قريشا واصطفى من قريش بنى هاشم واصطفانى من بنى هاشم] (احمد ومسلم)

ترجمہ:[اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کو دیگر قوموں میں سے چن لیا اور بنی اسماعیل سے کنانۃ کو چن لیا اور کنانۃ سے قریش کو چن لیا اور قریش سے بنی ھاشم کو چن لیا اور بنی ھاشم سے مجھے چن لیا]

اسماعیل علیہ السلام ابراھیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں، "کنانۃ" ایک قبیلہ کا نام ہے اس قبیلہ کے جدِ امجد کنانۃ بن خزیمۃ ہیں "قریش" مضر بن کنانۃ کی اولاد ہیں "ھاشم" عبدمناف کے بیٹے ہیں۔

آپ ﷺ کا نام ونسب یہ ہے: محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ھاشم عبدمناف بن قصی بن کنانۃ بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فھر بن مالک بن النضر بن کنانۃ بن خزیمۃ بن مدرکۃ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

شاہد حدیث: یہ حدیث فضیلتِ عرب پر دلالت کرتی ہے اور یہ کہ قریش افضل العرب ہیں اور بنی ھاشم قریش میں سے افضل ہیں اور رسول اللہ ﷺ بنو ہاشم میں سب سے افضل ہیں، اس طرح آپ ﷺ باعتبارِ ذات ونسب تمام مخلوقات سے افضل ہوئے۔ اس حدیث میں بنی ھاشم کی بھی فضیلت ۔ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ کے قرابت والے ہیں۔

مكانة ازواج النبى ﷺ عند اهل السنة والجماعة

اہل السنۃ والجماعۃ کے ہاں ازواج مطہرات کا مقام ومرتبہ

ويتولون ازواج النبى ﷺ امهات المؤمنين . ويؤمنون بانهن ازواجه فى الاخرة، خصوصا خديجة رضى الله عنهاأم أكثر أولاده وأول من آمن به وعاضده على أمره وكان لها منه المنزلة العالية .والصديقة بنت الصديق رضى الله عنها التى قال فيها النبى ﷺ [فضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام]

۞ ۞ ۞

ترجمہ: اہل السنۃ والجماعۃ رسول اللہ ﷺ کی ازاج مطہرات امہات المؤمنین سے محبت رکھتے ہیں اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ سب آخرت میں بھی آپ ﷺ کی بیویاں ہوں گی خصوصاً خدیجہ رضی اللہ عنہا جو کہ آپ ﷺ کی اکثر اولاد کی والدہ ہیں اور سب سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان لائیں اور اسلام کے معاملے میں آپ ﷺ کی مدد کی آپ ﷺ کے نزدیک یہ بلند مرتبہ پر فائز تھیں۔ صدیقہ بنت صدیق (عائشہ بنت ابی بکر) رضی اللہ عنہا جن کے بارے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ”عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیگر عورتوں پر اس طرح فضیلت ہے جس طرح ثرید کو دوسرے کھانوں پر۔“

عبارت کی تشریح

شرح......

شیخ رحمہ اللہ نے اس کلام میں رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کے متعلق اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ بیان کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں: ”ویتولون ازواج النبی ﷺ امہات المؤمنین“

یعنی اہل السنۃ والجماعۃ ازواج النبی ﷺ سے محبت رکھتے ہیں اور ان کی توقیر واحترام کرتے ہیں؛ کیونکہ احترام وتوقیر اور حرمتِ نکاح میں یہ امہات المؤمنین جیسے عظیم مرتبہ پر فائز ہیں البتہ بقیہ احکام میں یہ غیر محرم جیسی ہیں، لہذا ان سے خلوت اختیار کرنا اور ان کی طرف دیکھنا حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلنَّبِیُّ اَوْلیٰ بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ ﴾ (الاحزاب:٦)

ترجمہ: ”پیغمبر مؤمنوں پر خود ان سے بھی زیادہ حق رکھنے والے ہیں اور پیغمبر کی بیویاں مؤمنوں کی مائیں ہیں“

نیز فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَا اَنْ تَنْكِحُوا اَزْوَاجَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ﴾ (الاحزاب:٥٣)

ترجمہ: ”نہ تمہیں یہ جائز ہے کہ تم رسول اللہ کو تکلیف دو اور نہ تمہیں یہ حلال ہے کہ آپ کے بعد کسی وقت بھی آپ کی بیویوں سے نکاح کرو (یاد رکھو) اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا (گناہ) ہے“

نیز فرمایا: ﴿ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ ﴾ (الاحزاب:٥٣)

ترجمہ: ”جب تم نبی کی بیویوں سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو“

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ازواج النبی ﷺ احترام وتحریم میں امہات المؤمنین ہیں، نہ کہ محرم ہونے میں۔

آپ ﷺ کی وفات کے وقت آپ ﷺ کی نو بیویاں تھیں، جو کہ یہ ہیں:

عائشہ، حفصۃ، زینب بنت جحش، ام سلمۃ، صفیۃ، میمونۃ، ام حبیبۃ، سودۃ اور جویریۃ، رضی اللہ عنھن۔

آپ ﷺ کی ازواج میں خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں، آپ ﷺ نے نبوت سے قبل ان سے نکاح کیا تھا اور ان کی موجودگی میں کسی اور سے نکاح نہیں کیا۔

آپ ﷺ کی ازواج میں زینب بنت خزیمۃ الھلالیۃ بھی ہیں، یہ نکاح کے بعد تھوڑا عرصہ بقیدِ حیات رہیں، پھر فوت ہوگئیں۔

یہ گیارہ خواتین ہیں جن سے آپ ﷺ نے نکاح کیا اور جو آپ ﷺ کے حرم میں آئیں اور آپ ﷺ نے ان سے شب باشی فرمائی۔

ازواج مطہرات کو یہ عظیم الشان شرف بھی حاصل ہے کہ یہ آخرت میں بھی آپ ﷺ کی ازواج ہوں گی۔

خدیجہ رضی اللہ عنھا کو ازواجِ مطہرات میں خصوصیت حاصل ہے، کیونکہ انہیں بہت سارے امتیازات اور فضائل حاصل ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ نے مندرجہ ذیل فضائل وامتیازات کا ذکر فرمایا ہے:

(۱) یہ آپ ﷺ کی اکثر اولاد کی والدہ ہیں، چنانچہ آپ ﷺ کی پوری اولاد انہی کے بطن سے ہے سوائے ابراھیم کے، وہ ماریہ قبطیہ کے بطن سے ہیں۔

(۲) یہ سب سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان لائیں، ایک قول یہ ہے کہ یہ مطلقاً سب سے پہلے ایمان لائیں۔ شیخ رحمہ اللہ نے اسی قول کو ذکر کیا ہے دوسرا قول یہ ہے کہ عورتوں میں سب سے پہلے ایمان لائیں۔

(۳) انہوں نے نبوت کے ابتدائی دور میں آپ ﷺ کی اعانت ونصرت کی اور ان کی یہ اعانت ونصرت انتہائی ضرورت کے وقت تھی۔

(۴) نبی ﷺ کے ہاں انہیں بلند مرتبہ حاصل تھا، چنانچہ آپ ﷺ ان سے بہت محبت کرتے تھے اور اکثر اوقات ان کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے اور ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔

صدیقہ بنت الصدیق، یعنی عائشہ بنت ابی بکر کو بھی ازواج مطہرات میں خصوصیت حاصل ہے

''الصدیق'' مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت زیادہ صدق اختیار کرنیوالا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ لقب جنابِ رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمایا ہے۔

عائشہ رضی اللہ عنھا کے بھی بہت سارے فضائل ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) آپ ﷺ کو اپنی ازواج میں سب سے زیادہ محبت انہیں سے تھی، آپ ﷺ نے ان کے علاوہ کسی باکرہ عورت سے شادی نہیں کی۔

(۲) بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی اور آپ ﷺ ان کے لحاف میں ہوتے

(۳) اللہ تعالیٰ نے اہلِ افک کی تہمت سے ان کی برأت فرمائی۔

(۴) یہ ازواج مطہرات میں سب سے بڑھکر فقیھہ تھیں۔

(۵) اکابر صحابہ مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔

(۶) آپ ﷺ کی وفات انہی کے گھر میں ہوئی، وفات کے وقت آپ ﷺ ان کے سینہ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے، آپ ﷺ کی تدفین انہی کے گھر میں ہوئی۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے فضائل ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ نے ان کے فضائل میں یہ حدیث ذکر کی ہے: ان النبی ﷺ قال فیھا [فضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام]

آپ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا' عائشہ رضی اللہ عنھا کو دیگر عورتوں پر ایسی فضیلت ہے جیسی ثرید کو دوسرے کھانوں پر۔

''ثرید'' سے تشبیہ اس لئے دی کہ یہ افضل الأطعمة (سب سے اچھا کھانا) ہے کیونکہ یہ گوشت اور روٹی سے تیار ہوتا ہے، اور یہ بات معلوم ہے کہ روٹی، گندم سے تیار ہوتی ہے اور گندم سب سے بہترین غذا ہے اور گوشت سب سے بہترین سالن ہے، کیونکہ بہترین غذا اور بہترین سالن سے ثرید تیار ہوتی ہے، اس لئے اسے أفضل الطعام کہا جاتا ہے۔

تبرؤ أهل السنة والجماعة

مما يقوله المبتدعة فى حق الصحابة وأهل البيت

اہل السنۃ والجماعۃ کا صحابہ کرام اور اہل بیت کے متعلق مبتدعین

(روافض ونواصب) کے نظریات سے اظہارِ برأت

ويتبرء ون من طـريـقة الروافض الذين يبغضون الصحابة ويسبونهم، ومن طريقة النواصب الذين يؤذون أهل البيت بقول أو عمل. ويمسكون عما شجر بين الصحابة .ويقولون إن هذه الآثار المروية فى مساويهم منها ما هو كذب. ومنها ما قد زِيدَ فيه ونقص وغيّر عن وجهه . والصحيح منه هم فيه معذورون إما مجتهدون مصيبون وإما مجتهدون مخطئون. وهم مع ذلك لايعتقدون أن كل واحد من الصحابة معصوم عن كبائر الإثم وصغائره.بل تجوز عليهم الذنوب فى الجملة .ولهم من السوابق والفضائل ما يوجب مغفرة مايصدر منهم إن صدر .حتى أنهم يغفرلهم من السيئات ما لا يغفر لمن بعدهم. لأن لهم من الحسنات التى تمحوا السيئات ما ليس لمن بعدهم .وقد ثبت بقول رسول الله ﷺ أنهم خير القرون.وأن المدَّ من أحدهم إذا تصدق به كان أفضل من جبل أحد ذهباً ممن بعدهم. ثم إذاكان قدصدر من أحدهم ذنب فيكون قد تاب منه. أو أتى بحسنات تمحوه أو غفرله بفضل سابقته أو بشفاعة محمد ﷺ الذى هم أحق الناس بشفاعته . أو ابتلى ببلاء فى الدنيا كُفِر به عنه. فإذا كان هذا فى الذنوب المحقَّقة، فكيف الأمور التى كانوا فيها مجتهدين إن

أصابوا فلهم أجران وإن أخطئوا لهم أجر واحد والخطأ مغفور . ثم القدر الذى ينكر من فعلهم قليل نزر مغمور فى جنب فضائل القوم ومحاسنهم، من الايمان بالله ورسوله والجهاد فى سبيله والهجرة والنصرة والعلم النافع والعمل الصالح. ومن نظر فى سيرة القوم بعلم وبصيرة وما منَّ الله عليهم به من الفضائل علِم يقيناً أنهم خير الخلق بعد الأنبياء . لاكان ولايكون مثلهم. وأنهم الصفوة من قرون هذه الأمة التى هى خير الأمم وأكرمها على الله.

۞ ۞ ۞

ترجمہ: اہل السنۃ والجماعۃ روافض کے طرزِ عمل سے بریٔ ہیں، جو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھتے ہیں اور انہیں گالیاں دیتے ہیں اسی طرح اہل السنۃ نواصب کے طرزِ عمل سے بھی بریٔ ہیں جو کہ اہلِ بیت کو اپنے قول وعمل سے ایذاء پہنچاتے ہیں۔

اہل السنۃ مشاجرات صحابہ میں سکوت اختیار کرتے ہیں ان کی لغزشوں سے متعلق مروی آثار کے متعلق اہل السنۃ کا موقف یہ ہے کہ بعض آثار تو جھوٹے ہیں بعض میں کمی وبیشی کر کے حقیقت کو مسخ کر دیا گیا ہے البتہ بعض آثار صحیح ہیں۔ایسی لغزشوں کے متعلق اہل السنۃ صحابہ کو معذور سمجھتے ہیں کیونکہ یہ اجتہادی غلطیاں ہیں اور مجتہد مصیب ہوسکتا ہے اور مخطی بھی (اور دونوں صورتوں میں اس کیلئے اجر ہے)

البتہ اہل السنۃ یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ ہر ایک صحابی کبائر اور صغائر سے معصوم ہے بلکہ من حیث القوم ان سے بھی گناہوں کے صادر ہونے کا امکان ہے۔لیکن ان کے پاس سبقت الی الاسلام اور دیگر ایسے فضائل ہیں کہ اگر ان سے گناہوں کا صدور ہو بھی جائے تو یہ

فضائل ان گناہوں کی بخشش کا موجب بن جائیں گے حتی کہ ان کے ایسے گناہ بھی معاف ہو سکتے ہیں جو اگر دوسروں نے کئے ہوں تو معاف نہ ہوں کیونکہ ان کے پاس گناہوں کو مٹانے والی ایسی نیکیاں ہیں جو بعد میں آنیوالوں میں سے کسی کے پاس نہیں۔

رسول اللہ ﷺ سے صحیح ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں خیر القرون کہا ہے، اور یہ کہ ان میں سے کسی ایک کی طرف سے ایک مد صدقہ بھی آنیوالوں میں سے کسی کے اُحد پہاڑ کی مقدار سونے کے صدقہ سے بھی افضل ہے پھر اگر ان میں سے کسی سے کسی گناہ کا صدور ہوا بھی ہے تو اس نے توبہ کر لی ہوگی یا ایسے اعمال کر لئے ہوں گے جو اس گناہ کے مٹ جانے کا سبب بن گئے ہوں گے یا ان کی سبقت الی الاسلام جیسی عظیم فضیلت یا نبی ﷺ کی شفاعت جس کے یہ تمام لوگوں میں سے زیادہ حقدار ہیں، سے ان کے گناہ معاف کر دیئے گئے ہوں گے یا کوئی دنیاوی آزمائش اس گناہ کا کفارہ بن گئی ہوگی۔ صحابہ میں ثابت شدہ گناہوں کا جب یہ معاملہ ہے تو جن امور میں وہ مجتہد تھے، ان کا معاملہ کتنا ہلکا ہوگا، کہ اگر ان امور میں وہ مصیب تھے تو ان کیلئے ڈبل اجر ہے اور اگر خطأ پر تھے تو بھی ایک اجر کے مستحق ہیں، جبکہ خطأ معاف ہے۔

پھر ان کے جن افعال کی نکیر کی گئی ہے وہ ان کے فضائل اور محاسن کے مقابلے میں انتہائی قلیل......مثلاً: الایمان باللہ ورسولہ، الجهاد فی سبیل اللہ، الهجرة، النصرة (دین کی مدد) العلم النافع والعمل الصالح.

جو شخص بھی علم وبصیرت کی نظر سے ان کے فضائل کو دیکھے گا وہ یقینی طور پر جان لے گا کہ یہ لوگ انبیاء کے بعد خیر الخلق (بہترین مخلوق) ہیں، ان سے پہلے ان جیسے تھے نہ ان کے بعد ان جیسے ہوں گے۔

یہ اُمت بہترین اُمت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ برگزیدہ امت ہے، اور صحابہ کرام اس اُمت کا بہترین طبقہ ہیں۔

عبارت کی تشریح

......**شرح**......

شیخ رحمہ اللہ نے اس کلام میں دو باتیں بیان فرمائی ہیں:

اولاً: صحابہ اور اہل بیت کے متعلق اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف اور یہ موقف، افراط وتفریط اور غلو وجفاء کے مقابل اعتدال اور وسطیت پر مبنی ہے، اہل السنۃ جمیع مؤمنین سے محبت رکھتے ہیں خصوصاً سابقین اولین مہاجرین وانصار اور جو احسن طور پر ان کے نقشِ قدم پر چلتے رہے، اور اہل بیت سے بھی محبت رکھتے ہیں، صحابہ کی قدر ومنزلت اور ان کے فضائل ومناقب کو پہچانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو حقوقِ اہل بیت مقرر فرمائے ہیں، کی رعایت کرتے ہیں۔ اور روافض کے طرزِ عمل سے اظہار برأت کرتے ہیں جو صحابہ کرام کو گالیاں دیتے ہیں اور ان پر طعن کرتے ہیں اور علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے حق میں غلو کرتے ہیں۔ اور نواصب کے طرزِ عمل سے بھی اظہارِ برأت کرتے ہیں، یہ لوگ اہل بیت سے عداوت رکھتے ہیں، ان کی تکفیر کرتے ہیں اور ان پر طعن کرتے ہیں۔

صحابہ اور اہل بیت کے متعلق اہل السنۃ والجماعۃ کے مذہب کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، یہاں پر بیان کرنے کا مقصد انحراف کا شکار مخالفین کے ساتھ مقارنہ ہے۔

ثانیاً: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین ہونیوالی لڑائیوں کی وجہ سے ان میں پیدا ہونیوالے اختلاف اور ان کی طرف منسوب بعض لغزشوں اور...... کے سلسلہ میں اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف کیونکہ۔ کیونکہ دین دشمنوں نے ان باتوں کی ان میں طعن کرنے اور ان کی عیب جوئی کرنے کا ذریعہ بنایا ہوا ہے، جیسا کہ بعض متاخرین اور عصرِ حاضر کے قلمکاروں (مصنفین) کا معاملہ ہے کہ انہوں

نے مشاجراتِ صحابہ میں اپنے آپ کو ایک طرح کا حَکَم (فیصلہ کرنے والا) بنالیا ہے، چنانچہ بلا دلیل کسی کو حق پر قرار دیا اور کسی کو خطأ پر، بلکہ اس سلسلہ میں انہوں نے سراسر ھوائے نفس کی پیروی کی ہے، اوران لوگوں کی تقلید کی ہے جن کا مقصد ہی مسلمانوں کی تاریخ اوران کے سلف صالحین جو کہ خیر القرون ہیں، کے متعلق شکوک وشبہات میں مبتلا کر کے، اسلام کے متعلق بدگمان کرنا ہے، تاکہ وہ اس راستے سے اسلام پرطعن کرسکیں اور مسلمانوں کے اتحاد واتفاق کو پارہ پارہ کرسکیں۔

شیخ رحمہ اللہ نے کتنے ہی احسن انداز سے حق اور حقیقت کو واضح کیا ہے چنانچہ شیخ رحمہ اللہ نے مشاجراتِ صحابہ اوران کی طرف منسوب بعض لغزشوں کے متعلق اہل السنۃ کے موقف کو خلاصۃً دو امور میں بیان فرمایا ہے:

الامر الاول: اہل السنۃ مشاجراتِ صحابہ میں بحث وتمحیص اور غور وغوض نہیں کرتے، کیونکہ اس سے صحابہ کے بارے میں بغض وکینہ پیدا ہوسکتا ہے اور یہ کبائر میں سے ہے اس لئے سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ اس مسئلہ میں سکوت اختیار کیا جائے۔

الامر الثانی: صحابہ کی لغزشوں کے متعلق مروی آثار کیلئے عذر تلاش کیئے جائیں، اس میں ان کا دفاع بھی ہے اوران کے اعداء کی تدبیروں کا رد بھی۔

شیخ رحمہ اللہ نے خلاصۃً درج ذیل عذر بیان کئے ہیں

(۱) ان آثار میں بعض تو سرے سے جھوٹ ہیں جوانکے اعداء نے ان کی شہرت کو داغدار کرنے کیلئے وضع کئے ہیں، جیسا کہ روافض کا کردار ہے، ایسے آثار تو کسی التفات کے لائق نہیں۔

(۲) بعض آثار ایسے ہیں جن میں کمی وبیشی کر کے حقیقت کو مسخ کردیا گیا ہے، جھوٹ داخل کر کے حقائق میں تحریف کردی گئی ہے لہذا ایسے آثار پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ صحابہ کے فضائل معلوم اوران کی عدالت متیقن ہے چنانچہ محرف اور مشکوک امر کی خاطر معلوم اور متیقن امر کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔

(۳) البتہ بعض آثار صحیح ہیں، ایسی لغزشوں کے متعلق اہل السنۃ انہیں معذور سمجھتے ہیں کیونکہ یہ اجتہادی غلطیاں ہیں اور مجتہد مصیب (حق پر) ہوسکتا ہے اور مخطئ (غلطی پر) بھی اور مجتہد اگر حق کو پالے تو اس کیلئے دہرا اجر ہے اور اگر غلطی پر بیٹھے تو اس کیلئے ایک اجر ہے چنانچہ صحیحین میں ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنھما سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

[اذا اجتهد الحاكم فاصاب فله اجران ،وان اجتهد وأخطأ فله اجر واحد]

ترجمہ: [جب حاکم اجتہاد کرے اور حق بات تک پہنچ جائے تو اس کیلئے دو اجر ہیں اور اگر حق بات سے خطأ کر بیٹھے تو اس کیلئے ایک اجر ہے]

(۴) یہ بشر ہیں جس طرح عام بشر سے خطأ کا امکان ہے اسی طرح ان میں سے بھی کسی سے خطأ کا امکان موجود ہے، اسی لئے اہل السنۃ کا یہ اعتقاد نہیں کہ ہر ایک صحابی کبیرہ اور صغیرہ گناہوں سے معصوم ہے، بلکہ من حیث العموم ان سے بھی گناہوں کے صادر ہونے کا امکان ہے لیکن ان سے جو بھی خطأ صادر ہوئی ہے اس کیلئے مکفرات بھی موجود ہیں مثلاً:

"الف": ان کے پاس سبقت الی الاسلام اور دیگر ایسے فضائل ہیں کہ اگر ان سے گناہوں کا صدور ہو بھی جائے تو ان گناہوں کی بخشش کا موجب بن جائیں گے۔ چنانچہ ان کی ایسی بڑی بڑی نیکیاں ہیں کہ ان کی وجہ سے ان کی لغزشیں اور خطائیں معاف ہوجاتی ہیں جیسا کہ حاطب بن ابی بلتعہ کے قصہ سے یہ بات واضح ہے کہ غزوہ فتح مکہ کے معاملے میں ان سے غلطی ہوئی (انہوں نے کفار کو مسلمانوں کے جنگی پلان سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی) تو ان کی یہ غلطی ان کی جنگ بدر میں شرکت کی وجہ سے معاف کردی گئی۔ بلکہ ان کے تو ایسے گناہ بھی معاف ہوسکتے ہیں کہ جو اگر دوسروں نے کیئے ہوں تو معاف نہ ہوں کیونکہ ان کے پاس گناہوں کو مٹانے والی ایسی نیکیاں ہیں جو بعد میں آنیوالوں میں سے کسی کے پاس نہیں ہیں، جیسا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ﴾ (ھود:۱۱۴)

ترجمہ: ’’یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں‘‘

’’ب‘‘ انہیں نیکیوں کا اجر وثواب دوسروں کے مقابلے میں کئی گناہ زیادہ ملتا ہے اور پھر دیگر فضائل میں کوئی ان کی برابری کرنیوالا بھی نہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ سے صحیح حدیث ثابت ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی طرف سے ایک مد صدقہ بعد میں آنیوالوں میں سے کسی کے اُحد پہاڑ کی مقدار سونے کے صدقے سے بھی افضل ہے۔ (بخاری ومسلم)

آپ ﷺ سے یہ فرمان بھی ثابت ہے:

[خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم] (بخاری ومسلم)

ترجمہ: ’’بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے]

’’القرون‘‘ ’’قرن‘‘ کی جمع ہے ’’قرن‘‘ ایک زمانہ کے لوگ جو باہم متقارب ہوں اور کسی اہم امر میں شریک ہوں ’’قرن‘‘ کا اطلاق مدت اور زمانہ پر بھی ہوتا ہے۔

’’ج‘‘ ان کے پاس مکفرات الذنوب کی کثرت، چنانچہ جتنی کثیر تعداد میں مکفرات الذنوب انہیں حاصل ہیں کسی اور کو نہیں، چنانچہ اگر ان میں سے کسی سے گناہ کا صدور ہوا ہے تو اس نے توبہ کر لی ہوگی یا ایسے نیک اعمال کر لئے ہوں گے جنہوں نے اس گناہ کو مٹا دیا ہوگا یا پہلے سے کیئے ہوئے اعمالِ صالحہ کی وجہ سے بخشش کر دی گئی ہوگی یا نبی ﷺ کی شفاعت جس کے یہ باقی لوگوں کی بنسبت زیادہ حقدار ہیں، کی وجہ سے اس گناہ کو معاف کر دیا جائے گا، یا کسی دنیاوی آزمائش اور مصیبت کی وجہ سے اس گناہ کو مٹا دیا گیا ہوگا جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [مایصیب المؤمن وصب ولا نصب ولا غم ولا ھم ولا حزن حتی الشوکۃ یشاکھا الا کفر اللہ بھا من خطایاہ] (متفق علیہ)

ترجمہ: [کسی مؤمن کو اگر کوئی مرض، تھکاوٹ، غم، پریشانی اور حزن پہنچے یا اسے کوئی کانٹا چبھے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کے گناہ مٹا دیتا ہے]

جب عام مؤمن کا یہ معاملہ ہے تو صحابہ تو اس مقام کے باقی لوگوں کی بنسبت زیادہ حقدار ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’فاذا فی الذنوب المحققۃ، فکیف بالامور التی کانوا فیھا مجتھدین‘‘

یعنی جب ان سے واقعتاً سرزد ہونیوالے گناہوں کا یہ معاملہ ہے کہ ان کے پاس ایسے اعمالِ صالحہ کا ذخیرہ ہے جو ان گناہوں کی بخشش کا ذریعہ بن سکتے ہیں، تو وہ لغزشیں اور خطائیں کیسے معاف نہیں ہو سکتیں جن میں وہ مجتہد تھے۔

اجتہاد کا معنی ہے حکم شرعی کی معرفت میں اپنی پوری طاقت وصلاحیت خرچ کر دینا۔

چنانچہ ان اجتہادی امور میں اگر یہ مصیب (حق پر) ہیں تو ان کیلئے دو اجر ہیں اور اگر مخطی (غلطی پر) ہیں تو ایک اجر ہے اور خطأ معاف ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صحابی سے صادر ہونیوالی خطأ قلت کے ساتھ ساتھ دو باتوں کے بین بین ہے (۱) یا تو وہ خطأ اجتہاد سے صادر ہوئی ہے اس صورت میں تو اس کیلئے ایک اجر ہے اور خطأ معاف ہے۔

(۲) یا پھر یہ خطأ بغیر اجتہاد کے صادر ہوئی ہے تو ایسی صورت میں، اس کے پاس ایسے اعمال، فضائل اور خیرات کا ذخیرہ ہوگا جو اس خطأ کے مٹنے کا سبب بن جائے گا۔

شیخ رحمہ اللہ نے آخر میں فضائل صحابہ کا اجمالاً ذکر فرمایا ہے، جو کہ یہ ہیں:

(۱) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان اور یہ ایمان افضل الاعمال ہے۔

(۲) اعلاءِ کلمۃ اللہ کیلئے جہاد فی سبیل اللہ، اور یہ تو اسلام کی چوٹی ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت، اور یہ بھی افضل الاعمال میں سے ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت اللہ تعالیٰ کا ان کے متعلق فرمان ہے:

﴿ وَيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ أُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ (الحشر:۸)

ترجمہ: ''اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی راست باز لوگ ہیں''

(۵) علمِ نافع اور عملِ صالح۔

(۶) یہ انبیاء کے بعد خیر القرون ہیں، چنانچہ اُمتِ محمدیہ ﷺ خیر الامم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ (آل عمران:۱۱۰)

اور اس امت کا بہترین طبقہ اصحابِ رسول اللہ ﷺ ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

[خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم] (بخاری ومسلم)

ترجمہ: ''بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں پھر وہ جوان کے بعد آئیں گے]

(۷) یہ اُمت خیر الامم اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے برگزیدہ امت ہے، اور صحابہ کرام اس امت کے بہترین طبقہ ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

[انتم توفون سبعین امة انتم خیرها واکرمها علی الله سبحانه]

ترجمہ: [تم ستر کے عدد کو پورا کرنیوالی امت ہو (یعنی تم سترویں امت ہو) اور تم ان تمام امتوں میں سب سے بہتر اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے برگزیدہ امت ہو۔

(احمد، ابنِ ماجہ، مستدرک حاکم)

مذهب أهل السنة والجماعة فی کرامات الأولیاء

کراماتِ اولیاء کے متعلق اہل السنۃ والجماعۃ کا مذھب

ومن أصول السنة التصديق بكرامات الأولياء ،وما يجرى الله على أيديهم من خوارق العادات ،في انواع العلوم والمكاشفات وأنواع القدرة والتأثيرات . والمأثور عن سالف الأمم في سورة الكهف وغيرها وعن صدر هذه الأمة من الصحابة والتابعين وسائر فرق الأمة . وهي موجودة فيها إلى يوم القيامة.

ترجمہ: اہل السنۃ کے اصول میں سے یہ بات بھی ہے کہ کراماتِ اولیاء اور جو خرقِ عادت امور، مختلف علوم ومکاشفات اور مختلف قسم کی قدرتوں اور تاثیرات کے حوالے سے ان کے ہاتھوں رونما ہوئے ہیں، کی تصدیق کی جائے ،اس طرح سابقہ امت سے سورۂ کہف وغیرہ میں جو منقول ہے اور اس امت کے اول طبقہ صحابہ کرام، تابعین اور امت کے دیگر افراد سے جو کرامات منقول ہیں، کی تصدیق کی جائے یہ کرامات اس امت میں قیامت تک موجود رہیں گی۔

عبارت کی تشریح

''کرامات'' ''کرامۃ'' کی جمع ہے، جس کا معنی ہے ''خارق عادت امر'' یعنی انسانوں میں معلوم ومعروف امر کے برعکس امر کا وقوع، شرعی اصطلاح میں کرامت سے مراد ہے، وہ خرق عادت امور جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کے ہاتھوں پر جاری فرماتا ہے۔

''الاولیاء'' ولی کی جمع ہے اور ''ولی'' مؤمن اور متقی شخص کو کہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان

ہے: ﴿ اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ . اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴾ (یونس:۶۲،۶۳)

ترجمہ: ''یادرکھواللہ کے دوستوں پرنہ کوئی اندیشہ ہےاورنہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔وہ،وہ ہیں جو ایمان لائے اور(برائیوں)سے پرہیز رکھتے ہیں''

''الـولـی'' ''الـولاء'' سے مشتق ہے جس کامعنی محبت اورقرب ہے،تو ولی اللہ وہ شخص ہوتا ہے جواللہ تعالی کی پسند اورمرضی کے کاموں میں اس کی موافقت کرکے اس سے محبت کرتا ہے۔

کراماتِ اولیاء برحق ہیں،کتاب وسنت اورصحابہ وتابعین سے منقول ہیں آثارِمتواترہ اس بات پردلالت کرتے ہیں،کراماتِ اولیاءکے متعلق لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) جوسرے سےنفی کرتے ہیں،جیسے معتزلہ،جہمیہ اوربعض اشاعرہ وغیرہ،ان کا کہنا ہے کہ اگراولیاءکے ہاتھوں پرامورخوارق کے ظہورکوجائزمان لیں توایک نبی غیرنبی سے ملتبس ہوجائے گا(یعنی نبی اورغیرنبی میں تفریق نہیں ہوسکے گی) کیونکہ نبی اورغیرنبی میں فرق معجزہ ہے جوکہ ایک خرقِ عادت امرہوتا ہے۔

(۲) جواثباتِ کرامات میں غلوکرتے ہیں،جیسے صوفیہ کے طرق کے پیروکاراورقبوریین،یہ لوگ لوگوں کے ساتھ دجل وفریب سے کام لیتے ہیں اورشیطانی خرقِ عادت امورظاہرکرتے ہیں مثلاً: آگ میں داخل ہونا،اپنے آپ کواسلحہ سے مارنا،اورسانپوں کوپکڑلیناوغیرہ جیسے دیگر تصرفات جنہیں یہ لوگ اصحابِ قبورکیلئے ثابت مانتے ہیں اورانہیں ان کی کرامات کہتے ہیں۔

(۳) اہل السنۃ والجماعۃ،جن کا ذکرشیخ رحمہ اللہ نے اپنی کلام میں فرمایا ہے،چنانچہ یہ لوگ کراماتِ اولیاء پرایمان رکھتے ہیں اورانہیں کتاب وسنت کے مقتضیٰ کے مطابق ثابت مانتے ہیں۔

منکرینِ کرامات کی دلیل کہ اس سے نبی اورغیرنبی میں اشتباہ لازم آتا ہے کا جواب اہل السنۃ

یہ دیتے ہیں کہ اس سے اشتباہ لازم نہیں آتا کیونکہ انبیاءاورغیرانبیاء میں خوارق العادات کے علاوہ بہت سے امور ہیں جوفرق کرتے ہیں اوریہ کہ ولی،نبوت کادعویٰ نہیں کرتا اگرکوئی ولی نبوت کا دعویٰ کرےگا توولایت سے خارج ہوجائےگا،وہ جھوٹا مدعی نبوت کہلائےگا،اوراللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے کہ وہ جھوٹے کورسوا کرتا ہے جیسا کہ مسلیمہ کذاب وغیرہ کے ساتھ ہوا۔

اثباتِ کرامات میں غلوکرنیوالے جوکہ شعبدہ بازوں اوردجالوں کیلئے بھی کرامات کوثابت کرتے ہیں کا اہل السنۃ نے اس طرح ردکیا ہے کہ یہ شعبدہ بازواوردجال قسم کے لوگ اولیاءاللہ نہیں ہیں،بلکہ یہ تو اولیاءالشیطان ہیں،ان کے ہاتھوں جوامورظاہرہوتے ہیں یاتووہ کذب اور دھوکہ ہے یاپھرخودان کیلئے اوردوسروں کیلئے فتنہ اوراستدراج ہے۔

اس موضوع پرشیخ الاسلام ابن تیمیہ کی عظیم تألیف بھی ہے،جس کانام ''الفرقان بین اولیاء الرحمان واولیاء الشیطان'' ہے۔

قوله:''في انواع العلوم والمكاشفات وأنواع القدرة والتأثيرات .''

اس عبارت میں شیخ رحمہ اللہ نے کرامات کی انواع کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ بعض کاتعلق کشف سے ہوتا ہے،یعنی کوئی بندہ ایسی بات سنے جوکسی اورنے نہیں سنی،یاعالم خواب یابیداری میں کچھ دیکھے جسے کسی اورنے نہیں دیکھا یاایساعلم جوکسی اورکے پاس نہیں اوربعض کرامات کاتعلق قدرت اورتاثیرکے باب سے ہوتا ہے۔

پہلی نوع کی مثال: قول عمر'' یا سارية الجبل ''یعنی''اےساریہ پہاڑپہ چڑھ جاؤ'' حالانکہ عمرؓ مدینہ میں تھے اورساریہ مشرق میں تھے۔ (البيهقي في دلائل النبوة ابونعيم في الدلائل السلسلة الصحيحة (۱۱۱۰)

ابوبکرؓ کااپنی اہلیہ کےحمل کے بارہ میں خبردیناکہ وہ مونث ہے (مؤطا امام مالک، اللالكائي في كرامات الاولياء ، الاصابة)

عمرؓ کا اپنے ایک بیٹے کے متعلق خبر دینا کہ اس کی اولاد میں ایک عادل پیدا ہوگا۔

صاحبِ موسیٰ (خضر علیہ السلام) کا قصہ اوراسے بچے کے حال کا علم ہونا۔

دوسری مثال: اس شخص کا قصہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا اور اس کا عرشِ بلقیس کو سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر کرنا۔ (یہاں راجح قول یہی ہے کہ ''الذی عندہ علم من الکتاب'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ واللہ اعلم)

قصہ اصحابِ کہف، مریم علیہا السلام کا قصہ، خالد بن ولید کا قصہ کہ انہوں نے زہر پی لیا لیکن انہیں اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچا۔

وقوله: " والمأثور عن سالف الأمم في سورة الكهف وغيرها وعن صدر هذه الأمة من الصحابة والتابعين وسائر فرق الأمة ."

شیخ رحمہ اللہ اس کلام میں ان کرامات کا ذکر کر رہے ہیں جو واقع ہو چکی ہیں اور قرآن اور آثارِ صحیحہ میں ان کا ذکر موجود ہے۔

چنانچہ قرآنِ مجید میں سابقہ امتوں کے حوالے سے جن کرامات کا ذکر ہے ان میں سے مریم علیہا السلام کا بغیر شوہر کے حاملہ ہونا ہے اور سورۂ کہف میں مذکور اصحابِ کہف، صاحب موسیٰ (خضر علیہ السلام) اور ذوالقرنین کا قصہ ہے۔

اور اس اُمت کے اول طبقہ صحابہ وتابعین رحمہم اللہ سے صحیح سند سے کرامات منقول ہیں مثلاً:

عمرؓ کا ساریہ کے جیش کو دیکھنا، حالانکہ عمرؓ اس وقت منبر مدینہ پر تھے، اور ساریہ کا جیش مشرق میں نھاوند مقام پر تھا، اور عمرؓ کا ساریہ کو ان الفاظ کے ساتھ نداء دینا ''یا ساریۃ الجبل'' اور ساریہ نے اس نداء کو سن لیا اور بروقت راہنمائی سے فائدہ اٹھایا اور دشمن کی چال سے بچ گئے۔

قوله: "وهي موجودة فيها الى يوم القيامة"

یعنی جب تک امت کے افراد میں ولایت اپنی تمام شروط کے ساتھ موجود رہے گی اس وقت تک امت میں کرامات کا وجود بھی موجود رہیگا۔ (واللہ اعلم)

فصل

فی صفات أهل السنة والجماعة ولم سمّوا بذلک؟

اہل السنۃ والجماعۃ کی صفات اوران کے اس نام کی وجہ تسمیہ کا بیان

ثم من طريقة أهل السنة والجماعة اتباع آثار رسول الله ﷺ باطنا وظاهرا واتباع سبيل السابقين الأولين من المهاجرين والأنصار . واتباع وصية رسول الله ﷺ حيث قال: [عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدى . تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ . وإياكم ومحدثات الأمور ؛ فإن كل بدعة ضلالة] ويعلمون أن أصدق الكلام كلام الله وخير الهدى هدى محمد ﷺ .

ويؤثرون كلام الله على غيره من كلام أصناف الناس. ويقدمون هدى محمد ﷺ على هدى كل أحد . ولهذا سُمّوا أهل الكتاب والسنة . وسموا أهل الجماعة لأن الجماعة هي الاجتماع وضدها الفرقة. وإن كان لفظ الجماعة قد صار اسماً لنفس القوم المجتمعين . والإجماع هو الأصل الثالث الذي يعتمد عليه في العلم والدين. وهم يزنون بهذه الأصول الثلاثة جميع ما عليه الناس من أقوال وأعمال باطنة أو ظاهرة مما له تعلق بالدين . والإجماع الذي ينضبط هو ما كان عليه السلف الصالح؛ إذبعدهم كثر الاختلاف وانتشرت الأمة.

۞ ۞ ۞

ترجمہ: اہل السنۃ والجماعۃ کے طریقہ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ

کے آثار کی ظاہراً و باطناً اتباع کرتے ہیں اور سابقین اولین مہاجرین وانصار کے راستے کی پیروی کرتے ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کی اس وصیت کی پیروی کرتے ہیں۔

[عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدي . تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ . وإياكم ومحدثات الأمور ؛ فإن كل بدعة ضلالة]

ترجمہ:[تم میری سنت اور میرے بعد خلفاءِ راشدین جو کہ ہدایت پر ہیں کی سنت کی پیروی کو لازم کرلو، اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور اسے اپنی داڑھوں میں دبالو اور اپنے آپ کو نئے نئے امور سے بچاؤ کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے] (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

اور اہل السنة یہ بھی جانتے ہیں کہ سب سے سچی کلام اللہ تعالیٰ کی کلام ہے اور سب سے بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے۔ لہذا یہ اسکے کلام کو لوگوں کے کلام پر اور محمد ﷺ کے طریقہ کو لوگوں کے طریقوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

اور اسی لئے انہیں اهل الكتاب والسنة کہا جاتا ہے انہیں اهل الجماعة بھی کہا جاتا ہے؛ کیونکہ الجماعة بمعنی الاجتماع ہے، جس کی ضد ''الفرقة'' (الگ الگ ہونا ہے) اگر چہ لفظ ''الجماعة'' کا اطلاق اس قوم پر ہوتا ہے جو اکٹھے بیٹھے ہوئے ہوں۔

جبکہ ''الاجماع'' (کتاب وسنت کے بعد) دین کا تیسرا معتمد علیہ اصل ہے اہل السنة لوگوں کے ظاہری و باطنی اقوال واعمال جن کا تعلق دین سے ہے، کو انہیں تینوں اصولوں سے تولتے ہیں جس اجماع کو صحیح قرار دیا گیا ہے وہ سلف صالحین کا اجماع ہے۔ کیونکہ ان کے بعد اختلاف بہت ہو گیا اور امت منتشر ہو گئی۔

عبارت کی تشریح

مسائلِ عقیدہ میں اہل السنة والجماعة کا طریقہ ذکر کرنے کے بعد اب شیخ رحمہ اللہ اس فصل

اور اس کے بعد کی فصل میں دین کے اصول وفروع میں ان کے طریقہ کو بیان کررہے ہیں اور ان کے ان اوصاف کو بیان کررہے ہیں جن اوصاف کے ساتھ یہ اهل البدع اور دیگر مخالفین سے ممتاز ہیں، ان کے اوصاف میں سے اہم اوصاف یہ ہیں:

(۱) ''اتباع آثار النبي ﷺ ظاهراً وباطناً'' نبی ﷺ کے طریقہ ومنہج پر چلنا ظاہراً بھی اور باطناً بھی بخلاف منافقین، جو کہ ظاہراً تو اس طریقہ ومنہج پر چلتے ہیں لیکن باطناً نہیں۔

''آثارِ رسول'' سے مراد آپ ﷺ کی سنن ہیں شرعی اصطلاح میں سنت آپ ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو کہا جاتا ہے، آپ ﷺ کے آثار حسیہ مثلاً: آپ ﷺ کے بیٹھنے اور سونے وغیرہ کے مقامات اس میں شامل نہیں؛ کیونکہ ان مقامات کا تتبع شرک میں واقع ہونے کا سبب بن سکتا ہے، جیسا کہ سابقہ امتوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔

(۲) ''اتباع سبيل السابقين الاولين من المهاجرين والانصار'' ان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ یہ سابقین اولین مہاجرین وانصار کے راستہ کی پیروی کرتے ہیں؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علم وفقہ میں انہیں دوسروں پر ممتاز کیا ہے، چنانچہ انہوں نے نزولِ قرآن کا مشاہدہ کیا، قرآن کی تفسیر وتأویل رسول اللہ ﷺ سے سنی، کیونکہ انہوں نے یہ دونوں چیزیں بلاواسطہ رسول اللہ ﷺ سے لی ہیں اس لئے ان کا فہم اقرب الی الصواب ہے اور یہی رسول اللہ کے بعد پیروی کے زیادہ حقدار ہیں چنانچہ اتباع میں رسول اللہ ﷺ کے بعد انہیں کا درجہ ہیں۔

اگر کسی مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نص موجود نہ ہو تو اقوالِ صحابہ حجت ہیں اور ان کی پیروی واجب ہے، کیونکہ ان کا طریقہ زیادہ محفوظ، علم پر مبنی اور محکم ہے، بعض متأخرین کا یہ قول سراسر غلط ہے کہ ''سلف کا طریقہ سب سے محفوظ ہے جبکہ خلف کا طریقہ علم واستحکام پر مبنی ہے'' اسی وجہ سے یہ لوگ خلف کے طریقہ کی پیروی کرتے ہیں اور سلف کے طریقہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔

(۳) اہل السنة کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اس وصیت کی مکمل طور پر اتباع کرتے ہیں:

[علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدي . تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ . وإياكم ومحدثات الأمور ؛ فإن كل بدعة ضلالة]

ترجمہ:[تم میری سنت اور میرے بعد خلفاءِ راشدین جو کہ ہدایت پر ہیں کی سنت کی پیروی کو لازم کرلو، اسے مضبوطی سے پکڑلو اور اسے اپنی داڑھوں میں دبالو اور اپنے آپ کو نئے نئے امور سے بچاؤ کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے] (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے)

اس صفت کے ذکر سے شیخ رحمہ اللہ کی غرض یہ ہے کہ اہل السنۃ بالعموم سابقین اولین مہاجرین وانصار کے طریقہ کی پیروی کرتے ہیں البتہ بالخصوص وہ خلفائے راشدین کے طریقہ کی پیروی کرتے ہیں کیونکہ اس حدیث میں خلفائے راشدین کے طریقہ کی پیروی کرنے کی خصوصی وصیت رسول اللہ ﷺ کی طرف سے موجود ہے اور اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے خلفائے راشدین کی سنت کو اپنی سنت سے ملا دیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ خلفائے راشدین کی یا ان میں سے کسی ایک کی سنت سے عدول کرنا کسی طور پر جائز نہیں ہے۔

خلفائے راشدین سے مراد خلفائے اربعہ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم ہیں۔

''راشد'' وہ شخص ہوتا ہے جو حق کو جان لے اور اس پر عمل کرے، اس کی ضد ''الغاوی'' ہے یہ وہ شخص ہے جو حق کو جان لے لیکن اس پر عمل نہ کرے۔ ''المھدیین'' وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حق کی طرف ہدایت فرمائی ہو یعنی ہدایت یافتہ لوگ۔

''تمسکوا'' ای ''الزموھا'' یعنی لازم پکڑلو۔

''عضوا علیھا بالنواجذ'' ''النواجذ'' آخری ڈارھ کو کہا جاتا ہے یعنی سنت پر اپنی داڑھیں گاڑھ لو یہ سنت کو انتہائی مضبوطی سے پکڑنے سے کنایہ ہے ''محدثات الأمور'' نئے نئے کام ہیں بدعتیں۔

''فإن کل بدعة ضلالة''

''بدعت'' کی شرعی تعریف: ہر وہ کام جس کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو، چنانچہ ہر وہ کام جسے کوئی شخص ایجاد کرے اور اس کی نسبت دین کی طرف کرے، جبکہ اس کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو، تو ایسا کام بدعت وگمراہی ہے، چاہے اس کا تعلق عقیدہ سے ہو اقوال سے ہو یا افعال سے۔

(۴) اہل السنۃ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم وتوقیر کرتے ہیں اور استدلال واقتداء میں ان دونوں کو لوگوں کے اقوال واعمال پر ہمیشہ مقدم رکھتے ہیں کیونکہ انہیں علم ہے ''ان اصدق الکلام کلام اللہ'' یعنی ''یقیناً سب سے سچی کلام اللہ تعالیٰ کی کلام ہے''

نیز فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلاً ﴾ (النساء:۱۲۲)

ترجمہ: ''اور کون ہے جو اپنی بات میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا ہو''

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴾ (النساء:۸۷)

ترجمہ: ''اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات کرنیوالا کون ہے''

اور انہیں علم ہے کہ [خیر الھدی ھدی محمد ﷺ]

''بہترین طریقہ یا راہنمائی محمد ﷺ کی ہے''

''الھَدی'' کو ''ھاء'' کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے اس صورت میں اس کا معنی طریقہ اور سیرت ہے اس لفظ کو ''ھاء'' کے ضمہ اور دال کے فتحہ ''اَلْھُدٰی'' کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں معنی ہوگا دلالت وراہنمائی۔

چنانچہ ان کا یہ وصف ہے کہ یہ کلام اللہ کو جمیع لوگوں کی کلام پر ترجیح دیتے ہیں، کلام کو مضبوطی سے تھام لیتے ہیں اور اس کے معارض مخلوق کی کلام کو چھوڑ دیتے ہیں چاہے وہ کوئی سردار یا وزیر ہو، کوئی عالم ہو یا کوئی عابد وزاہد ہو۔ اسی طرح یہ لوگ (اہل السنۃ) محمد ﷺ کی سیرت، طریقہ تعلیم

اور راہنمائی کو مخلوق میں سے ہر ایک کے طریقہ، سیرت، تعلیم اور راہنمائی پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے وہ کوئی بھی ہو، اس کا کتنا ہی اونچا مقام ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہی راہنمائی فرمائی ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ﴾

ترجمہ: (اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو رسول (ﷺ) کی اور تم میں سے اختیار والوں کی) (النساء:۵۹)

اہل السنۃ والجماعۃ کی وجہ تسمیہ

کیونکہ یہ لوگ کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامتے ہیں اور اسے ہر کسی کے کلام پر مقدم رکھتے ہیں، سنتِ رسول اللہ کو مضبوطی سے تھامتے ہیں اور اسے ہر کسی کے طریقہ پر مقدم رکھتے ہیں چنانچہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے ساتھ اس تعلق کی بنا پر انہیں اہل الکتاب والسنۃ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے ساتھ اس تعلق کی بنا پر انہیں یہ عظیم لقب ملا ہے، جو انہیں کتاب وسنتِ رسول اللہ سے روگردانی اختیار کرنیوالوں سے ممتاز کرتا ہے، جیسا کہ معتزلہ، خوارج، روافض اور وہ لوگ جو کلی یا جزوی طور پر ان کی موافقت کرتے ہیں۔

اھل السنۃ کو اھل الجماعۃ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ ''الجماعۃ'' ''الفرقۃ'' (گروہ گروہ ہونا) کی ضد ہے، کیونکہ تمسک بالکتاب والسنۃ باہم اجتماعیت اور الفت کا باعث ہے اس لئے انہیں اس نام سے موسوم کیا جاتا ہے، چنانچہ اھل الجماعۃ کا معنی ہے، وہ لوگ جو حق پر مجتمع ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا ﴾ (آل عمران:۱۰۲)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھام لو اور پھوٹ نہ ڈالو''

(۵) اہل السنۃ کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامنے پر باہم مجتمع، حق پر متفق اور نیکی وتقویٰ کے کاموں پر ایک دوسرے سے تعاون کرنے والے ہیں ان کی ان خوبیوں سے ان میں اجماع وجود میں آیا ہے جو کہ دین کا تیسرا معتمد علیہ اصل ہے، اصولیون نے ''اجماع'' کی یہ تعریف بیان کی ہے: ایک زمانہ کی علماء کا کسی دینی امر پر اتفاق کر لینا، اجماع بھی ایک قطعی حجت ہے، جس پر عمل کرنا واجب ہے۔

اجماع کو تیسرا اصل قرار دیا گیا ہے، پہلے دو اصل سے مراد کتاب وسنت ہیں۔

(٦) وهم يزنون بهذه الأصول الثلاثة جميع ما عليه الناس من أقوال وأعمال باطنة أو ظاهرة مما له تعلق بالدين.

''جبکہ ''الاجماع'' (کتاب وسنت کے بعد) دین کا تیسرا معتمد علیہ اصل ہے اہل السنۃ لوگوں کے ظاہری وباطنی اقوال واعمال جن کا تعلق دین سے ہے، کو انہیں تینوں اصولوں سے تولتے ہیں''

اہل السنۃ نے اصول ثلاثہ (کتاب، سنتِ رسول اللہ، اجماع) کو حق وباطل اور ہدایت وگمراہی کو واضح کرنے کیلئے میزان مقرر کر رکھا ہے یعنی لوگوں میں پائے جانے والے عقائد، افعال، اقوال اور ایسے اعمال جن کا تعلق دین سے ہے جیسے نماز، صیام، زکاۃ، حج اور معاملات وغیرہ میں حق وباطل اور ہدایت وگمراہی کی معرفت اور پہچان کیلئے اہل السنۃ کے نزدیک میزان کتاب وسنت اور اجماع ہیں۔

البتہ عادی اور دنیوی امور جن کا دین سے تعلق نہیں ان میں اصل اباحت (جواز) ہے۔

وقوله: والإجماع الذي ينضبط هو ما كان عليه السلف الصالح؛ إذ بعدهم كثر الاختلاف وانتشرت الأمة.

''جس اجماع کو صحیح قرار دیا گیا ہے وہ سلف صالحین کا اجماع ہے۔ کیونکہ ان کے بعد اختلاف بہت ہو گیا اور امت منتشر ہو گئی۔''

اس کلام میں شیخ رحمہ اللہ اجماع، جو کہ مسائل کے استنباط واستدلال میں دین کا ایک معتمد علیہ اصل ہے، کی حقیقت بیان کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ سلف صالحین کا اجماع ہی ایسا اجماع ہے جس کے حصول اور وقوع کو یقینی کیا جاسکتا ہے؛ کیونکہ یہ لوگ قلیل تعداد میں تھے اور ارضِ حجاز میں مجتمع تھے لہذا انہیں ضبط میں لانا ان کی رائے کی معرفت حاصل کرنا ممکنات میں سے ہے، البتہ سلف صالحین کے بعد اجماع کا حصول اور وقوع یقینی امر نہیں ہے، اور اس کے دو سبب ہیں۔

(۱) کثرتِ اختلاف، جس کی وجہ سے ان کے اقوال کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔

(۲) فتوحات کے بعد امت کے افراد کا اقطار الارض میں منتشر ہوجانا، جس بنا پر حادثہ کی خبر ہر ایک تک پہنچا اور ہر ایک کا اس پر مطلع ہونا عادتاً ناممکن ہے پھر کسی مسئلہ کے بارہ میں یقین سے کہنا ناممکن ہے کہ اس مسئلہ میں سب کا قول ایک ہی ہے۔

تنبیہ: شیخ رحمہ اللہ نے صرف اصول ثلاثہ کے ذکر پر اختصار کیا ہے، اور چوتھے اصل ''القیاس'' کو ذکر نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ''قیاس'' مختلف فیہ ہے جس طرح کہ کچھ دیگر اصول میں فقہاء کا اختلاف ہے، ان کا اصل مرجع کتب اصول ہیں۔

فصل

فی بیان مکملات العقیدة من مکارم الأخلاق ومحاسن الأعمال التی یتحلی بها أهل السنة

عقیدہ کی تکمیل کے اسباب میں مکارم اخلاق، اور محاسن اعمال جو کہ اہل السنۃ کا زیور ہیں، شامل ہیں

ثم هم مع هذه الأصول يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر على توجبه الشريعة ويرون إقامة الحج والجمع والأعياد مع الأمراء: أبرارا كانوا أو فجارا . ويحافظون على الجماعات . ويدينون بالنصيحة للأمة ويعتقدون معنى قوله ﷺ : [المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا] وشبك بين أصابعه .وقوله ﷺ [مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم كمثل الجسد، إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالحمى والسهر] ويأمرون بالصبر عند البلاء والشكر عند الرخاء والرضا بمر القضاء .

ترجمہ: اہل السنۃ ان (مذکور) اصول پر مضبوطی سے قائم ہونے کے ساتھ ساتھ شرعی ہدایات کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری پوری کرتے ہیں، اور فریضۂ حج، جمعہ اور عیدین کی ادائیگی اپنے امراء چاہے نیک ہوں یا فاجر، کے ساتھ ادا کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور نماز باجماعت کی حفاظت کرتے ہیں، اور امت کے ساتھ خیر خواہی پر مبنی معاملہ کرتے ہیں اور اسے دین میں سے سمجھتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے ان فرامین کے مقتضی کے مطابق اعتقاد رکھتے ہیں:

قولہ ﷺ : [المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضا] وشبک بین أصابعه . (بخاری ومسلم)

ترجمہ:[ایک مؤمن دوسرے مؤمن کیلئے عمارت کی طرح ہے کہ جس کا بعض حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے، یہ کہکر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں میں تشبیک (بعض کو بعض میں داخل کرنا) دی۔]

قولہ ﷺ : [مثل المؤمنین فی توادهم وتراحمهم وتعاطفهم کمثل الجسد، إذا اشتکی منه عضو تداعی له سائر الجسد بالحمی والسهر] (بخاری ومسلم)

ترجمہ:[مؤمنین باہم مودۃ، تراحم اور تعاطف میں ایک جسم کے مانند ہیں، کہ جب جسم کا کوئی ایک عضو تکلیف میں ہوتا ہے تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہوتا ہے]

اسی طرح اہل السنۃ آزمائش میں صبر کی تلقین کرتے ہیں، خوشحالی میں شکر کا حکم دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر پر راضی رہنے کی نصیحت کرتے ہیں۔

عبارت کی تشریح

یہ فصل درحقیقت گذشتہ فصل کی تکمیل وتتمہ ہے، اس فصل میں اہل السنۃ کی ان صفات کا ذکر ہے جو مکملاتِ عقیدہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور یہ صفات درحقیقت ان کے اصول وعقائد جن پر قائم ہیں اور علم وعمل کے اعتبار سے آراستہ ہیں، کے اثرات وثمرات ہیں، وہ صفات یہ ہیں۔

(۱) ”یأمرون بالمعروف وینهون عن المنکر علی توجبه الشریعة“ ”نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں شرعی ہدایت کے مطابق۔“

اللہ تعالیٰ نے ان کی پہلی صفت بیان فرمائی ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾

ترجمہ: ”تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کیلئے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو“ (آل عمران:۱۱۰)

”المعروف“ ہر وہ ایمان وعملِ صالح جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے، ”المنکر“ ہر وہ فعل اور اعتقاد جسے اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا ہو اور اس سے روکا ہو، اور اہل السنۃ یہ دونوں کام شریعت کی راہنمائی کے مطابق انجام دیتے ہیں، چنانچہ قدرت اور مصلحت کے پیشِ نظر ہاتھ سے نہیں تو زبان سے وگرنہ دل سے، بخلاف معتزلہ کے جو اس معاملہ میں شرعی توجیہات کی مخالفت کرتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ ”امر بالمعروف اور نھی عن المنکر“ کا تقاضا ہے کہ امراء وخلفاء پر خروج (بغاوت) کیا جائے۔

(۲) ”ویرون إقامة الحج والجمع والأعیاد مع الأمراء: أبرارا کانوا أو فجارا.“

”اور فریضہ حج، جمعہ اور عیدین کی ادائیگی اپنے امراء چاہے نیک ہوں یا فاجر، کے ساتھ ادا کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں“

یعنی اہل السنۃ ان شعائر کی ”ولاۃ الامور“ (حکمرانوں اور ان کے نائبین) کے ساتھ اقامت کو واجب اور ضروری قرار دیتے ہیں، یہ ولاۃ امور چاہے صالحین اور مستقیمین علی الحق ہوں یا فسق وفجور میں مبتلا ہوں البتہ ایسا فسق نہ ہو جو ملت سے خارج کرنیوالا ہو، تاکہ مسلمانوں کا کلمہ ایک رہے اور وہ باہم اختلاف وانتشار سے بچے رہیں اور اس لئے بھی کہ فاسق حکمران کو محض اس کے فسق کی بنا پر معزول نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی اس بنیاد پر اس پر خروج جائز ہے کیونکہ اس سے حقوق کا ضیاع اور خون ریزی لازم آئے گی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

” کوئی بھی گروہ وقت کے حاکم کو ہٹانے کیلئے جو بغاوت کرتا ہے تو اس بغاوت کے مفاسد

اسے ہٹانے کے مفاسد سے زیادہ ہوتے ہیں۔"

اہل السنۃ اس مسئلہ میں مبتدعین، خوارج، معتزلہ اور شیعہ کے منہج کی مخالفت کرتے ہیں، یہ لوگ ولاۃ الامور کے ظلم، اگرچہ یہ محض ان کا ظن ہی ہو، کو بنیاد بنا کر ان کے خلاف خروج اور بغاوت کو جائز سمجھتے ہیں اور اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قبیل سے سمجھتے ہیں۔

(۳) "ویحافظون علی الجماعات" "نماز باجماعت کی حفاظت کرتے ہیں" یعنی فرض نماز، جمعہ وغیرہ جماعت کے ساتھ پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں، کیونکہ یہ اسلام کا ایک عظیم شعار ہے اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم بھی یہی ہے، بخلاف شیعہ حضرات کے یہ لوگ امام معصوم کے ساتھ ہی نماز باجماعت کو واجب سمجھتے ہیں اور بخلاف منافقین کے جو کہ نماز باجماعت سے پیچھے رہتے ہیں۔

نماز باجماعت کی فضیلت اس کے حکم اور نماز باجماعت کے ترک سے نہی کے سلسلہ میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں، کتب حدیث میں ان کو دیکھا جا سکتا ہے، یہ ان کے ذکر کا مقام نہیں ہے۔

(۴) "ویدینون بالنصیحة للأمة" "امت کے ساتھ خیر خواہی پر مبنی معاملہ کرتے ہیں اور اسے دین میں سے سمجھتے ہیں"

"النصح" کا لغوی معنی "الخلوص" ہے جب کہ شرعی اصطلاح میں اس کا معنی ہے، کسی شخص کیلئے خیر کا ارادہ کرنا اور اس کی بھلائی اور خیر کی طرف راہنمائی کرنا۔

(۵) "التعاون علی الخیر والتألم لألم المصابین"

"مؤمنین کے ساتھ خیر کے کاموں میں تعاون کرنا اور مصائب میں مبتلا لوگوں کو دیکھ کر درد والم محسوس کرنا"

کیونکہ ان کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ کی دو حدیثیں ہیں جن کا مقتضی یہ ہے کہ اہل ایمان کو چاہئے کہ خیر کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور ایک دوسرے کے ساتھ

رحمت، شفقت اور نرمی کا معاملہ کریں، وہ حدیثیں یہ ہیں:

حدیث نمبر (۱) قولہ ﷺ : [المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا وشبك بين أصابعه . (بخاری ومسلم)

ترجمہ: [ایک مؤمن دوسرے مؤمن کیلئے عمارت کی طرح ہے کہ جس کا بعض حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے، یہ کہکر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں میں تشبیک (بعض کو بعض میں داخل کرنا) دی۔]

مؤمنین کی عمارت کے ساتھ تمثیل کا مقصد بات کو فہم کے قریب تر کرنا ہے۔ "تشبیک" کا معنی ہے: ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کرنا۔

"تشبیک" کی تمثیل کا مقصد بھی بات کو فہم کے قریب تر کرنا ہے۔

حدیث نمبر (۲) قولہ ﷺ : [المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا] وشبك بين أصابعه . وقولہ ﷺ [مثل المؤمنين فی توادهم وتراحمهم وتعاطفهم كمثل الجسد، إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالحمى والسهر] (بخاری ومسلم)

ترجمہ: [مؤمنین باہم مودۃ، تراحم اور تعاطف میں ایک جسم کے مانند ہیں، کہ جب جسم کا کوئی ایک عضو تکلیف میں ہوتا ہے تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہوتا ہے]

یہ حدیث خبر بمعنی امر کے باب سے ہے، یعنی جس طرح جسم کے کسی ایک حصہ کی تکلیف سارے جسم میں سرایت کر جاتی ہے اہل ایمان کو بھی اسی طرح ایک جسم کی مانند ہونا چاہئے۔ کہ جب کسی ایک کو کوئی تکلیف یا مصیبت پہنچے تو جمیع مؤمنین اس تکلیف کو محسوس کریں اور اس کے ازالہ کی سعی کریں۔

اس تشبیہ کا مقصد بھی بات کو فہم کے قریب کرنا ہے، اور معانی کو مرئی صورت میں پیش کرنا ہے۔

(۵) (الف) "یأمرون بالصبر علی البلاء"

"آزمائشوں کے موقعہ پر صبر کی تلقین کرتے ہیں"

"الصبر" کا لغوی معنی "الحبس" (روکنا) ہے، یہاں پر اس کا معنی ہے آزمائشوں اور مصائب کے موقعہ پر نفس کو جزع فزع سے اور زبان کو شکووں اور اظہارِ ناراضگی سے اور اعضاء کو رخساروں کے پیٹنے اور دامن پھاڑنے سے منع کرنا۔

"البلاء" کا معنی امتحان، مصائب اور شدائد ہے۔

(ب) "والشكر عند الرضاء" "خوشی اور آسانیوں میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں"

"الشکر" شکر ایک ایسا فعل ہے جو مُنعِم کی تعظیم کا مظہر ہے کیونکہ منعم حقیقتاً انعام کرتا ہے اس کا شرعی معنی ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نعمتوں کو اس کی اطاعت میں صرف کرے۔ "الرخاء" نعمتوں کی وسعت۔

(ج) "والرضاء بمر القضاء" "قضاء وقدر پر راضی رہنے کا حکم دیتے ہیں"

"الرضا" ناراضگی کی ضد ہے، "القضاء" لغت میں حکم کو کہتے ہیں، عرفِ شرع میں اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا اشیاء کے متعلق وہ ارادہ جس کیفیت وصفت پر وہ اشیاء ہیں۔

"مر القضاء" وہ امور جو بندہ پر جاری ہوتے ہیں جنہیں بندہ ناپسند کرتا ہے جیسا کہ مرض، فقر، گرمی، سردی، آلام، اور مخلوق کی طرف سے ایذاء وغیرہ۔

ويدعون إلى مكارم الأخلاق ومحاسن الأعمال . ويعتقدون معنى قوله ﷺ :[أكمل المؤمنين إيمانا أحسنهم خلقا] . ويندبون إلى أن تصل من قطعك وتعطي من حرمك وتعفو عمن ظلمك . ويأمرون ببر الوالدين. وصلة الأرحام .وحسن الجوار . والإحسان إلى اليتامى والمساكين وابن السبيل والرفق بالمملوك . وينهون عن الفخر والخيلاء والبغي ، والاستطالة على الخلق بحق أو بغير حق......ويأمرون بمعالي الأخلاق وينهون عن سفسافها .وكل مايقولونه ويفعلونه من هذا وغيره فإنما هم فيه متبعون للكتاب والسنة.

ترجمہ: اہل السنة مکارمِ اخلاق کی طرف دعوت دیتے ہیں اور حدیثِ نبوی:[أكمل المؤمنين إيمانا أحسنهم خلقا]' (کامل الایمان مؤمن وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہے) کے معنی پر اعتقاد رکھتے ہیں، اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ جو آپ سے قطع رحمی کرے آپ اس سے صلہ رحمی کریں، اور جو آپ کو محروم کرے آپ اسے عطا کریں، اور جو آپ پر ظلم کرے آپ اسے معاف کریں، والدین کے ساتھ حسن سلوک، پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ، یتامیٰ مساکین اور مسافروں کے ساتھ احسان اور غلاموں کے ساتھ نرمی کا حکم دیتے ہیں۔ فخر، تکبر، ظلم وتعدی اور لوگوں کو حق یا ناحق بے عزت کرنے سے منع کرتے ہیں، اعلیٰ اخلاق کا حکم اور بداخلاقی سے منع کرتے ہیں، اہل السنة اپنی اس دعوت اور اپنے جمیع افعال وغیرہ میں کتاب وسنت کی اتباع کرتے ہیں۔

عبارت کی تشریح

"مکارم الاخلاق" اچھے اخلاق کو کہتے ہیں۔ "الاخلاق" "خلق" کی جمع ہے "خُلُق" (خاء کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ) کا معنی ہے "باطنی صورت" اور "خَلق" (خاء کے فتحہ اور لام کے سکون کے ساتھ) کا معنی "ظاہری صورت"۔ یہاں پر "خلق" بمعنی دین، عادت اور طبیعت ہے یعنی اہل السنۃ اعلیٰ اخلاق کا اہتمام کرتے ہیں چنانچہ اولاً اپنے آپ کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کی طرف ترغیب دیتے ہیں۔ اسی طرح لوگوں کو محاسن اعمال کی طرف بھی دعوت دیتے ہیں، جیسے سخاوت، شجاعت، صدق اور امانت وغیرہ۔

[أكمل المؤمنين إيمانا أحسنهم خلقا] (کامل الایمان مؤمن وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہے) مندرجہ بالا حدیثِ نبوی پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کرتے ہیں۔ (اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے، امام ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے)

اس حدیث میں اچھے اخلاق سے آراستہ ہونے کی ترغیب دی گئی ہے، اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے اعمال مسمی الایمان میں داخل ہیں اور یہ کہ ایمان میں تفاضل ہوتا ہے (یعنی بعض کا ایمان بعض سے کم ہوتا ہے) اہل السنۃ لوگوں کو آپس میں حسنِ معاملہ اور اصحاب الحقوق کے حقوق کی ادائیگی کی دعوت دیتے ہیں، اور اعلیٰ اخلاق کے منافی امور مثلاً: لوگوں پر تکبر کرنا اور ان پر تعدی کرنا وغیرہ سے ڈراتے ہیں، چنانچہ اہل السنۃ کی دعوت ہے کہ اگر کوئی آپ سے قطع رحمی کرے تو آپ اس سے صلہ رحمی کریں، یعنی اگر کوئی آپ سے بُرا سلوک کرے تو اس سے اچھا سلوک کرنا اور یہ کہ اگر کوئی آپ کو محروم کرے تو آپ اسے عطاء کریں، یعنی اگر کوئی آپ سے تحائف وغیرہ روک لیتا ہے تو آپ ایسا نہ کریں بلکہ آپ اس پر تحائف وغیرہ کی صورت میں خرچ کریں، حسنِ سلوک کا یہی تقاضا ہے۔

اور یہ کہ جو آپ پر ظلم کرے آپ اسے معاف کریں، یعنی آپ کے ساتھ، مال، خون اور عزت

کے حوالے سے ظلم و تعدی کا ارتکاب کرتا ہے آپ اس سے تسامح اور درگذری سے پیش آئیں اس سے باہم مودت پیدا ہوگی اور اجر و ثواب ملے گا۔

ويأمرون ببر الوالدين. وصلة الأرحام. وحسن الجوار. والإحسان إلى اليتامى والمساكين وابن السبيل.

"والدین کے ساتھ حسن سلوک، پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ، یتامیٰ مساکین اور مسافروں کے ساتھ احسان اور غلاموں کے ساتھ نرمی کا حکم دیتے ہیں۔"

یعنی اہل السنۃ بھی ان امور کا حکم دیتے ہیں جن اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے مثلاً: "بر والدین" اس کا معنی ہے، والدین کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور ان کی اطاعت کی جائے الا یہ کہ وہ معصیت کا حکم دیں۔

"صلة الارحام" رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور حسنِ سلوک۔

"حسن الجوار" پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک، یعنی ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے اور انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔

"والاحسان الى اليتامى والمساكين وابن السبيل" یعنی یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا۔

"الیتامیٰ" یتیم کی جمع ہے، لغت میں "المنفرد" (اکیلا) کو کہتے ہیں، شرعی اصطلاح میں اس سے مراد وہ بچہ ہے جس کی بلوغت سے قبل اس کا باپ فوت ہو جائے۔

یتیموں کے ساتھ احسان یہ ہے کہ ان کے احوال و اموال کی حفاظت کی جائے اور ان کے ساتھ انتہائی شفقت سے پیش آیا جائے۔

"المساكين" مسکین کی جمع ہے، مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جسے حاجات اور فقر و فاقہ میں بے حرکت بنا دیا ہو۔ (یعنی ضروریاتِ زندگی کا محتاج اور فقر و فاقہ کا شکار شخص)

''ابن السبیل ''مسافر، جس کا زاد راہ ختم ہو یا ضائع ہو گیا ہو یا چوری ہو گیا ہو۔ بعض نے یہاں ابن السبیل سے مراد مہمان لیا ہے۔

''والرفق بالمملوک ''غلاموں کے ساتھ نرمی کرنا۔''مملوک ''غلام اور لونڈی کو کہتے ہیں،''مملوک ''کے حکم میں جانور بھی داخل ہیں۔''الرفق''''العنف ''(سختی) کی ضد ہے، یعنی نرمی۔

وينهون عن الفخر والخيلاء والبغي ، والاستطالة على الخلق بحق أو بغير حق......

''فخر، تکبر، ظلم وتعدی اور لوگوں کو حق وناحق بے عزت کرنے سے منع کرتے ہیں، اعلیٰ اخلاق کا حکم اور بداخلاقی سے منع کرتے ہیں''

''فخر'' کا معنی ہے اپنی بعض خوبیوں اور حسب ونسب کی بناء پر اترانا۔

''خیلاء''(خاء کے ضمہ کے ساتھ) کا معنی تکبر ہے۔

''بغی'' کا معنی ظلم وزیادتی ہے۔

''الاستطالة على الخلق بحق وبغير حق '' کا معنی ہے اپنے آپ کو لوگوں سے اعلیٰ اور برتر سمجھنا اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھنا اور انہیں حق وناحق بے عزت اور ذلیل کرنا، کیونکہ حق کے ساتھ دوسرے پر اپنی برتری جتلانا فخر کہلاتا ہے، اور ناحق کسی پر اپنی برتری جتلانا اور اپنا رعب ودبدبہ جمانا بغی کہلاتا ہے اور یہ دونوں چیزیں حلال نہیں ہیں۔

قوله:ويأمرون بمعالي الأخلاق وينهون عن سفسافها .

''اعلیٰ اخلاق کا حکم اور بداخلاقی سے منع کرتے ہیں''

''معالی الاخلاق'' یعنی اخلاق حسنہ''السفساف ''اصلاً اس غبار کو جو آٹا چھاننے کے وقت اڑتا ہے اور ان ذرات کو جو مٹی کی دھول میں اُڑ رہے ہو، کو کہا جاتا ہے۔

یہاں پر ''معالی الاخلاق'' کی ضد کے معنی میں ہے۔ یعنی بداخلاقی۔

وقوله: وكل مايقولونه ويفعلونه من هذا وغيره فإنما هم فيه متبعون للكتاب والسنة.

''اہل السنۃ اپنی اس دعوت اور اپنے جمیع افعال وغیرہ میں کتاب وسنت کی اتباع کرتے ہیں۔''

یعنی اہل السنۃ اپنے تمام اقوال وافعال اور ان امور میں جن کا وہ حکم دیتے ہیں یا جن سے وہ منع کرتے ہیں، ان کا ذکر اس کتاب میں ہوا ہے یا نہیں ہوا، یہ سب باتیں انہوں نے اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی کی سنت سے حاصل کی ہیں، نہ تو انہوں نے اپنے طور پر انہیں ایجاد کیا ہے اور نہ ہی کسی کی تقلید کی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاعْبُدُوا اللهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ﴾

(النساء:٣٦)

ترجمہ: ''اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ سلوک واحسان کرو اور رشتہ داروں سے اور یتیموں سے اور مسکینوں سے اور قرابت دار ہمسایہ سے اور اجنبی ہمسایہ سے اور پہلو کے ساتھ سے اور راہ کے مسافر سے اور ان سے جن کے مالک تمہارے ہاتھ ہیں، (غلام کنیز) یقیناً اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں اور شیخی خوروں کو پسند نہیں فرماتا''

اس موضوع پر متعدد احادیث موجود ہیں، بعض کا ذکر شیخ رحمہ اللہ نے اپنی کلام میں کر دیا ہے۔

وطريقتهم هي دين الإسلام الذي بعث الله به محمدا ﷺ. لكن لما أخبر النبي ﷺ أن أمته ستفترق على ثلاث وسبعين فرقة كلها في النار إلا واحدة وهي الجماعة. وفي حديث عنه أنه قال: [هم من كان على مثل ما أنا عليه اليوم وأصحابي] وصار المتمسكون بالإسلام المحض الخالص عن الشوب هم أهل السنة والجماعة .وفيهم الصديقون والشهداء والصالحون ومنهم أعلام الهدى ومصابيح الدجى أولوا المناقب المأثورة والفضائل المذكورة.

۞ ۞ ۞

ترجمہ:اہل السنۃ کا طریقہ دین اسلام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو دیکر مبعوث فرمایا ہے،لیکن کیونکہ نبی ﷺ نے خبر دی ہے کہ آپ ﷺ کی اُمت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی اور سب کے سب جہنم کا ایندھن ہونگے سوائے ایک کے اور وہ ''الجماعۃ'' ہے، ایک حدیث میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا:[هم من كان على مثل ما أنا عليه اليوم وأصحابي]یعنی[جنتی گروہ وہ ہے جو اس منہج پر قائم ہو جس پر آج میں اور میرے صحابہ قائم ہیں] (ترمذی، السلسلة الصحیحة (۳۰۳،۳۰۴)) اس لئے خالص اسلام، جو کہ ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک ہے کو تھامنے والوں کو اہل السنۃ والجماعۃ کہا جاتا ہے۔

اہل السنۃ میں صدیقین بھی ہیں، شہداء بھی اور صالحین بھی، اور ان میں ایسے بھی ہیں جو ہدایت کے نشان، روشن چراغ اور نبی ﷺ سے مأثور ومنقول، مناقب وفضائل کے اہل ومستحق ہیں۔

وفيهم الأبدال. وفيهم أئمة الدين الذين أجمع المسلمون على هدايتهم. وهم الطائفة المنصورة الذين قال فيهم النبي ﷺ: [لاتزال طائفة من أمتي على الحق منصورة لايضرهم من خالفهم ولامن خذلهم حتى تقوم الساعة] .فنسأل الله أن يجعلنا منهم وأن لايزيغ قلوبنا بعد إذ هدانا . وأن يهب لنا من لدنه رحمة إنه هو الوهاب . وصلى الله على محمد وآله وصحبه وسلم تسليماً كثيراً.

۞ ۞ ۞

ترجمہ:اوران میں ابدال بھی ہیں،اوران میں ایسے اُئمہ دین بھی ہیں جن کے ہدایت پر ہونے پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔اہل السنۃ ہی طائفۂ منصورہ ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:[لاتزال طائفة من أمتي على الحق منصورة لايضرهم من خالفهم ولامن خذلهم حتى تقوم الساعة]

ترجمہ:[میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہیگا اور اس کی مدد ہوتی رہے گی،ان کے مخالفین اور ان سے الگ ہونیوالے انہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت قائم ہوجائے گی۔

عبارت کی تشریح

شیخ رحمہ اللہ نے اہل السنۃ کی خصوصیات اور ممیّزات کے بیان کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے کچھ اور خصوصیات اور ممیّزات کا ذکر کیا ہے، چنانچہ اس کلام میں شیخ رحمہ اللہ نے ان کی ایک عظیم خصوصیت کو بیان کیا ہے، اور وہ یہ کہ اس امت کے افتراق، جس کی خبر نبی ﷺ نے دی تھی، کے موقعہ پر خالص اسلام پر ثابت قدم رہے اور ان فرقوں کے درمیان فرقہ ناجیہ ثابت ہوئے، اور

یہی ''الجماعۃ'' ہیں جو نبی ﷺ اور صحابہ کے طریقہ ومنہج پر ثابت وقائم ہیں، جو کہ خالص اور ہر قسم کی ملاوت سے پاک اسلام ہے، چنانچہ اسی وجہ سے یہ لوگ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کا عظیم لقب حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

اہل السنۃ میں صدیقین، شہداء اور صالحین بھی ہیں، صدیقین، صدق وتصدیق میں انتہاء کو پہنچے ہوئے، شہداء، اللہ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے والے اور الصالحون، اعمالِ صالحہ کرنیوالوں کو کہتے ہیں۔

''وفیھم اعلام الھدی ''یعنی اہل السنۃ میں ایسے علماء ہیں جو ایک عَلَم کی حیثیت رکھتے ہیں، اور علم وعمل کے اعتبار سے ہر خوبی اور وصف سے متصف ہیں۔

''وفیھم الأبدال ''یعنی اہل السنۃ میں ابدال بھی ہیں، ''ابدال '' اولیاءِ کرام اور عابد وزاہد قسم کے لوگوں کو کہا جاتا ہے، انہیں ابدال کہنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان میں سے جب کوئی وفات پاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے، مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ اہل حدیث ہی ابدال ہیں۔

''وفیھم أئمۃ الدین ''یعنی اہل السنۃ میں ایسے علماء بھی ہیں جو دین میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں کہ لوگ فقہی مسائل میں ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی اقتداء کرتے ہیں، جیسے ائمہ اربعہ وغیرہ۔

''وھم الطائفۃ المنصورۃ ''یعنی اہل السنۃ ہی وہ جماعت ہے جسے ایک حدیث میں طائفہ منصورہ کہا گیا ہے، حدیث یہ ہے:

[لاتزال طائفۃ من أمتی علی الحق منصورۃ لایضرھم من خالفھم ولا من خذلھم حتی تقوم الساعۃ] (بخاری ومسلم)

ترجمہ:[میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہیگا اور اس کی مدد ہوتی رہے گی، ان کے

مخالفین اور ان سے الگ ہونیوالے انہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت قائم ہوجائے گی۔

شیخ رحمہ اللہ نے اپنے اس مبارک رسالہ کا اختتام دعا اور نبی ﷺ پر درود وسلام کے ساتھ کیا ہے جو کہ ایک بہترین اختتام ہے۔ والحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم۔